سلسلۂ حماسہ نگاری بہ زبانِ اردو

کارنامۂ انیسؔ

کلامِ انیسؔ بہ ترتیبِ نو

مرتبہ

ڈاکٹر سید صفدر حسین

سلسلۂ حماسہ نگاری بزبانِ اُردو

بملاحظۂ جناب راجہ امیر احمد خان صاحب

منجانب

صفدر حسین

گورنمنٹ کالج جہلم

۳۱ ۸/۷۰ء

کارنامۂ انیسؔ

کلامِ میر انیسؔ بہ ترتیبِ نو

مرتبہ

ڈاکٹر سیّد صفدر حسین

کاپی رائٹ ۱۹۶۹ء

طبع اوّل ایک ہزار

سالِ طبع ۱۹۶۹ء

کتابت نبیل احمد خاں

مطبوعہ خورشید پرنٹرز اسلام آباد

شرکتِ قلم

۵۴۵ - ویسٹ رِج - راولپنڈی

۱

ترتیب

۱ - رزمیہ شاعری اور میر انیس (مقدمہ) ۹
۲ - آغازِ کلام (توصیفِ سخن) ۷۱
۳ - مدحِ حسینؑ ۷۳
۴ - عہدِ رسولِ مقبولؐ میں ایک عید کا دن - حسینؑ کی نازبرداریاں .. ۷۵
۵ - ایک روایت - مخبرِ صادق کی زبان سے شہادتِ حسینؑ کی پیش گوئی .. ۷۹
۶ - حسینؑ کا وعدۂ ایثار - بعدِ رسولِ مقبولؐ (حضرت علیؑ کی شہادت) .. ۹۱
۷ - حضرت امام حسینؑ کی شہادت ۹۲
۸ - مسند نشینی کے بعد یزید کے عزائم - حاکمِ مدینہ سے امام حسینؑ کی ملاقات ۱۰۰
۹ - امام حسینؑ کے ترکِ وطن کی تیاریاں ۱۰۳
۱۰ - صعوباتِ سفر ۱۰۵
۱۱ - کوفہ کی حالت ۱۰۷
۱۲ - شہادتِ جنابِ مسلمؑ کی خبر امام حسینؑ کو ملتی ہے ۱۱۰
۱۳ - اختتامِ سفر اور کربلا میں امام حسینؑ کا داخلہ ۱۱۵
۱۴ - خیمے نصب کرنے کی تیاریاں ۱۲۱

۱۵ ۔ فوجِ یزید کی آمد ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۱۲۴

۱۶ ۔ عباسؑ کا جلال ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۱۲۵

۱۷ ۔ جوانانِ حسینی کی برہمی ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۱۲۹

۱۸ ۔ امام حسینؑ کا فیصلہ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۱۳۱

۱۹ ۔ حضرت عباسؑ کی دل شکستگی اور پھر راضی برضا ہونا ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۱۳۲

۲۰ ۔ خیموں کا نصب ہونا اور اہلِ حرم کا محملوں سے اُتر کر داخلِ خیمہ ہونا ۔ ۱۳۵

۲۱ ۔ پسرِ سعد کی آمد ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۱۳۷

۲۲ ۔ ساتویں محرم سے شبِ عاشور تک کے واقعات ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۱۴۱

۲۳ ۔ صبح کارزار ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۱۴۴

۲۴ ۔ اذانِ صبح اور امام حسینؑ کی نماز ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۱۴۹

۲۵ ۔ فوجِ یزید کی سمت سے تیروں کی آمد ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۱۵۳

۲۶ ۔ فوجِ حسینی کا عزمِ جہاد ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۱۵۴

۲۷ ۔ تیاریٔ علم اور عون و محمد کے ولولے ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۱۵۶

۲۸ ۔ جنابِ زینبؑ کی بیٹوں کو فہمائش ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۱۵۸

۲۹ ۔ جوانانِ حسینیؑ کی شان و شوکت، میدان کو روانگی اور غازیوں کی توصیف ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۱۶۵

۳۰ ۔ فوجِ یزید میں حُر کا اضطراب، پسرِ سعد سے گفتگو، تلخ کلامی اور پھر روانگی ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۱۷۱

۳۱ ۔ فوجِ حسینؑ میں حُر کی آمد اور استقبال ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۱۸۰

۳۲ ۔ حُر کی رخصتِ جنگ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۱۸۲

۳۳ ۔ میدان میں حُر کی آمد، جنگ اور شہادت ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۱۸۵

۳۴ - ناصرانِ حسینؑ کا ایثار ۱۸۹

۳۵ - امام حسینؑ کی نمازِ ظہر ۱۹۰

۳۶ - پسرانِ مسلمؑ کا جہاد اور شہادت ۱۹۲

۳۷ - پسرانِ زینبؑ کی جنگ اور شہادت ۱۹۴

۳۸ - حضرتِ قاسمؑ کی رخصت جنگ اور شہادت ۲۱۶

۳۹ - جنابِ عباسؑ کی رخصت جہاد اور شہادت ۲۳۸

۴۰ - حضرت علی اکبر کی رخصت جہاد اور شہادت ۲۷۴

۴۱ - حضرت امام حسینؑ کی رخصت ۳۱۴

۴۲ - سواری کی شان و شوکت ۳۲۳

۴۳ - جہاد کے لئے امام حسینؑ کی روانگی ۳۲۵

۴۴ - امام حسینؑ کا سراپا ۳۲۶

۴۵ - امام حسینؑ کا رجز ۳۳۲

۴۶ - امام حسینؑ کا جہاد ۳۳۴

۴۷ - شہادتِ حضرت علی اصغر ۳۴۷

۴۸ - امام حسینؑ کا اعادۂ جنگ ۳۵۱

۴۹ - ایک نامی پہلوان کا امام کے مقابلے کے لئے آنا، مبارز طلبی اور جنگ ۳۵۷

۵۰ - امام حسینؑ کی شہادت ۳۷۱

۵۱۔ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد اہل بیت کی حالت ۳۷۶
۵۲۔ لٹے ہوئے قافلے کی کوفہ اور دمشق کو روانگی - ایک روایت ۳۸۲
۵۳۔ قید خانے کے واقعات ۳۹۲

●

سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر
مگر ہم نے پلّہ گراں کر دیا

میر انیسؔ

ممدوح

آں امامِ عاشقاں پورِ بتولؑ — سروِ آزادے ز بستانِ رسولؐ
اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر — معنیٔ ذبحِ عظیم آمد پسر
بہرِ آں شہزادۂ خیر الملل — دوشِ ختم المرسلیں نعم الجمل
سُرخ رُو عشقِ غیور از خونِ اُو — شوخیٔ ایں مصرع از مضمونِ اُو
درمیانِ اُمّت آں کیواں جناب — ہمچو حرفِ قُل ہُوَ اللہ در کتاب
موسیٰؑ و فرعون و شبیرؑ و یزید — ایں دو قوت از حیات آمد پدید
زندہ حق از قوتِ شبیری است — باطل آخر داغِ حسرت میری است
چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت — حُرّیت را زہر اندر کام ریخت
خاست آں سر جلوۂ خیر الاُمم — چوں سحابِ قبلہ باراں در قدم
بر زمینِ کربلا بارید و رفت — لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت
تا قیامت قطعِ استبداد کرد — موجِ خونِ اُو چمن ایجاد کرد

بہرِ حق در خاک و خوں غلطیدہ است
پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است

اقبالؒ

رزمیہ شاعری اور میر انیس

ہر قوم ایک یا چند مخصوص و منتخب ہیرو ضرور رکھتی ہے جن کی روئیداد حیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مخصوص قوم کی تقدیر بنانے میں اُن شجاعوں کے کارناموں کو کتنا دخل تھا۔ ایسے سورماؤں کی زندگی کے اہم واقعات کا بیان اُس قوم کے افراد میں قومی وقار کا احساس پیدا کرتا ہے اور ان کے دلوں میں جوش اور ولولے کا محرک ہوتا ہے اِس لئے اپنے غازیوں کے کارناموں کو ایک خاص تسلسل کے ساتھ ترتیب دینا اہم قومی فریضہ ہے۔ جب کسی قوم میں ملی جوش سے سرشار کوئی قادر الکلام شاعر پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی بیانیہ صلاحیتوں کو کام میں لاکر اپنے قومی سورماؤں کی اولوالعزمیوں کی داستان نظم کر دیتا ہے تاکہ اُن کی گذرگاہوں کو منوّر دیکھ کر قوم میں تفاخر کا جذبہ اور تقلید کی رغبت پیدا ہو۔ ایسی مسلسل اور بیانیہ نظموں کو رزمیہ کہتے ہیں۔ گویا رزمیہ نظموں میں کسی قوم کے تاریخی یا روایتی سورماؤں کے کارنامے فخر کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں۔

ان رزمیہ نظموں کے آغاز کی تاریخ عہدِ عتیق کے دھندلکوں سے شروع ہوتی ہے۔ جب وسائل حمل و نقل محدود تھے، معاشری رابطے دشوار تھے اور لوگوں کو تفریح و دلبستگی کے سامان بھی آسانی سے میسّر نہیں آتے تھے، یہاں تک کہ اُمرا کے ایوان بھی کچھ سُنسان ہی نظر آتے تھے۔ ماحول کی اس خشک اور اُکتا دینے والی یکسانیت کو توڑنے کے لئے درباروں کے اندر خوشنوا مغنیّوں کی ضرورت محسوس

ہوئی اور بہت سے پیشہ ور مطرب پیدا ہو گئے جو عموماً خود ساختہ قومی گیت گایا کرتے تھے اور انھیں گیتوں نے رفتہ رفتہ سورمائی نظموں کی صورت اختیار کر لی جن میں ملک کی اساطیری روایات اور اسلاف کے کارناموں کو پیش کیا جاتا تھا۔ یہ نظمیں ایک طرف تو امراء کے جذبۂ اسلاف پرستی کو تسکین پہنچاتی تھیں اور دوسری طرف اُن سے قوم کے دلوں میں مسرت و انبساط اور قومی تفاخر و جوش کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ ان نظموں کے ہیرو چونکہ بلند اوصاف کے حامل دکھائے جاتے تھے اس لئے ان کے کارناموں سے اعلیٰ اخلاقی اقدار کی حمایت خود بخود ہو جاتی تھی۔ وہ باطل کو ٹھکرا کر حق و صداقت کا علم بلند کرتے تھے اس لئے اُن کے واقعاتِ حیات سُننے سے ولوں میں ایمان کی تازگی پیدا ہوتی تھی۔ اور جب دربار و خرگاہ کے پُر شکوہ جلسوں میں مغنی شعراء انھیں خوش الحانی سے پڑھ کر سناتے تھے تو ایک سماں بندھ جاتا تھا اور ساری محفل قومی ولولے سے معمور ہو جاتی تھی۔

ازمنۂ قبل تاریخ میں بھی ایسی بے شمار نظموں کا سُراغ ملتا ہے جو مدتوں تک بھاٹوں اور مُغنیوں کے خاندانوں میں سینہ بسینہ منتقل ہوتی رہیں۔ ان نظموں کو چونکہ زبانی گا کر سُنانے کا دستور تھا اس لئے ان کی ساخت اور تکنیک ایسی ہوتی تھی کہ بدیہہ گوئی میں کوئی دشواری پیدا نہ ہو۔ مُغنی شعراء کے ذہن میں کثیر ذخیرہ ایسے الفاظ و محاورات کا محفوظ رہتا تھا جن سے وہ مختلف کیفیات و جذبات کے اظہار میں مدد لیتے۔ ان نظموں میں وہی زبان استعمال کی جاتی تھی جو عوام میں رائج تھی اور جسے مُغنیوں کی نسلوں نے خراد کر اپنی ضروریات کے عین مطابق بنا لیا تھا۔ ذخیرۂ الفاظ کی طرح بہت سے نادر قصے بھی اُن کے ذہن میں محفوظ ہوتے تھے جنھیں وہ وزن سے ہم آہنگ کر کے بغیر حافظے پر زور دیئے مربوط کرتے چلے جاتے تھے۔ یہ نظمیں اپنی تکنیک کے لحاظ سے بہت سادہ ہوتی تھیں۔ اس نوع کی شاعری کا قدیم ترین نمونہ گل گامش Gilgamesh کی نظم The Hittite

بتائی جاتی ہے جو تین چار ہزار سال قبلِ مسیح کی تصنیف ہے۔ اس نظم کی ترتیب کے مدتوں بعد حضرت عیسیٰؑ سے تقریباً سات آٹھ سو سال قبل یونان میں ایسی نظموں کا دور شروع ہو گیا تھا جو تاریخی اعتبار سے قدیم ہونے کے علاوہ آج بھی زندہ ہیں اور جن کی روایات نے اس نوع کی شاعری کے فن اور اس کی تکنیک سے ہمیں روشناس کرایا ہے۔ خود یونان میں بھی اس قبیل کی ابتدائی نظمیں بہت خام اور ناپختہ تھیں لیکن پھر صدیوں کی کوشش و کاوش سے ان کی بنیاد پر ایسی عظیم نظمیں تعمیر ہوئیں جو آج تک شاہکارِ ادب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایپک شاعری کے فنی ارتقا کی کڑیاں ہزار ہا سال کی مدت پر پھیلی ہوئی ہیں اور ہومر Homer کا فنی شعور بھی انھیں روایات کا ممنون ہے جو یونان میں ہزار ہا سال سے رائج چلی آ رہی تھیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ "ایلیڈ" Iliad اور اوڈیسی Odyssey کسی ایک عہد یا ایک ذہن کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ مدتوں کے عملِ تخلیق و تہذیب کے بعد انھوں نے یہ صورت اختیار کی تھی۔ ان نظموں میں یونان کی صد ہا سال کی روایاتِ شعری و معاشرہ نے رنگ بھرا ہے تب کہیں جا کر یہ زندۂ جاوید ہو سکی ہیں۔ یہی حال مہابھارت کا ہے۔ فردوسی کے "شاہنامہ" میں بھی اس کی بحر، تکنیک اور ابتدائی واقعات پر دقیقی کے "گشتاسپ نامہ" کا خاصہ اثر ہے۔

ایپک شاعری کے فن اور تکنیک پر قدیم ترین بحث ارسطو کی "بوطیقا" میں ملتی ہے جو چوتھی صدی قبلِ مسیح کی تصنیف ہے۔ ارسطو کے زمانے تک دنیا کی چار عظیم ایپک یعنی ہندوستان کی "مہابھارت" اور "رامائن" اور یونان کی "ایلیڈ" Iliad اور "اوڈیسی" Odyssey وجود میں آ چکی تھیں لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ارسطو ہندوستان کی عظیم رزمیہ نظموں سے آشنا نہ تھا، اس کے سامنے محض یونان ہی کی رزمیہ نظمیں تھیں اور ان کے متعلق بھی اس نے کچھ زیادہ تفصیل سے گفتگو

نہیں کی ہے۔ اُس کی کتاب کا بیشتر رُخ ٹریجڈی کی طرف رہا ہے جو اسٹیج ڈرامہ کی حیثیت سے اُس کے عہد کی مقبول ترین صنف تھی۔ ایک جگہ تو محض ٹریجڈی کی بحث کے ذیل میں رزمیہ کی بعض خصوصیات کا تذکرہ آگیا ہے اور دوسری جگہ اس سے بحث کر ایک مختصر باب کی صورت میں جس کی طوالت چھ سات صفحات سے زیادہ نہیں ارسطو نے رزمیہ کے بعض خصائص بیان کردیے ہیں۔

ٹریجڈی اور رزمیہ کا فرق ارسطو کے الفاظ میں یہ ہے کہ ٹریجڈی انسانی افعال کی ایک ایسی نقل ہے جو عمل کے ذریعے پیش کی جاتی ہے لیکن اس کے برخلاف رزمیہ میں یہ نقل بیان کے ذریعے پیش کی جاتی ہے۔ اسٹیج، اسٹیج کی آرائش اور موسیقی ٹریجڈی کے ایسے عناصر ہیں جو رزمیہ میں نہیں ملتے لیکن پلاٹ، روئیداد، سیرت نگاری، کرداروں کی گفتگو اور زبان کی خصوصیت کے لحاظ سے دونوں تقریباً ایک ہی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ ارسطو کہتا ہے کہ رزمیہ میں بھی روئیداد کی وہی ترتیب ہونی چاہیے جو ٹریجڈی میں ہوتی ہے۔ اس کا عمل بھی واحد اور مکمل ہونا چاہیے۔ اور شاعر کے لئے لازم ہے کہ اس کے پلاٹ کی تنظیم میں بھی وہ ابتدا، وسط اور انتہا کا لحاظ رکھے۔ نظم کو طول اتنا موزوں اور دلکش ہو کہ ذہن انسانی آسانی کے ساتھ پوری نظم کا ادراک کرسکے۔ اس میں شک نہیں کہ رزمیہ کی روئیداد ٹریجڈی کے مقابلہ میں زیادہ طویل ہوتی ہے اور اس کے اسباب ہیں۔ ٹریجڈی چونکہ ایک محدود وقت میں اسٹیج پر دکھائی جاتی ہے اس لئے اس کی روئیداد کو بھی وقت و مقام کی حدبندیوں اور ضرورتوں کے لحاظ سے محدود ہونا چاہیے۔ اس کے برخلاف رزمیہ کے مختلف حصوں میں پھیلاؤ اور وسعت کی خاصی گنجائش ہوتی ہے اس لئے اس کی روئیداد طویل ہوسکتی ہے۔ پھر بھی ارسطو رزمیہ کی روئیداد کو مختصر کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔

زبان کے ذیل میں ارسطو نے مناسب بحر کے انتخاب اور تشبیہات کی ندرت

معنویت پر بھی زور دیا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ ٹریجڈی یا رزمیہ میں جہاں عمل کی رفتار سُست ہو وہاں تاثرات (کرداروں کی گفتگو) اور سیرتوں سے زیادہ مدد نہیں ملتی اس موقع کے لئے زبان کا آراستہ اور مزیّن ہونا ضروری ہے البتہ جس جگہ حرکت و عمل اور گفتگو کی رفتار تیز ہو وہاں آراستہ زبان مناسب نہیں ہوتی۔

ان کے علاوہ ارسطو نے چند اور اہم نکتے بھی بیان کئے ہیں۔ کہتا ہے کہ رزمیہ شاعری میں شاعر کو خود بہت کم سامنے آنا چاہئے کیونکہ رزمیہ نظم واقعات و اعمال کی ایک نقل ہے اور اگر شاعر بار بار سامنے آئے گا تو اُس کی نقل زیادہ کارگر نہیں رہ سکے گی۔ اُسے چاہئے کہ چند تمہیدی باتوں کے بعد کسی کردار سے قارئین یا حاضرین کا تعارف کرا دے اور خود پیچھے ہٹ جائے پھر سارے واقعات انھیں کرداروں کی سیرتوں کے ساتھ بیان ہوتے رہیں۔

اس کے بعد ارسطو نے ایک اور نکتہ پر زور دیا ہے۔ وہ یہ کہ ٹریجڈی میں حیرت و استعجاب کا عنصر ہمیشہ دلچسپی کا باعث ہوتا ہے اس لئے اُس عنصر کی رزمیہ نظم میں اور زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ خواہ اس میں ناممکن اور خلافِ قیاس واقعات ہی کیوں نہ شامل ہوں کیونکہ رزمیہ نظم اسٹیج پر نہیں دکھائی جاتی کہ اُس کے عمل کی تمثیل پیش کرنے میں دقّت ہو۔ البتہ یہ خلافِ قیاس واقعات سلیقے کے ساتھ نظم کرنے چاہئیں تاکہ ان سے تعجب پیدا ہو جو یقیناً دلچسپی کی جان ہو گا۔ لیکن شاعر کے لئے لازم ہے کہ قرینِ قیاس ناممکنات کو خلافِ قیاس امکانات پر ترجیح دے۔

ایک آخری اور اہم نکتہ ارسطو نے یہ بیان کیا ہے کہ رزمیہ شاعر کو مورخ نہیں سمجھ لینا چاہئے اور نہ اس سے من و عن تاریخی حقائق کے بیان کی توقع کرنی چاہئے۔ وہ کہتا ہے کہ مورخ وہ واقعات بیان کرتا ہے جو پیش آ چکے ہیں لیکن شاعر وہ بیان کرتا ہے جو پیش آ سکتے تھے یا قرینِ قیاس تھے۔ اس طرح شاعر کا بیان مورخ کے مقابلہ میں زیادہ فلسفیانہ اور بہتر ہوتا ہے۔ مورخ ان خاص حقیقتوں کو

لیتا ہے جو وقوع پذیر ہو چکی ہیں اور شاعر عام حقیقتوں کو سامنے رکھتا ہے لیکن بقول ارسطو وہ شاعر بھی گھٹیا درجہ کا نہیں سمجھا جا سکتا جس کی روئیداد کے واقعات فی الواقع پیش آ چکے ہوں لیکن ایسے واقعات میں شاعر کو قیاس غالب کی صفت اُبھارنی چاہیے۔

ارسطو نے ٹریجیڈی کی طرح رزمیہ شاعری کی بھی چار قسمیں سادہ، پیچیدہ، اخلاقی اور المناک بتائی ہیں اور پھر فیصلہ کیا ہے کہ روئیداد، اطوار، تاثرات اور زبان کی خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ رزمیہ کے اوّلین اور مکمل نمونے ہومر کی شاعری میں موجود ہیں۔

ارسطو کے بعد اب تک ہزار ہا سال گزر گئے۔ زندگی کے تار و پود بدلے، تمدن بدلا، کلچر بدلا، اقتصادی نظام وہ نہ رہا، سیاسی تنظیم کچھ سے کچھ ہو گئی۔ سائنسی اکتشافات نے ذہنی اُفق بدل دیا۔ نشو و حیات کے تقاضوں نے ہزار ہا عجائبات پیدا کر دیئے۔ آبادی کی وسعت، پھیلاؤ اور پھر مختلف علاقوں کے میل جول سے نئی نئی چیزیں وجود میں آ گئیں۔ تہذیب کے مختلف رنگ پیدا ہوئے اور شعر و ادب کے اصناف میں بھی بہت تنوع پیدا ہو گیا۔ ارسطو کے سامنے ٹریجیڈی اور رزمیہ دونوں کے محدود نمونے تھے جن کی بنیاد پر اُس نے ان اصناف کے ترکیبی عناصر متعین کئے تھے لیکن جب اس کے بعد ہزار ہا سال کی تخلیقات نے مواد میں تنوع اور وسعت پیدا کر دی تو نئی تصانیف کی قدر و قیمت متعین کرنے کا معیار بھی کچھ سے کچھ ہو گیا جس طرح عہد ارسطو کی ٹریجیڈی اور آج کی ٹریجیڈی میں زمین آسمان کا فرق ہے اسی طرح رزمیہ کے قدیم و جدید مقصد و منہاج کا انقلاب بھی فطری امر تھا جس نے میزان اور کسوٹی کے اصول بدل دیئے ہیں۔ جب ملٹن Milton کی پیراڈائز لاسٹ Paradise Lost بلیک مور Blackmore کی کنگ آرتھر King Arthur

والٹیر Voltaire کی ہینریڈ Henriade ، اسپنسر Spenser کی فیری کوئن Faerie Queene ڈانٹے Dante کی ڈیوائن کامیڈی Divine Comedy شیکسپیر Shakespeare کے تاریخی ڈرامے ، بنیان Bunyan کی "دی ہولی وار" The Holy War ، گبن Gibbon کی Decline and Fall of the Roman Empire. جیسی تصانیف وجود میں آئیں تو نقادوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان تخلیقات کو ادب کی کس صنف میں جگہ دیں بالآخر ان میں کچھ عناصر رزمیہ کے پاکر ان کی روح کو رزمیہ کی قبیل سے بتایا گیا اور ان کو اس اصطلاحی احاطے میں داخل کرنے کے خیال سے رزمیہ کی حدود میں وسعت اور تبدیلی کی ضرورت محسوس کی۔ اس کام کے لئے اس نوع کی معذرت ضروری تھی:

Whether or not the reader likes the ensuing account of the epic, he will have to admit that it squares with a modern practice of going outside the bare form or the bare fact and seeking the essential spirit. A.W. Schlegel used the words classical and romantic in a very simple sense. Classical meant ancient Greek and Roman; romantic the Gothic that came after. About a hundred years later Middleton Murray declared that 'Romanticism and Classicism are perenial modes of the human spirit. The tragic has now for a long time been allowed to exist outside the limits of strict tragedy; it has been found in Beowulf, Lycidas, the Ancient Mariner, and Madame Bovary: the comic exists in many places outside the comic drama. By such analogy there is warrant enough for refusing to indentify epic with the heroic poem and for seeking its differentia in matters other than nominal and formal.

(ترجمہ) قاری کو خواہ رزمیہ کی مندرجہ ذیل توضیح پسند ہو یا ناپسند لیکن اُس کو اتنا ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ کسی صنفِ ادب کی ہئیت یا حقیقتِ محض سے باہر نکل کر اُس کی لازمی روح کو تلاش کرنا موجودہ دستور کے عین مطابق ہے۔ مثلاً اے۔ ڈبلیو۔ شلیگل A.W. Schlegel نے "کلاسیکی" اور "رومانی" کے الفاظ کو بہت عام مفہوم میں استعمال کیا تھا یعنی کلاسیکی سے مراد قدیم یونانی یا رومی طرز اور رومانی سے مراد گوتھک Gothic انداز جو مذکورہ بالا اسالیب کے بعد وجود میں آیا۔ تقریباً سو سال کے بعد (اس مفہوم میں تبدیلی پیدا ہوئی یہاں تک کہ) مڈل ٹن مرے Middleton Murray نے یہ توضیح کی کہ رومانیت اور کلاسیکیت انسانی روح کے دو دائمی موڈ (رنگِ طبیعت) ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک مدت سے المناکی یا حزنیہ کیفیت کو خالص ٹریجڈی (المیہ ڈراما) کی مقررہ حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت مل چکی ہے۔ چنانچہ یہ فضا (المناکی) بیو ولف، لسی ڈاس، اینشنٹ مارینر اور مادام باورے میں بھی ملتی ہے۔ اسی طرح مزاح اب مزاحیہ ڈراموں کے علاوہ بھی بہت سی جگہ پایا جاتا ہے۔ اس روشنی میں ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اگر رزمیہ Epic کو ہم سورمائی نظم Heroic Poem کا مماثل نہ سمجھیں تو اس کا ہمارے پاس کافی جواز موجود ہے۔ نظم کی ان دونوں اصناف میں تفریق محض رسمی یا اسمی نہیں بلکہ یہ فرق بالکل دوسری قسم کا ہے۔" (i)

بہرحال امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ جب قسم قسم کی ایپک نظموں کے نمونے سامنے آئے تو ارسطو کی وضع کردہ تعریف اور حدود میں وسعت کے امکانات پیدا ہوئے تاکہ اُن طویل بیانیہ نظموں کو بھی ایپک کے دائرے میں شامل کر لیا جائے

(i) The English Epic and its Background by Dr. E.M.W. Tillyard, 1954 Edition, Page 4 and 5.

جو نو کلاسکی عہد میں تخلیق ہوئی تھیں اور جن پر کسی اور اصطلاح کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا۔ ان قدیم و جدید نظموں میں عظمتِ موضوع، عظمتِ کردار اور عظمتِ بیان ہی کا رشتہ زیادہ استوار ہے کیونکہ نو کلاسکی نظموں میں سورمائی عناصر کا التزام ضروری نہیں سمجھا گیا اور ڈاکٹر ٹِل یَرڈ **Tillyard** کو آسانی اسی میں نظر آئی کہ وہ ایپک کے قدیم مفہوم سے سورمائی موضوعات کی پابندی ہٹا دے تاکہ وہ نظمیں بھی ایپک کے احاطے میں داخل ہو جائیں جن میں سورمائی عنصر بہت کم یا مفقود تھا۔ ایسی ہی نظموں کی رعایت سے ایبرو کرومبی **Abercrombie** نے ایپک کی تعریف کا یہ ڈھنگ نکالا کہ ایپک ایک ایسی نظم کو کہیں گے جسے پڑھ کر قاری کے ذہن پر وہی اثر مرتسم ہو جیسا کہ ایلیڈ، بیوولف اور پیراڈائز لاسٹ کو پڑھ کر ہوتا ہے۔

نقادوں کی ان رعایتوں کے باوجود ایپک کے بنیادی مفہوم اور اُس کی مقبولِ عام تعریف میں ارسطو کی مقرر کی ہوئی حدود اور تعریف میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہو سکا مثلاً آکسفورڈ کمپینین آف انگلش لٹریچر **Oxford Companion of English Literature.** میں اس کی تعریف ملتی ہے:-

A poem that celebrates in the form of a continuous narrative, the achievements of one or more heroic personages of history or tradition.

(ترجمہ) ایپک وہ نظم ہے جس میں ایک مسلسل بیانیہ انداز سے تاریخ یا قومی روایت کے کسی ایک یا کئی اولوالعزم غازیوں کی فتوحات بیان کی جائیں۔

اسی طرح کیسلز انسائیکلوپیڈیا حصہ اوّل صفحہ ۱۹۵ پر ایپک کی یہ تعریف کی گئی ہے:

A long narrative poem, recounting heroic actions usually of one principal hero and often with a strong national significance.

(ترجمہ) ایک طویل بیانیہ نظم جس میں عموماً ایک خاص ہیرو کے مردانہ معرکوں کی تفصیلات

بیان ہوتی ہیں۔ اکثر یہ معرکے شدید قومی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

سی، ایم، باورا C.M.BOWRA نے اپنی مشہور کتاب "ایپک پوئٹری فروم ورجل ٹو ملٹن Epic Poetry From Virgil to Milton. میں ایپک کی جو تعریف کی ہے وہ ان عام تعریفوں سے کسی قدر جامع، تازہ اور معنی خیز ہے۔ وہ لکھتا ہے:

An epic poem is by common consent a narrative of some length and deals with events which have a certain grandeur and importance and come from a life action, especially of violent action such as war. It gives a special pleasure because its events and persons enhance our belief in the worth of human achievement and in the dignity and nobility of man (i)

یعنی ایپک متفقہ طور پر ایک بیانیہ نظم کو کہتے ہیں جو کسی قدر طویل ہو اور جس میں ایسے واقعات بیان کئے جائیں جن میں کچھ عظمت اور اہمیت ہو اور جو عملی زندگی بالخصوص جنگ و پیکار قسم کے تند و شدید عمل سے پیدا ہوئے ہوں۔ ایسی نظموں کے مطالعہ سے ایک خاص حظ حاصل ہوتا ہے کیونکہ ایسے واقعات اور ایسے افراد انسانی کامرانیوں کی قدر و قیمت اور انسان کی عظمت و شرافت کے متعلق ہمارے یقین میں اضافہ کرتے ہیں۔

باورا نے اپنی اس تعریف میں وہ نکتہ بھی سامنے رکھا ہے جس کی اہمیت کا احساس خود ارسطو کو بھی تھا لیکن کسی وجہ سے اس کا براہِ راست اظہار بوطیقا میں نظر انداز ہو گیا ہے۔ یعنی ایپک ایسے واقعات کی حامل ہوتی ہے جو زندگی کے عمل بالخصوص جنگ و پیکار قسم کے تند و شدید عمل سے پیدا ہوئے ہوں۔ اس تند و شدید عمل یعنی جنگ و پیکار

(۱) صفحہ ۱ کتاب مذکورہ

کا وجود دنیا کی تمام عظیم رزمیہ نظموں میں بے کم و کاست پایا جاتا ہے چنانچہ ایلیڈ، اوڈیسی، مہابھارت، رامائن، اینیڈ، شاہنامہ اور خود پیراڈائز لاسٹ تک میں یہ عناصر اور یہ فضا موجود ہے۔ رہی یہ بات کہ دانتے کی "ڈیوائن کامیڈی" اور اسپنسر کی "فیری کوئن" اس عنصر سے کیوں خالی ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان نظموں کو ایپک کہنے میں خود ناقدین کو تامل رہا ہے۔ "ڈوائن کامیڈی" میں اول تو ہیرو کا فقدان ہے دوسرے اس میں کوئی واضح کہانی بیان نہیں کی گئی۔ پھر اس کے واقعات کہانی کے ارتقاء پر کوئی اثر نہیں ڈالتے۔ تیسرے ایپک کے لئے ارسطو نے جو مشورہ دیا تھا کہ اس میں شاعر کو شاعر کی حیثیت سے بہت کم سامنے آنا چاہیے وہ مطالبہ بھی اس سے پورا نہیں ہوتا کیونکہ "ڈوائن کامیڈی" کی تمام تر روئیداد بزبانِ شاعر ہی بیان ہوئی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ اس کے عمل میں بھی زندگی کی گرمی موجود نہیں ہے۔ شپلے Shiplay لکھتا ہے کہ اس نظم کا کوئی ہیرو نہیں۔ شاعر خود ہی واحد متکلم میں شروع سے آخر تک کلام کرتا ہے (۱)

اسی طرح اسپنسر کی فیری کوئن میں ایک کہانی ہونے کے بجائے متعدد کہانیاں ہیں اور پھر حسنِ بیان مفقود ہے۔ اس نظم میں عمل کی گرمی بھی موجود نہیں ہے جو زندگی کے مرقعوں میں جان پیدا کرنے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ اگر ایبر کرومبی ہی کے ہمہ گیر اصول کو سامنے رکھئے تو یہ دونوں نظمیں پڑھ کر وہ اثر ہرگز مرتب نہیں ہوتا جو ایلیڈ، بیوولف اور پیراڈائز لاسٹ پڑھ کر قاری کے ذہن پہ مرتسم ہوتا ہے چنانچہ خود ایبر کرومبی ہی "فیری کوئن" کے متعلق لکھتا ہے:

(i) Dictionary of World's Literary Terms by J.T. Shiplay.

Faery Queene is outside the strict sense of the word Epic. Allegory requires material ingeniously manipulated and fantastic, what is more important, it requires material invented by the poet himself. That is a long way from the solid reality of material which Epic requires: Not manipulation but imaginative transfiguration of material, not invention but selection of existing material appropriate to his genius and complete absorption of it into his being.

(ترجمہ) فیری کوئن درحقیقت رزمیہ Epic کے دائرے کے باہر ہے۔ تمثیل Allegory کے لئے ایسے مواد کی ضرورت ہوتی ہے جو حقائق کی دنیا سے باہر ہو اور غیر معمولی فراست سے ترتیب دیا گیا ہو۔ اس سے بھی زیادہ اہم یہ بات ہے کہ یہ مواد شاعر کا خود ایجاد کیا ہوا ہو۔ یہ تمام چیزیں اس ٹھوس اور حقیقت پسندانہ مواد سے بہت مختلف ہیں جس کی رزمیہ Epic کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔ رزمیہ کے لئے مواد کی ترتیب نہیں بلکہ اس کے تخئیلی طور پر از سر نو تخلیق کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے ایجاد کی نہیں بلکہ جو مواد فراہم ہو اُس میں سے ایسی چیزیں منتخب کرنے کی ضرورت ہے جو شاعر کے مزاج سے سازگار رہیں۔

ان تمام تعریفوں کی چھان بین سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ایپک ایک طویل بیانیہ نظم ہوتی ہے جس میں قومی اہمیت رکھنے والے ایک یا چند انسانوں کی اولوالعزمیو کے واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ یہاں اولوالعزمی سے مُراد یہ ہے کہ کوئی انسان اپنی ذاتی ناموری یا اپنی نسل یا قوم یا کُل دنیائے انسانیت کی مادّی یا روحانی فلاح و بہبود کی خاطر اپنے ذاتی مفاد، امن، آسائش اور جان تک کو قربان کردینے سے گریز نہ کرے۔ ایپک کا ہیرو اپنے اوصاف کے اعتبار سے بھی اعلیٰ ہوتا ہے اور اپنی پُرمہم زندگی میں اپنے عمل سے بھی اپنے اعلیٰ ہونے کا ثبوت مہیا کرتا ہے۔

ایپک کا ڈھانچا اس طرح تیار ہوتا ہے کہ اس میں کہانی کے آغاز، درمیان اور انجام کا لحاظ رکھتے ہوئے ہیرو کا ایسا عمل بیان کیا جاتا ہے جو واحد، مکمل اور عظیم ہوتا ہے۔ روئیداد اتنی وسیع ہوتی ہے کہ وہ صفائی اور سہولت کے ساتھ سمجھ میں آجاتی ہے۔ اُس میں بعض سیرتوں کے خصائص کا اظہار ہوتا ہے۔ کرداروں کی گفتگو یا اُن کے عمل سے واقعات آگے بڑھتے ہیں۔ نظم کے لئے جو بحر استعمال کی جاتی ہے وہ بھی کہانی کے مزاج سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور پھر پوری نظم میں جو زبان برتی جاتی ہے وہ بھی مناسب و برمحل ہوتی ہے بالخصوص نظم کے ایسے حصّوں میں جہاں عمل کی رفتار سُست ہونے لگتی ہے وہاں اور بھی زیادہ اہتمام کے ساتھ مزیّن زبان استعمال کی جاتی ہے تاکہ قارئین یا سامعین کی دلچسپی میں کوئی کمی واقع نہ ہو۔

ہڈسن Hudson اور باورا Bowra نے ایپک کی اقسام کا تعیّن کرکے ایک اور راستہ بھی دکھایا ہے۔ ہڈسن ایپک کو تاریخی ارتقاء کے لحاظ سے دو حصّوں میں تقسیم کرتا ہے یعنی قدیم ایپک Primitive or Epic of Growth اور عہدِ متاخر کا ایپک یا فنّی ایپک Epic of Art ۔ باورا نے ان دونوں اقسام کے لئے جداگانہ اصطلاحات مقرّر کی ہیں۔ وہ انھیں حقیقی ایپک Authentic Epic اور ادبی ایپک Literary Epic کا نام دیتا ہے اور ان دونوں کا فرق ظاہر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ دونوں قسمیں اپنی اپنی تکنیک میں ایک دوسرے سے ممتاز ہیں اور ان کا طرزِ انشا بھی جداگانہ اوصاف رکھتا ہے۔ اُس نے بیوولف Beowulf اور پیراڈائز لاسٹ Paradise lost کو اپنے اپنے طرز کی ممتاز تصانیف بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ ان میں سے ایک زبانی ہوتی ہے اور دوسری تحریری۔ ایک سُننے کے لئے لکھی جاتی ہے اور دوسری

پڑھنے کے لئے۔ ایک گائی جاتی ہے اور دوسری کتاب میں پڑھی جاتی ہے - ایک تخلیقی Inspired، براہ راست Direct اور برجستہ Uupreme - ditated ہوتی ہے جو ایسے شاعر کا نتیجۂ فکر ہوتی ہے جسے تہذیب Culture نے آلودہ نہیں کیا۔ اس کے برخلاف ادبی ایپک Literary Epic کے نام ہی سے یہ خیال ذہن میں ابھرتا ہے کہ وہ اشتقاقی Derivative، صناعانہ Manufactured ہوگی اور اس کی بنیاد زندگی کے بجائے کتابی واقعات پر ہوگی۔ اس طرح ان دونوں اقسام کی نظموں کی تکنیک اور طرز انشا میں بنیادی فرق ہونا ضروری ہے۔ باورا نے تکنیک اور فن کے اعتبار سے ہومر کی نظموں کو اصلی Authentic اور زبانی Oral قسم کی ایپک قرار دیا ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ ہومر نے Oral Art کو اس وقت اختیار کیا جب وہ فن برجستہ گوئی سے باہر نکل چکا تھا لیکن ہومر کا آرٹ پھر بھی اسی قبیل کا ہے جیسا بیوولف؛ دَ سونگ آف رولینڈ Song of Roland میں پایا جاتا ہے۔

ہڈسن کا خیال ہے کہ Epic of Growth or Primitive Epic (جس کو غالباً حماسۂ ملی کہنا زیادہ موزوں ہوگا) لازمی طور پر کلیتہً ایک ہی شاعر کے دماغ کی پیداوار نہیں ہوتی بلکہ بڑی حد تک عمل ارتقا اور انضمام کا نتیجہ ہوتی ہے کیونکہ اس کا مواد مشہور حکایتوں اور متداول روایتوں کی صورت میں پہلے سے عوام میں مقبول ہو چکا ہوتا ہے۔ ایپک نگار اسی متداول مواد کی تہذیب و تنظیم کرتا ہے اور اپنے فن سے واقعات کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو ایک سلسلہ میں جوڑ دیتا ہے۔ اس طرح حماسۂ ملی کو مسلسل نشو و نما اور تنظیم و تشکیل کا نتیجہ کہنا چاہیے۔ منبع اور مخرج کے ایک ہونے کی وجہ سے تمام قدیم ایپک کے موضوع اور نفس قریب قریب ایک ہی سے ہوتے ہیں ان میں عموماً وہی قدیم روایات بیان

ہوتی ہیں جو عوام کی دیو مالا سے ماخوذ ہیں۔ اس لئے ان سب رزمیہ نظموں میں فوق فطری عنصر نمایاں رہتا ہے۔

حماستِ ملی **Primitive Epic** کے برخلاف حماستِ فنی **Epic of Art** ایک ایسے نابغہ ذہن کی پیداوار ہوتی ہے جسے ایک شاندار علمی عہد اور ادبی کلچر ہی پیدا کر سکتا ہے۔ اگر ایک طرف حماستِ ملی کا ہیرو اپنی پوری قوم، تاریخ اور تہذیب کا نمائندہ ہوتا ہے تو دوسری طرف حماستِ فنی میں پوری ملت کی ثقافتی سرگرمیوں کی ترجمانی کے بجائے محض کسی مخصوص طبقے یا بعض افراد ہی کے اعمال کی آئینہ داری ہوتی ہے۔ مؤخر الذکر میں تشخص، کردار نگاری اور شعوری صفات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور بیانِ واقعات پر کم۔ لیکن اس امتیاز و اختلاف کے باوجود حماستِ فنی کا اپنے بنیادی خصائص میں حماستِ ملی سے مشابہ ہونا ایک قدرتی امر ہے کیونکہ خود حماستِ فنی کی بنیاد بھی تو آخر قدیم ایپک یا حماستِ ملی پر ہی رکھی گئی ہے اس لئے اس میں بھی بڑی حد تک اُسی قدیم تشکیلی منصوبے کی پابندی ہوتی ہے۔ موضوعات بھی قدیم طرز پر دیو مالائی ہوتے ہیں جن میں ہمت جوانمردی کا بیان کیا جاتا ہے۔ اور مافوقِ فطری عناصر کے استعمال سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ قدیم اور روایتی تفصیلات زمانۂ نو کی مناسبت سے اپنی ترتیب و تشکیل میں نئی ہو جاتی ہیں۔ دونوں کے طرز انشاء میں بھی بہت گہرا فرق ہونے کے باوجود کچھ باتوں میں مشابہت و مطابقت باقی رہتی ہے یعنی نئی ایپک میں بعض ایسے فارمولے، مقررہ اوصاف، سکہ بند فقرے اور محاورے باقی رہ جاتے ہیں جو قدیم ایپک کی بھی نمایاں خصوصیت تھے۔ لیکن اس مماثلت کے باوصف اختلاف پھر بھی نمایاں رہتا ہے جو دونوں کے مابین فرقِ زمانی سے پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ اساطیری دور کا مواد نئے زمانے کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا اور شاعر کو اُس میں

ایجاد و اختراع اور عالمانہ تحقیق سے کام لینا پڑتا ہے اور پھر اس قدیم مواد کو ایسے مجرد اصولوں کے مطابق جو تسلیم شدہ ادبی روایت بن گئے ہیں استعمال کرنا پڑتا ہے، اس لئے اگر حماسۃ ملی تازہ، برجستہ اور تخلیقی ہوتی ہے تو حماسۃ فنی فاضلانہ، کتابی اور تقلیدی ہوتی ہے۔ البتہ فنی ایپک میں مواد اور ہیئت کی نئی ماہرانہ تشکیل، اس کا تصرف Adaptation اُس کا تبحر Erudi tion، اُس کی گونج، اُس کے وقائع کی یاد Reminisences، اُس کی خصوصیت اخذ و قبول Borrowing ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو ایک قاری کو پرانی ایپک کے مقابلے میں ممتاز نظر آجاتی ہیں۔ ہڈسن Hudson لکھتا ہے کہ قاری کو اس امتیاز کا احساس "اینیڈ Aeneid اور پیراڈائز لاسٹ کے تقابلی مطالعہ سے بآسانی ہو سکتا ہے۔ مشرقی شاعری میں فردوسی کا "شاہنامہ" اور نظامی کا "سکندرنامہ" اسی قبیل کی جداگانہ تصانیف کہی جا سکتی ہیں۔

یہاں تک ہم نے ایپک کی تعریف، اس کے لازمی اجزا، اور اس کی اقسام سے بحث کی۔ اب ہم دنیائے اسلام کی ایپک نگاری پر نظر ڈالتے ہیں تو عربی زبان میں ایپک کا مترادف لفظ "حماسۃ" نظر آتا ہے جو خشونت، شجاعت اور شدت کا مفہوم رکھتا ہے۔ عربی زبان میں وہ قصائد و قطعات حماسۃ سے تعبیر کئے جاتے ہیں جن میں کسی فرد نے اپنی ذات یا اپنی قوم کی شجاعت پر فخر کیا ہے یا اپنے یا اپنے خانوادے کے جنگی کارناموں کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن ایپک کا تصور ان نظموں کے قامت پر پوری طرح منطبق نہیں ہوتا۔ حقیقت میں عربی زبان میں ایپک کا فقدان ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ قبلِ اسلام سے عرب میں ملت کا کوئی تصور نہ تھا۔ پوری قوم قبائل میں بٹی ہوئی تھی اور ہر قبیلہ اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے اپنے حسب نسب اور اپنے اسلاف کے کارناموں پر فخر کرتا تھا۔ اس کے برخلاف ایران

میں ملّت اور وطنیت کے تصور کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہی - ایرانی اور تورانی، ایرانی اور یونانی، ایرانی اور عرب تصادم نے اُن کے اس احساس کو زندہ رکھا۔ بیرونی حملہ آوروں کے خلاف تنظیم کے مواقع ایرانیوں نے زیادہ پائے تھے اِس لئے ان کے ضمیاتی اور تاریخی واقعات میں ایپک نظموں کا خاصہ مواد موجود تھا۔ لیکن چونکہ شعروادب کے باب میں مسلمانوں کا رشتہ نہ یونان و روما سے مربوط تھا اور نہ ہندوستان سے اِس لئے ایپک کے نمونے ان کی نظر سے نہ گزر سکے - علاوہ اس کے وطنیت کا تصور یوں بھی اسلام کی عالمگیر تعلیم اخوّت کے منافی تھا اور اس صورت میں وطن کی محبت وحمایت میں کسی ایپک کا تخلیق ہونا دشوار تھا - بہر حال ایرانی وطنیت کے جذبے، حالات کے تقاضے اور صلہ وانعام کی خواہش نے فردوسی سے شاہنامہ مکمل کرایا جو اسلامی دنیا میں ایپک نظم کے لحاظ سے حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے - یہ بقول براؤن ممالکِ اسلامی میں رائج شدہ ایپک کا سکّہ بند نمونہ ہے جو ایران کی ملّی داستانوں کو ایپک کی قطعی اور مکمل صورت میں پیش کرتا ہے [1]

ایران کے بعد جب ہندوستان میں عہدِ اسلامی کے ادبی سرمائے پر نظر جاتی ہے تو ایپک نگاری کے سلسلے میں ہمیں بہت مایوسی ہوتی ہے کیونکہ یہاں شاہنامۂ فردوسی کی نوعیت کی کوئی نظم ہمیں نہیں ملتی - گو اس صنف کے چند نمونے ہمیں گولکنڈہ اور بیجاپور کے شعراء کے کلام میں ملتے ہیں مثلاً کمال خاں رستمی نے ۱۰۵۹ھ / ۱۶۴۹ء میں بیجاپور کے بادشاہ علی عادل شاہ کی ملکہ خدیجہ سلطان شہر بانو عرف بڑے صاحب کی فرمائش پر "خاور نامہ" کو فارسی سے اردو میں منتقل کیا۔ "خاور نامہ" میں حضرت علیؓ مرتضیٰ اور ان کے مصاحب ابوالمعجن کی مہموں کا تذکرہ ہے۔ خاور نامہ

---

[1] History of Persian Literature, Vol. I, Page 123 (Edition 1956)

کے چھتیس ۳۶ سال بعد گولکنڈہ کے ایک قزلباش امیر غلام علی خاں لطیف نے ایک سال کی اَن تھک کوشش سے "ظفر نامہ" کو اردو کا جامہ پہنایا - اس نظم میں حضرت علی کے صاحبزادے محمدؔ ابنِ حنفیہ کی زندگی کے بعض واقعات اور اُن کی فتوحات کا ذکر ہے - ان مذہبی نوعیت کی نظموں کے علاوہ بعض نظمیں دوسرے مباحث پر بھی لکھی گئیں جن میں سب سے اہم تصنیف نصرتی کا "علی نامہ" ہے - اس میں علی عادل شاہ (بیجاپور) کی فتوحات کا مفصل بیان ہے - یہ نظم اِس خصوصیت کے لحاظ سے امتیازی حیثیت رکھتی ہے کہ اس میں شاعر نے اپنے ہی ملک کے ایک بادشاہ کو ہیرو کی حیثیت دی ہے. بہرحال اِن تین نظموں کے جائزے کے بعد ہماری نظر دکن سے شمالی ہند کی طرف بڑھتی ہے تو یہاں ایک کا فقدان ہمیں اور زیادہ مایوس کرتا ہے. لیکن آخر کار لکھنؤ کے مذہبی خلوص، ادبی جوش اور تہذیبی شعور کے زمانے میں اُردو مرثیہ کو امام حسینؑ کے کردار میں وہ عظیم ہیرو مل گیا جس کے کارنامے اسلامی تاریخ میں زریں حروف سے لکھے ہوئے تھے اور جس کے نام سے مسلمانوں میں انتہائی شیفتگی پائی جاتی تھی - ایک طرف امام حسین کی زندگی، اُن کی سیرت، اُن کے کردار وعمل اور اُن کی اخلاقی فتوحات میں ایک شاعری کا موضوع بننے کے لئے تمام عظمت وجلالت موجود تھی اور دوسری طرف لکھنؤ کا وہ موافق ماحول تھا جس میں مذہبی اذکار سے شغف، سپاہ گری سے لگاؤ، شاعری سے مناسبتِ طبعی اور داستان گوئی سے دلچسپی پائی جاتی تھی. بہت آسانی سے مجلس عزا کا منبر مرثیہ کے لئے ایک متبرک پلیٹ فارم بن گیا اور شرکائے عزا اس کے باذوق سامعین ہوگئے - ضرورت کے مطابق مرثیہ کی بیرونی ہئیت میں بھی انقلاب رونما ہوا اور نظم جو مصراعی بندوں سے مسدس کی صورت اختیار کر گئی - اس کی ترتیب کے لئے بھی کچھ اصول منضبط ہوئے اور اس کے طول کا بھی ایک معیار مقرر ہوا - جب اُردو مرثیہ اپنے فطری تقاضوں

کے باعث ترقی کی منزلیں طے کر کے ایک عظیم نظم کی صورت اختیار کر رہا تھا۔ اُس وقت اُسے جو فن کار ہاتھ آئے اگرچہ اُن کے پیشِ نظر دنیا کی عظیم ایپک کے نمونے یعنی ایلیڈ، اوڈیسی، انیڈ اور پیراڈائز لاسٹ نہیں تھے اور نہ وہ مہابھارت اور رامائن سے کماحقہٗ واقف تھے کیونکہ ہندوستانی مسلمانوں کا تہذیبی دستور اور تعلیمی نظام اُس زمانے میں ایسا نہ تھا جس کے اندر سنسکرت کی عظیم تصانیف سے روشناس ہونے کے مواقع مل سکتے۔ اُنھوں نے اپنے زمانے کے علمی دستور کے مطابق عربی اور فارسی کے ذریعہ سے مروجہ علوم کی تعلیم پائی تھی اس لئے اُن کے ذوقِ ادب کی پرداخت اور اُن کے کلام کی ترتیب و آہنگ میں فارسی کی مثنویوں بالخصوص فردوسی کے شاہنامے اور نظامی کے سکندرنامے کا اثر زیادہ رہا۔ اس لئے بھی کہ ان کے رزمیہ موضوعات جن میں ایشیائی انداز کی رزم آرائیاں تھیں فارسی نظموں کے موضوع سے زیادہ قریب تھے۔ غرضکہ ضمیرؔ، خلیقؔ، فصیحؔ، دلگیرؔ اور ان کے بعد انیسؔ و دبیرؔ اور پھر اُن کے معاصرین و اخلاف کے شعری مواد کے لئے حضرت امام حسینؑ کی زندگی کے واقعات ولادت سے شہادت بلکہ مابعدِ شہادت تک اُن کے سامنے تھے اور اسی کے ساتھ پورے خاندانِ رسالت اور اُن کے احباب و انصار کی زندگی بھی اُن کی نظر میں تھی لیکن مرثیہ نگار اپنے ماحول کے محدود مطالبات اور اپنے سامعین کی مخصوص توقعات سے مجبور تھے کہ وہ زیادہ وسیع پیمانے پر اپنی نظم کی تشکیل نہ کریں۔ مجلسِ عزا میں تنگیٔ وقت کا احساس ہی اُن کی طول کلامی کے ولولوں کو روکنے کے لئے کافی تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انیسؔ نے ایک مرثیہ کچھ ایسے ہی ولولوں سے معمور ہو کر شروع کیا ہے

اے رخشِ کلک رزم کا میداں دکھا مجھے
برہم ہجومِ فوجِ بدایاں دکھا مجھے
دستے ستمگروں کے گریزاں دکھا مجھے
اوراقِ جزوِ کفر پریشاں دکھا مجھے

لکھ جائے دفتروں میں وغا فرد فرد کی
فصلیں جدا جدا ہوں کتاب نبرد کی

وہ بہت اختصار کے ساتھ سلسلہ وار خانوادۂ اہلِ بیت کے ہر مجاہد کی جنگ بیان کرتے ہوئے جناب علی اکبر کی شہادت تک پہنچے تھے کہ ۱۳۴ بند پر انھیں مجلس کے طویل ہو جانے کا خطرہ لاحق ہوا اس لئے انھوں نے اس معذرت کے ساتھ اپنا مرثیہ ختم کر دیا ؎

سمجھا کے لے گئے جو بہن کو امام دیں | بچھیں صفیں بپا ہوا ماتم ہلی زمیں
بس اے انیس رو چکے مجلس میں سامعیں | یہ دھیان ہے کہ طول سے بیدل نہ ہوں کہیں

موقوف حال سرورِ عالی مقام کر
لازم ہے مرثیہ کو اسی جا تمام کر

اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ امام حسین کے حالات کو ایک مسلسل و مربوط نظم کے رشتے میں پرونے کے بجائے ایسے ٹکڑوں میں بانٹا جائے کہ تمام واقعات دو تین گھنٹے روزانہ بیان کے حساب سے بارہ چودہ روز میں تحت اللفظ کی رفتار سے سنائے جا سکیں کیونکہ عشرۂ محرم، سویم اور اربعین کی تقریباً بارہ تیرہ مجالس میں کل واقعات کا احاطہ کر لینا ضروری تھا۔ اسی ضرورت کے تحت روضۃ الشہداء اور دہ مجلس قسم کی کتابوں میں ایک خاص ترتیب کا خیال رکھا گیا اور حدیث خواں اور نثار بھی مجلسِ عزا میں عام طور پر اسی انداز سے واقعات بیان کرنے لگے۔ اس طرح اور مرثیہ نگاروں کو بھی مرثیہ پڑھنے میں اسی روایت کی کم و بیش پابندی کرنی پڑی یہ ترتیب عام طور پر اس طرح ہوتی تھی :-

(۱) چاند رات یا یکم محرم میں عموماً یزید کی بیعت کے سوال پر امام حسینؑ کے تاثرات اور ولید حاکم مدینہ سے گفتگو۔

(۲) دوسری مجلس میں امام حسینؑ کا مدینہ سے سفر اور شہادت جناب مسلم ابن عقیل

(۳) تیسری مجلس میں امام انام کی کربلا میں آمد

(۴) چوتھی مجلس میں ناصرانِ حسین میں سے بعض کے حالات مثلاً جناب حبیب ابن مظاہر کا نصرتِ امام کے لئے آنا اور پھر شہادت پانا

(۵) پانچویں مجلس میں جناب حُر کے واقعات، جنگ اور شہادت

(۶) چھٹی مجلس میں حضرتِ عون و محمد کی رخصت، جنگ اور شہادت

(۷) ساتویں مجلس میں حضرتِ قاسم کے حالات

(۸) آٹھویں مجلس میں جناب عباس کی سقائی، جنگ اور شہادت

(۹) نویں مجلس میں جناب علی اکبر کی شہادت

(۱۰) دسویں مجلس میں جناب علی اصغر اور امام عالی مقام کی شہادت

(۱۱) عشرۂ محرم کے بعد سویم وغیرہ کی مجالس میں خیموں کا جلنا، اہل حرم کی گرفتاری کوفہ کا سفر، مسیّب کا نصرتِ امام کے لئے آنا۔

(۱۲) چہلم کی مجالس میں دربارِ یزید اور قیدخانے کے واقعات، اہل حرم کی رہائی، شہدا کی لاشوں کا دفن ہونا اور اہلبیت کا ورودِ مدینہ وغیرہ۔

گویا یہ تمام واقعات تسلسل کے ساتھ ایک پوری روئیداد تھے جس کا ہر ٹکڑا جو کسی مخصوص شہید کے واقعات پر مشتمل تھا ایک علیحدہ اور مکمل سانحہ بھی تھا اور پھر بڑی روئیداد کا ایک ذیلی بیان یا ایک ضمنی جُز بھی۔ اس طرح ہر مرثیہ جو کسی ایک شہید کے سانحہ سے متعلق ہے اپنی جگہ ایک مختصر ایپک کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اگر تمام شہدا کے مراثی کو مربوط کر کے ترتیب دیا جائے تو مختلف سانحات کے جوڑ سے ایک وسیع ایپک سامنے آجاتی ہے۔

انیس و دبیر، اُن کے اساتذہ اور معاصرین و مقلدین کی جو تصانیف ہمارے سامنے ہیں اُن کو دیکھ کر یہ نتیجہ بآسانی نکالا جا سکتا ہے کہ ان تمام مرثیہ گویوں میں

طویل ایپک لکھنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی اور ان میں سے ہر شخص امام حسین کی زندگی کے واقعات کو ان کے تمام اسباب و علل اور عوامل و عواقب کے پیشِ نظر طویل ایپک کی صورت میں بھی بیان کر سکتا تھا لیکن مجالس عزا کے تقاضوں نے اِس خیال کو اُبھرنے نہیں دیا ورنہ ممکن تھا کہ فارسی شاعرِ مقبل کے انداز کی بہت سی نظمیں جن میں امام حسین کے واقعات تفصیل سے بیان ہوتے بڑی آسانی سے ترتیب پا جاتیں تاہم ان حالات کے پیشِ نظر انیسؔ اور دوسرے مرثیہ نگاروں کے دل میں کسی طویل بیانیہ نظم کی ترتیب کا خیال پیدا ہونا قرینِ قیاس امر تھا، لیکن محض ماحول کے تقاضوں اور محدود و مختصر مطالبات کی تعمیل نے اُنھیں سنجیدگی سے اس طرف مائل ہونے کا موقع نہیں دیا۔ کہتے ہیں کہ میر ضمیرؔ نے اٹھارہ سو ۱۸۰۰ بند پر مشتمل ایک ایسا طویل مرثیہ لکھا تھا کہ جس میں تمام شہداء کے حالات اور اُن کی لڑائیاں نظم ہوئی تھیں لیکن بقولِ افضل حسین ثابت مؤلف "دربارِ حسین" وہ مرثیہ اُن کے ورثاء کی بے توجہی سے ضائع یا معدوم ہو گیا بہر حال وہ مخصوص مرثیہ آج ہمارے سامنے نہیں ہے البتہ انیسؔ و دبیرؔ کے مراثی کو تھوڑی سی کتر بیونت کے بعد بعض لوگوں نے ایسی ترتیب سے پیش کر دیا ہے کہ جس میں امام حسین کا مدینہ سے اوّل مکّہ اور پھر عراق کا سفر اور کربلا کے تفصیلی واقعات ایک طویل نظم کی صورت میں آ گئے ہیں۔ اِس نوعیت کی نظموں سے یہ بات اور بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ انیسؔ و دبیرؔ دونوں میں طویل ایپک لکھنے کی پوری صلاحیت موجود تھی لیکن وہ چونکہ مجلسِ عزا کی تنگیٔ وقت سے مجبور تھے اس لئے امام حسین کے عظیم کارنامے پر کوئی عظیم ایپک تخلیق نہ ہو سکی البتہ بعض طویل مرثیوں نے اس کمی کو کسی حد تک ضرور پورا کر دیا ہے۔ اس طرح کے جن مرثیوں میں امام حسین کی زندگی کا ایک سرسری سا جائزہ لیتے ہوئے اُن کی شہادت تک کے بعض اہم واقعات بیان ہو گئے ہیں اُنھیں ہم ایپک سے زیادہ قریب پاتے ہیں۔

بہرحال لکھنؤ کا کم و بیش ہر مرثیہ ایپک سے مشابہت رکھتا ہے کیونکہ ہر مرثیہ میں مذہبی نوعیت کا ایک ہیرو ہے جس کی جاں سپاری کے واقعات ایک ترتیب کے ساتھ بیان ہونے کی وجہ سے ایک مکمل روئیداد بن گئے ہیں۔ اس روئیداد کی تنظیم میں ابتداء، وسط اور انتہا کا احساس ملتا ہے۔ روئیداد کی وسعت و طوالت اتنی موزوں ہے کہ ڈیڑھ دو گھنٹے کی صحبت میں پورا واقعہ بیان ہوجاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ناصرانِ حسین کے مراثی میں یہ کمی ضرور محسوس ہوتی ہے کہ اُن مرثیوں کا ہر ہیرو کسی بڑے ہیرو یعنی امام حسین کے زیرِ اثر نظر آتا ہے۔ وہ ہیرو جتنا امام حسین سے دوستی یا رشتہ کے باعث قریب ہوتا ہے اُتنا ہی اُس میں قربانی اور ایثار کا جذبہ زیادہ ملتا ہے۔ ہیرو کی تبدیلیٔ قسمت کا مضمون بھی اپنے اسباب کے بیان میں کچھ تشنہ سا محسوس ہوتا ہے۔ یعنی اگرچہ شہادت بیان شدہ مربوط واقعات ہی کے نتیجہ میں واقع ہوتی ہے لیکن یہ شہادت اپنا علاقہ کچھ ماقبل یا غیرِ مذکورہ واقعات سے بھی رکھتی ہے مثلاً امام حسین کا نرغۂ اعدا میں آجانا اور تین دن سے پانی بند ہونا وغیرہ ایسے واقعات ہیں جو ہر شہید کے حادثات کا پس منظر ہوتے ہیں لیکن یہ واقعات بہ خیالِ طوالت یا بہ خوفِ تکرار عموماً نظرانداز کردئیے جاتے ہیں اور شاعر براہِ راست کسی شہید کا حال بیان کرنا شروع کردیتا ہے۔ اصل میں شاعر اور سامعین کے ذہن میں اُس مخصوص سانحے کا مکمل سیاق و سباق پہلے سے موجود ہوتا ہے اس لئے شاعر کو روزانہ ہر واقعہ اوّل سے شروع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ ہر نئی مجلس میں اپنا بیان کسی درمیانی منظر سے شروع کرتا ہے مثلاً اُسے جناب عون و محمد کا مرثیہ لکھنا ہے تو وہ عام طور پر پس منظر کی وضاحت کے لئے اپنا بیان کسی پچھلے حادثے کی طرف صرف اشارہ کرتے ہوئے یوں شروع کرے گا ؎

رَن میں جس دم حُرِ ذی شان نے شہادت پائی — قتل ہوا شاہ کے مہماں نے شہادت پائی
اسدِ بیشۂ ایماں نے شہادت پائی — یاورِ شاہِ شہیداں نے شہادت پائی
کبھی اس طرح نہ مہرِ فلک آرا چمکا
جس طرح حُرِ دلاور کا ستارا چمکا

حُر کا ماتم تھا کہ مرنے گئے میداں میں بُریر — لڑ کے لاکھوں سے ہوا خاتمہ اُن کا بالخیر
باغِ جنت کی دکھائی اُنھیں تقدیر نے سیر — پہلے مقتل میں عزیزوں سے فدا ہو گئے غیر
صبح سے کرتے تھے دونوں جو دعا مرنے کی
پائی مسلم کے یتیموں نے رضا مرنے کی

گھر میں بن باپ کے بچوں کی جو لاشیں آئیں — اُٹھ کے ماں نے صفِ ماتم پہ پچھاڑیں کھائیں
عزتیں دونوں یتیموں نے برابر پائیں — بنتِ زہرا کبھی روئیں تو کبھی چلائیں
آہ و زاری سے کبھی سوئے نجف دیکھتی تھیں
کبھی منہ پھیر کے بیٹوں کی طرف دیکھتی تھیں

دونوں بیٹوں سے اشارا تھا کہ رخصت مانگو — سُرخرو مجھ کو کرو اذنِ شہادت مانگو
جلد اللہ سے مرجانے کی ہمت مانگو — منہ میں خالق نے زباں دی ہے اجازت مانگو
نیچے ہاتھوں سے چھوڑو سپروں کو رکھ دو
قدمِ شاہ پہ جُھک جُھک کے سروں کو رکھ دو

گویا شاعر نے جنابِ حُر کی شہادت سے پہلے کے واقعات بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سامعین ان سے واقف ہو چکے ہیں۔ پھر بھی مرثیہ نگار شاعر اپنے بیانات کو زیادہ موثر بنانے کے خیال سے بعض پچھلے واقعات کبھی تمہید میں بیان کر دیتے ہیں اور کبھی بعد کے سلسلۂ واقعات میں گزشتہ حادثات کی طرف بھی جا بجا اشارہ کرتے رہتے ہیں تا کہ ایک مخصوص حادثہ پورے واقعات کے ساتھ ذہن پر اُبھر سکے۔ غرض

ہر مرثیہ کے ہیرو کو سلسلۂ واقعات کے درمیان سے اُبھار کر دکھایا جاتا ہے - یہ بات اگرچہ فنیّ اعتبار سے کوئی نقص نہیں رکھتی لیکن اپنی سطح کے محدود ہونے کی وجہ سے ہر مرثیہ کی یہ روئیداد کسی عظیم واقعہ کا ذیلی قصّہ یا ضمنی حادثہ معلوم ہوتی ہے -

جو لوگ منتشر مراثیٔ انیسؔ و دبیرؔ کو ایک عظیم ایپک کا مرتبہ دینے پر اصرار کرتے ہیں اُن کی نظر سے یہ بات غالباً محو ہو جاتی ہے کہ ہر چند انیسؔ و دبیرؔ کے متعدّد مراثی کے مجموعی واقعات ایک عظیم ایپک کا مواد ضرور رکھتے ہیں لیکن وہ روئیداد جو ایک مخصوص مرثیہ میں بیان ہوتی ہے وہ دراصل ایک جزوی حادثہ یا ذیلی روئیداد ہوتی ہے اور چونکہ پوری روئیداد قاری یا سامع کے ذہن میں پہلے سے موجود ہوتی ہے اس لئے وہ چھوٹی روئیداد کو نامحسوس طور پر اُس عظیم روئیداد سے منسلک سمجھ لیتے ہیں جو وہاں بیان نہیں ہوتی مگر شاعر کے ذہن میں محفوظ ہوتی ہے -

اگر انیسؔ اپنے مختلف مرثیوں کے سانحوں کو ربط کے ساتھ ایک ہی بحر میں تصنیف کر لیا کرتے تو ان کے ہر سال کے دس بارہ مرثیے مل کر ایک بہت اچھی ایپک بن جایا کرتی اور اگر تصنیفِ شعر کے وقت وہ ایک حد تک اہتمامِ فن و بیان بھی ملحوظ رکھ لیتے تو یہ نظمیں ایک فقید المثال ایپک بن سکتی تھیں - لیکن اتفاق سے ایسا نہ ہو سکا اور موجودہ صورت میں محض اُن کے منتشر مرثیے ہمارے سامنے رہ گئے - اس کمی کے احساس نے ہمیں مجبور کیا کہ انیسؔ کے مختلف بیانات کے جوڑ سے ایک ایسی مسلسل نظم ترتیب دے دیں جو بہر طور ایپک کہلانے کی مستحق ہو - اس ترتیب نو میں ہمیں زیادہ زحمت اُٹھانی نہیں پڑی کیونکہ پوری روئیداد کے منتشر اجزاء اُن کے مراثی میں پہلے سے موجود تھے - ہم نے صرف یہ کیا ہے کہ ایک بحر کے مراثی جمع کر کے کہیں غیر ضروری حصّے نظر انداز کر دئیے ہیں اور کہیں بعض بیانات کو آگے پیچھے

ہٹا کر اُسی ترتیب کو بحال رکھا ہے۔ جو کربلا کے واقعات کے سلسلے میں مسلّم سمجھی جاتی تھی۔ اس طرح ایک مسلسل و مربوط نظم کی تشکیل ہو گئی ہے جس کا واقعہ عظیم، کردار عظیم اور انداز بیان عظیم ہے۔

موجودہ ترتیب میں ایک مناسب و موزوں بحر استعمال ہوئی ہے۔ نظم کا انداز سراسر بیانیہ ہے۔ اس میں ایک ایسے عمل کی نقل پیش ہوئی ہے جو نہایت اہم ہے۔ مناسب طوالت رکھتا ہے اور مکمل ہے۔ شاعر نے شعری صفات کا خاص خیال رکھا ہے اور اپنے بیان کے لئے ایسی زبان استعمال کی ہے جو موزوں ہونے کے ساتھ ساتھ مترنم بھی ہے اور اپنے عہد کی ادبی خوبیوں سے مالا مال بھی۔ نظم کے مختلف حصوں میں کہیں براہِ راست اور کہیں غیر شعوری طور پر اخلاق کے گوناگوں درس بھی دیئے گئے ہیں۔ مجموعی طور پر تمام روئیداد دردمندی، تحیّر اور خوف وہراس کے ذریعہ سے ہمارے ہیجانات کی صحت و اصلاح کا کام سرانجام دیتی ہے اور مثالی کرداروں کی عظمت کے متعلق ہمارے اعتقادات کو بھی مستحکم کرتی ہے۔

اس نظم کے حقیقی ہیرو امام حسینؑ ہیں جو اوّل اوّل بچپن کی ضد اور ہٹ کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں لیکن جب ایک موقع پر حضرتِ رسولِ مقبول اُن کی شہادت کی پیش گوئی کر کے ایک عظیم ذمہ داری اُن کے سپرد کرتے ہیں تو وہ ضدیں چھوٹ جاتی ہیں اور ایک متین کردار اُبھرنے لگتا ہے۔ جب رسول اللہ رحلت فرما جاتے ہیں تو دین کی رہبری کا کام حضرتِ علیؑ اور حضرتِ امام حسنؑ سے گزر کر جنابِ حسینؑ تک پہنچتا ہے۔ اُس وقت آپ کی عمر پختہ ہوتی ہے اور آپ وقار، جراءت و ہمت، علم و فضل اور عقل و دانش میں اپنے انتہائی عروج پر نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کے واقعات گویا اس ایپک کی روئیداد کا ابتدائی حصہ ہیں۔ اب درمیانی حصہ شروع ہوتا ہے جس میں حسین علیہ السلام بطور امام کے متعارف ہوتے ہیں۔

جنابِ حسینؑ کی امامت کو شروع ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کو یزید بلا استحقاق مسندِ حکومت پر بیٹھ جاتا ہے اور اپنی خلافت کو مسلّم کرانے کے خیال سے وہ آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اُس کی تحریک کا آغاز حاکم مدینہ کے نام ایک خط سے ہوتا ہے جس میں وہ حاکم مدینہ ولید کو تاکید کرتا ہے کہ حسینؑ ابن علی سے میری بیعت طلب کر اور اگر وہ آمادہ نہ ہوں تو اُن کا سر قلم کرکے میرے پاس بھیج دے۔ ولید نے جنابِ امام کو خلوت میں بلا کر خط کا مفہوم آپ پر منکشف کیا۔ یزید کے کردار سے حسینؑ اچھی طرح واقف تھے اور جانتے تھے کہ اُس کی بیعت کا اقرار کرلینا گویا اپنے ہاتھ سے اُس کے اعمال و افعال اُس کے احکام اور اُس کے عزائم کی صداقت پر مُہرِ توثیق ثبت کردینے کے مترادف ہوگا اور اگر ایسا ہوگیا تو اسلامیوں کے اعمال میں وہ عیوب راہ پاجائیں گے جن کو مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ لیکن دوسری طرف وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اُن کا بیعت سے انکار پوری حکومت کے مُنہ پر طمانچہ مارنے کے مترادف ہوگا اور اس میں اپنی جان کے علاوہ اپنے تمام گھرانے کی جان و مال اور عزت و ناموس کا خطرہ بھی سامنے ہے لیکن حسینؑ نے آخرکار ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دی۔ اُنھوں نے اپنے خون سے مدینہ کے گلی کوچوں کو محفوظ رکھنے کے لئے اوّل مکّہ کا سفر کیا اور جب یہاں بھی اپنی جان کی امان کے آثار نہ پائے تو مجبوراً حج کو عمرے میں بدل کر عراق کا رُخ کیا۔ اِسی راستہ میں آپ کو اپنے چچازاد بھائی مسلم ابن عقیل کی شہادت کی اطلاع ملی اور دورانِ سفر میں ایسے بہت سے ہمدرد بھی ملے جنہوں نے آپ کو سفرِ عراق سے باز رہنے کا مشورہ دیا لیکن آپ بڑھتے ہی رہے اور دوسری محرّم کو دشتِ کربلا میں پہنچ گئے۔

نینوا پہنچ کر پہلا کام خیمہ و خرگاہ کے لئے جگہ کا انتخاب تھا۔ آپ کے دوستوں

نے دریا کے کنارے خیام نصب کرنا چاہے لیکن یزیدی فوج جو درمیان سفر ہی سے آپ کے ساتھ ساتھ ہو گئی تھی مانع آئی۔ اس پر آپ کے ساتھیوں کو جلال آ گیا لیکن صابر و شاکر امام اُنھیں سمجھا کر دوسری سمت لے گئے اور ترائی سے دُور خیام برپا کرنے پر اپنے دوستوں کو رضامند کر لیا۔ کربلا پہنچنے کے بعد سے یزید کی فوج آنے کا تانتا بندھ گیا۔ شب و روز یہی اطلاعیں ملتی رہیں کہ اب نوفل آیا، اب خولی آیا، اب حُرملہ پہنچا اور اب شمر کے داخلے کی خبر ہے ؎

لاکھوں ہیں کوئی قبل کوئی بعد آئے گا   گیتی ہلے گی جب پسرِ سعد آئے گا

غرض ہر چہار طرف سے بے شمار فوجیں آ آ کر میدان میں جمع ہوتی رہیں۔ ساتویں محرّم سے دریا کے گھاٹ روک کر امام حسین اور اُن کے ساتھیوں پر پانی بھی بند کر دیا گیا۔ دو دن تشنگی کے عالم میں گزارنے کے بعد بھی امام حسین کی جماعت میں ہراس کے آثار نہ تھے۔ آپ نے شب عاشور میں پسرِ سعد سے آخری گفتگو کی اور جب اُسے رو براہ نہ پایا تو اپنا اٹل فیصلہ بحال رکھا۔

پسرِ سعد سے گفتگو کے بعد آپ اپنے خیموں پر واپس آئے اور اپنے دوستوں کو جمع کر کے اپنے منصوبۂ شہادت سے آگاہ کیا۔ اُنھیں یہ بھی یقین دلایا کہ میں صبح اپنے ساتھیوں کے ساتھ شہید ہو جاؤں گا اس لئے جن لوگوں کو اپنی جان پیاری ہو وہ رات کی تاریکی میں اپنے اپنے گھروں کو نکل جائیں۔ یہ فرما کر آپ نے روشنیاں گُل کرا دیں تاکہ جانے والوں کے راستہ میں کسی قسم کی شرم، مروّت اور حیا حائل نہ ہو۔ اس موقع پر کچھ لوگ امام کا ساتھ چھوڑ کر واپس چلے گئے اور محض ۷۲ نفوس باقی رہ گئے۔

عاشور کی رات امام اور اُن کے ساتھیوں نے عبادت میں گزاری۔ دسویں محرم کی صبح کو آپ نمازِ فجر میں مصروف تھے کہ فوجِ مخالف کے تیروں نے لڑائی کا

پیغام پہنچایا۔ آپ نے اُسی حالت میں نماز تمام کی اور اہلِ حرم سے رخصت ہو کر میدان کا رُخ کیا۔ آپ میدان میں پہنچے ہی تھے کہ حُر ابنِ ریاحی نے یزید کی فوج سے نکل کر آپ کی اطاعت اختیار کر لی۔ اور ہراولِ فوج بن کر اپنی جان نثار کر دی۔ حُر کے بعد آپ کے دوسرے رفقا مثلاً بریر ہمدانی، ہلال بجلی، ابنِ نافع اور حبیب ابنِ مظاہر وغیرہ آپ پر قربان ہوئے۔

دوستوں کی شہادت کے بعد اعزّہ کی باری آئی اور وہ بھی ایک ایک کر کے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ سب سے آخر میں خود امام اپنے اعزّہ و انصار کی جدائی کے داغ سینے پر لیے ہوئے میدان میں تشریف لائے۔ اوّل آپ نے اتمامِ حجت کے طور پر فوجِ مخالف سے گفتگو کی اور جب انھیں راہِ راست پر آتے نہ دیکھا تو سامنے آ گئے۔ نمازِ عصر کا وقت قریب آیا تو آپ گھوڑے سے اُتر کر سجدۂ عبودیت میں مشغول ہو گئے اور اسی حالت میں شمر نے پشت کی طرف سے آپ کا سر تن سے جُدا کر دیا اور اُسے نیزے پر چڑھا کر اپنی فتح کا اعلان کر دیا۔

شہادتِ حسین کے بعد پہلے خیامِ اہلِ بیت لوٹے گئے اور پھر اُن میں آگ لگا دی گئی۔ بقیۃ السیف میں سے جناب امام زین العابدین مردوں میں اور چند صاحبزادے بچوں میں زندہ رہے جو پردہ سرایانِ عصمت و طہارت کے ساتھ قید کر کے کوفے بھیج دیئے گئے اور پھر وہاں سے حکمِ یزید کے مطابق اُنھیں دمشق روانہ کر دیا گیا جہاں وہ کچھ عرصہ قید رہ کر رہا ہو گئے۔

امام حسین کے اعزّہ و انصار اور اہلِ بیت نے اصول کی حفاظت، حق و صداقت کی حمایت، اور دین کی عزت و سربلندی کی خاطر دنیا کی یہ عظیم قربانی پیش کی تھی۔ اس قربانی کو یاد کرنا اور یاد کرتے رہنا مسلمانوں کا اہم قومی و مذہبی فریضہ ہے۔ ہر سال محرم کی تقریبات اسی قربانی کی یاد دلاتی ہیں۔ اس سے زیادہ موزوں

اور با عظمت واقعہ کا انتخاب اسلامی ایپک کے لئے محال تھا کیونکہ حسینؑ ہی اپنے اس عظیم کارنامے کے ساتھ وہ زندۂ جاوید ہیرو نظر آتے ہیں جن کی عظمتِ کردار پہ اسلام کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیری　　بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

موضوع کی اسی عظمت کی طرف جنابِ امداد امام اثر نے اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ میر صاحب کو سبجیکٹ Subject یعنی شاعری کا موضوع ایک ایسا واقعۂ بزرگ ہاتھ لگا ہے جس کا جواب دنیا میں نظر نہیں آتا۔ اس واقعہ کے ساتھ واقعۂ ٹرائے (ہومر کی الیڈ کے واقعہ) کو کوئی نسبت نہیں ہے۔ شاہزادہ ٹرائے کا قصہ ایک ناپاک قصہ ہے اور ہر گونہ قابلِ نفرین ہے۔ یہ ہومر ہی کی قابلیتِ شاعری تھی جس نے اُسے قابلِ توجہ بنا دیا ہے۔ ورنہ شاہزادۂ ٹرائے کے قصہ میں کوئی ایسی عظمت کی بات نہیں پائی جاتی ہے جس کی طرف اہلِ مذاق کو کسی طرح کی رغبتِ خاص پیدا ہو سکے۔ برخلاف اس کے کربلا کا معاملہ ہے کہ نہایت اعلیٰ درجے کے امورِ دینی، اخلاق، امورِ تدبیر المنزل اور امورِ سیاستِ مدن وغیرہ پر مشتمل ہے۔ ایسے معاملات کی طرف توجہ کرنا ہر دیندار، ہر ذی علم، ہر حکیم اور فلسفی کا کام ہے۔ یہ واقعہ معاملاتِ عالم کی تمام خوبیوں کا خلاصہ ہے۔ پس کچھ تعجب نہیں اگر میر صاحب کی شاعری کو اس طرح کے ارفع مضامین نے ایک بے قیاس مدد دی ہے۔" [1]

جلالتِ موضوع کے بعد کرداروں کی عظمت کا سوال اہمیت رکھتا ہے کیونکہ واقعات کی بلندی اکثر کرداروں میں اور کرداروں کی عظمت موضوع میں منتقل ہو جاتی ہے۔ ایپک کے کردار شریف النسل، عظیم اور صاحبِ جاہ و مراتب ہوتے ہیں اور پھر اُن کے جوش، شجاعت، حوصلہ و مردانگی اور تجربات کو کچھ اور وسیع و جلیل کر کے

---

[1] کاشف الحقائق جلد دوم صفحہ ۳۷۷ تا ۴۰۸۔ مطبوعہ مکتبۂ معین الادب۔ لاہور

دکھایا جاتا ہے تاکہ اُن کے افعال و اعمال سے قرب و مخالفتِ الٰہی کے موضوع کی توثیق ہو سکے۔ اس ضرورت کے پیشِ نظر اُنھیں عموماً عینیت اور مثالیت کا نمونہ بنا کر دکھایا جاتا ہے۔ اِس لئے اس بات کا بہت امکان رہتا ہے کہ وہ کردار اپنی انفرادیت اور تنوع کھو دیں۔ لیکن اچھے شاعر ہمیشہ طبائع کے توازن و تقابل کو نمایاں کرنے کے خیال سے جداگانہ اور ممتاز کرداروں کی علیحدہ علیحدہ صفات اُبھار کر دکھانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ اسی لئے ملٹن نے بھی بقولِ ایڈیسن حضرتِ آدم اور حوا کو زوال سے قبل اور زوال کے بعد دونوں طرح دکھا کر اپنی کردار نگاری کی خصوصیات کو بہت اُبھار دیا ہے۔ مرثیہ نگاروں بالخصوص میر انیس کے پیشِ نظر بھی اسی نوعیت کی مشکل تھی کیونکہ اُن کے عقائد حسینیت کو کلِ خیر اور یزیدیت کو کلِ شر کی حیثیت سے باہر نہیں دیکھتے تھے۔ امام مامور من اللہ تھے۔ وہ معصوم تھے اور نسلی عظمت کے لحاظ سے بھی اپنے عہد کی شرافت و نجابت کا مکمل نمونہ تھے۔ اُن کی تعریف میں مختصراً یہ کہا جا سکتا تھا ؎

شبیر سا جہاں میں نہیں دُرِ شاہوار — نانا محمدِ عربی فخرِ روزگار
بابا سرِ جہاں کے لئے تاجِ افتخار — مادر جنابِ فاطمہ زہرا سی ذی وقار
نکلا یہ نور نورِ رسالتمآب سے
جس طرح کوئی عطر نکالے گلاب سے

آئینۂ جلالتِ محبوبِ ذوالجلال — تصویرِ شوکتِ اسدِ حق دمِ جدال
خلقِ حسن تو عظمتِ زہرائے خوش خصال — کیا گُل تھا جس سے باغِ دو عالم ہوا نہال
دنیا ہو یا بہشت ہو فیض اُن کا عام ہے
طوبیٰ اِسی نہال کے سایہ کا نام ہے

ممکن نہیں ہے مثل ترا اے سپہرِ جُود — ہے شکل ممتنع قسمِ واجب الوجود
کیا امرِ صدق میں ہے بھلا حاجتِ شہود — ایسے بشر کی مدح کرے کیا بجز درود

دشوار ہے مثال دُرِ بے مثال کی
ساحل تلک نہ پہنچے گی کشتی خیال کی

کہف الوریٰ، امامِ اُمم، معدن التقیٰ — مصباحِ دیں، سراجِ مبیں، ہادیٔ ہُدیٰ
فیاضِ آبِ کوثر و ساقیٔ اولیا — نورِ خدا، امینِ خدا، حجتِ خدا

اُلفت میں بلبلوں کے جگر داغ داغ ہیں
آٹھوں بہشت تیری محبت کے باغ ہیں

ایسے امام کے یگانے بھی مثالی کردار ہی کے نمونے ہو سکتے تھے چنانچہ وہ سب بھی اُنس و وفا کے پُتلے، حلم و شجاعت کے پیکر اور حق و صداقت کے طرفدار تھے۔ وہ نفعِ دنیا کو حقیر اور مزرعۂ آخرت کو حاصلِ حیات جانتے تھے جس وقت اُن کی صفات پر نظر جاتی ہے تو سب گلدستے کے پھول اور تسبیح کے دانوں کی طرح ایک ہی قامت و سیرت کے ساتھ سامنے آتے ہیں ؎

وہ عاشقِ صادق تھے، وہ تھے مومنِ کامل — دی تھی اُنھیں خالق نے تمیزِ حق و باطل
کیا ہوش تھا کیا فہم تھی، کیا عقل تھی کیا دل — کس حُسن سے طے کر گئے وہ عشق کی منزل

محراب عبادت خمِ شمشیر کو سمجھے
جادہ وہ مسافر دمِ شمشیر کو سمجھے

دنیا کی نہ خواہش تھی نہ کچھ فکرِ زر و مال — تھی دولتِ فقر، اُن کیلئے حشمت و اجلال
نہ یادِ وطن تھی نہ اُنھیں اُلفتِ اطفال — شبیر کے عاشق تھے، زہے بختِ خوشحال

منظور یہ تھا جی سے گزر جائیں گے پہلے
اس بات پہ مرتے تھے کہ مر جائیں گے پہلے

مقبولِ خدائے دو جہاں تھے وہ جواں مرد — مرجانے پہ سرگرم تھے اور زیست سے دل سرد
ایک ایک جری دفترِ کونین میں تھا فرد — تابندہ تھے خورشید کی صورت رُخِ پُر گرد

ایسے کسی تسبیح کو کب دانے ملے ہیں
کس شمع کو اس طرح کے پروانے ملے ہیں

مستِ مئے عرفاں تھے وہ سب عاقل و ذی ہوش — تھی غیرِ خدا سب کی اُنھیں یاد فراموش
دُنیا سے بَری یادِ علائق سے سبک دوش — دل یادِ الٰہی میں جو لیں دیکھو تو خاموش

ہر دم سرِ تسلیم تھا خم راہِ خدا میں
بڑھتے چلے جاتے تھے قدم راہِ خدا میں

ہمت سے توانا، پہ ریاضت سے بدن زار — مرنے پہ کمر باندھے شہادت کے طلبگار
غربت، الم فاقہ کشی، زردیٔ رخسار — سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ عیاں پیاس کے آثار

تسبیحِ خدائے دو جہاں وردِ زباں تھی
بیداریٔ شب نرگسی آنکھوں سے عیاں تھی

کیا کیا نہ اذیت تھی پہ تھے صابر و شاکر — مولا کی محبت تھی ہر اک بات میں ظاہر
سَر دینے پہ موجود، فدا ہونے پہ حاضر — اس بھوک میں ثابت قدم اس پیاس میں صابر

کھائے تبر و تیر یہ غمخواری کا حق تھا
وہ کر گئے غازی جو وفاداری کا حق تھا

مرقوم ہیں قرآں میں رُتبے شہدا کے — بے جاں ہوئے پردیس میں کیا رنج اُٹھا کے
وہ چاہنے والے تھے امامِ دوسرا کے — طالب تھا خدا اُن کا وہ مطلوب خدا کے

دنیا میں یہ تحصیلِ سعادت کا صلا تھا
آقا بھی اُنھیں سبطِ پیمبر سا ملا تھا

تلواریں تو تھیں ہاتھوں میں اور کاندھوں پہ ڈھالیں   نیزوں کی سنانوں سے چمکتی ہوئی بجالیں
یہ قصد کہ قبضہ پہ عدو ہاتھ کو ڈالیں   ہم بھی ابھی رہوار کو چمکا کے نکالیں

تلواریں علم کرکے جو لشکر پہ جھکیں گے
نیزوں سے نہ تیروں سے نہ خنجر سے رکیں گے

کہتا تھا کوئی آج کا مرنا ہے سعادت   سر تا بہ قدم خون میں بھرنا ہے سعادت
خنجر کے تلے حلق کا دھرنا ہے سعادت   گردابِ خالق میں گزرنا ہے سعادت

پانی میں وہ لذت نہ وہ کھانے میں مزا ہے
جو آج کے دن حلق کٹانے میں مزا ہے

(کیا فوجِ حسینی ....)   (جلد دوم نظامی پریس ص ۴۹)

انیسؔ نے اپنے ان مثالی کرداروں میں تنوع اور وسعت کئی صورتوں سے پیدا کی ہے مثلاً انھوں نے خود امام حسینؑ کے کردار میں بھی مختلف پہلو سامنے رکھے ہیں۔ اپنے مراثی میں کہیں امام کو عون و محمد کے ماموں، قاسم کے چچا، اکبر کے باپ اور عباسؑ کے بھائی کی حیثیت سے خالص انسانی فطرت کے خواص لئے ہوئے پیش کیا ہے جہاں اعزہ کے بارِ جدائی سے حسینؑ کی کمر خم نظر آتی ہے اور وفورِ غم کی وجہ سے انھیں راستہ نہیں سُوجھتا لیکن دوسری طرف انیسؔ چونکہ عقیدۃً امام حسینؑ کو لولاک لما خلقت الافلاک کے زمرے میں شامل سمجھتے تھے اس لئے انھوں نے انسانی فطرت کی کمزوریوں کو زورِ امامت سے شکست دلائی ہے اور اس طرح وہ انسان جس کے وفورِ غم کے باعث قدم نہیں اُٹھتے تھے جب تلوار اُٹھاتا ہے تو کوفہ و شام کی فوجوں میں تہلکہ پڑ جاتا ہے۔ ایک طرف فرزندِ جواں مرگ کے غم میں حسینؑ کی یہ کیفیت ہے کہ قدم لڑکھڑاتے ہیں اور بینائی زائل نظر آتی ہے چنانچہ انیسؔ لکھتے ہیں:

جب نوجواں پسر شہِ دیں سے جُدا ہوا   روشن قمر سپہرِ بریں سے جُدا ہوا
نورِ نظر امامِ مبیں سے جُدا ہوا   لختِ جگر حسینؑ حسیں سے جُدا ہوا

دل داغ ہو گیا دل وجانِ بتول کا
گھر بے چراغ ہو گیا سبطِ رسول کا

برچھی سے ٹکڑے ہو گیا لختِ جگر کا دل خود باپ نے چھدا ہوا دیکھا پسر کا دل
ہوتا ہے آبگینہ سے نازک بشر کا دل پتھر کا دل نہیں ہے یہ دل ہے پدر کا دل

ایوبؑ بھی اگر ہوں تو دم بھر نکل پڑے
آنسو تھمیں تو منہ سے کلیجہ نکل پڑے

پیری میں آفتِ غمِ اولاد الاماں دل اور زخمِ خنجرِ فولاد الاماں
وہ اضطرابِ خاطرِ ناشاد الاماں وہ اشک شور اور وہ فریاد الاماں

بیٹا نہ ہو تو زیست کا پھر کیا مزا رہا
جب گھر اُجڑ گیا تو زمانے میں کیا رہا

بچھڑا وہ لال جس کا گوارا نہ تھا فراق فرماتے تھے کہ لوٹ لیا تو نے اے عراق
اے موت جلد آ کہ بس اب زندگی ہے شاق خنجر کی آرزو ہے شہادت کا اشتیاق

برباد اس طرح کوئی آباد گھر نہ ہو
کیا زندگی کا لطف جب ایسا پسر نہ ہو

روتے ہوئے حرم میں گئے قبلۂ انام تر تھی لہو سے لختِ جگر کے قبا تمام
رُخ زرد، دل میں درد، بدن سرد، تشنہ کام طاقت نہ قلب میں نہ بدن میں لہو کا نام

یہ درد تھا بکا میں کہ دل ٹکڑے ہوتے تھے
یہ حال تھا کہ رونے پہ دشمن بھی روتے تھے

لیکن اس سلسلے کے آئندہ بندوں میں حسینؑ اپنی پوری شانِ امامت کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور اپنی آخری رخصت کے موقع پر اہلِ حرم بالخصوص جنابِ زینبؑ کو اس طرح تسلی دیتے ہیں ؎

فرمایا شہ نے صبر بہن چاہیے تمہیں	خالق کی یاد سرِ علن چاہیے تمہیں
لب پر رضا رضا کا سخن چاہیے تمہیں	جو ماں کا تھا چلن وہ چلن چاہیے تمہیں

ہر بار پوچھتے تھے سبب آہِ سرد کا
شکوہ کیا علی سے نہ پہلو کے درد کا

ہیں موردِ بلا و مصیبت ازل سے ہم	اس غم کدے میں چین سے گزرا نہ ایک دم
غم ہے ہمارے واسطے ہم ہیں برائے غم	سب اپنے اپنے عہد میں سہہ گئے ستم

اب آخری بہن یہ سواری ہماری ہے
بعد اُن بزرگواروں کے باری ہماری ہے

یہ سچ کہ تم کو مجھ سے محبت ہے اے بہن	کیا کیجئے ناگزیر یہ فرقت ہے اے بہن
پیارے تمہارے بھائی کی رخصت ہے اے بہن	دنیا مقامِ رنج و مصیبت ہے اے بہن

بھولے نہ یادِ حق کبھی گو حال غیر ہو
اس کی ظفر ہے خاتمہ جس کا بخیر ہو

کیا کرتیں تم بہن اجل آتی وطن میں گر	یکساں ہے مرنے والے کو جنگل ہو یا کہ گھر
درپیش ہے سفر ہمیں خلق سے سفر	اب آرزو یہ ہے کہ کٹے جلد تن سے سر

ہر ذکر میں خوش ہیں وہ جنہیں اُلفت خدا کی ہے
میرا نہیں یہ سر تو امانت خدا کی ہے

فرض اور محبت کا یہ تصادم نسوانی کرداروں میں بھی موجود ہے اور جنابِ زینب، جنابِ شہربانو، جنابِ رباب، زوجۂ جنابِ مسلم، زوجۂ جنابِ امام حسن، زوجۂ جنابِ عباس ایک طرف اپنے بچوں کی حفاظتِ جان کا انسانی جذبہ رکھتی ہیں تو دوسری طرف ادائے فرض کے خیال سے وہ سب اپنے بچوں کو خود میدانِ جنگ کے لئے بھی آراستہ کرتی ہیں اور اپنا فدیہ لیکر حسینؑ کے حضور میں آتی ہیں اور رخصتِ جنگ کے لئے سفارش کرتی ہیں مثلاً ؎

بنتِ علی نے عرض یہ کی ہاتھ جوڑ کر رکھتی نہیں کچھ اور میں یاشاہِ بحر و بر
اک جان ہے بس اور یہ دو پارہ جگر مایہ مری یہی، یہی دولت، یہی ہے زر
پالا ہو جس نے اُس کا نہ کچھ حق ادا کروں
ان کو بچاؤں گر تو کسے پھر فدا کروں

باپ اِن کا آج ہوتا جو یاشاہِ نامدار کرتا قدم پہ سر کو تصدق یہ افتخار
ایک اُن کے بدلے آپ کے قدموں پہ ہو نثار میرے عوض فدا کرے ایک اپنی جانِ زار
ان پہ ہمارا حق ہے تو ہم پر حق آپ کا
یہ بھی تو کچھ ادا کریں حق اپنے باپ کا

گردن جھکا کے کہنے لگے شاہِ خاص و عام تم کو جہاں میں پھر نہ ملیں گے یہ لالہ فام
مشتی ہے نسل جعفرِ طیارِ نیک نام چھاتی سے سر لگا کے وہ بولیں کہ یا امام
لِللہ ان کے باب میں اب کد نہ کیجئے
ہدیہ فقیر کا ہے اِسے رد نہ کیجئے

اور جب شہادت کے بعد ان بچوں کی میتیں گھر میں آتی ہیں تو جناب زینب کے صبر و ضبط کا یہ عالم ہے ؎

بیٹھی تھیں ایک گوشے میں زینب جو ننگے سر واں جا کے بولیں بانوئے ناشاد نوحہ گر
پرسے کو لوگ جمع ہیں چلئے ذرا ادھر فرمایا میں نہ جاؤں گی بچوں کی لاش پر
آنچ آ تما کی دل کو جلائے تو کیا کروں
گر فرق میرے صبر میں آئے تو کیا کروں

بس سُن چکی کہ نام کیا خوب لڑ چکے لاشوں پہ لاشیں لوٹ چکیں کھیت پڑ چکے
کنبہ تمام ہو چکا دو گھر اُجڑ چکے گودی میں جو پلے تھے وہ بچے بچھڑ چکے
اب اُن کا غم نہ فکر مرے گھر کی چاہیئے

بی بی سلامتی علی اکبر کی چاہیے

بھائی کے آگے لاشوں پہ جا کر کروں میں بین
بے صبر ہے، یہ دل میں کہیں گے مجھے حسینؑ
گر مر گئے، تو مر گئے وہ دونوں نورِ عین
کیونکر چلوں کھڑے ہیں شہنشاہِ مشرقین
روؤں گی میں تو پھر علی اکبر بھی روئیں گے
صدمہ مجھے یہ ہے کہ برادر بھی روئیں گے

انیسؔ نے کرداروں میں تنوع کی صورتیں اس طرح بھی پیدا کی ہیں کہ رشتہ اور قرابت میں جو شخص جتنا امام سے قریب ہے اتنا ہی اُس کی سیرت میں روحانی پختگی اور قوتِ امتیاز زیادہ ہے۔ یہ امتیاز امام حسینؑ کے دوستوں اور ان کے عزیزوں سب کی ستائش کے موقع پر صاف نظر آجاتا ہے۔ انیسؔ نے ناصران و دوستارانِ امام میں عموماً ثباتِ قدم، پاسِ وفا، جذبۂ شیفتگی، اخلاص و مروّت اور فکرِ عقبیٰ وغیرہ کی صفات نمایاں رکھی ہیں لیکن اعزہ میں چونکہ پنجتن کا خون شامل تھا اور وہ اپنے عہد کی شرافت و نجابت کے مثالی نمونہ تھے اس لئے اُن کی صورتوں میں حسن و جمال کے محاسن بھی اُبھارے ہیں اور سیرتوں میں شرافتِ نفس اور روحانی پختگی کے عناصر کی بھی نشان دہی کی ہے۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے ؎

تھے دہنی طرف جمع عزیزِ شہِ ذی شاں
جن کے رُخِ روشن سے منور تھا وہ میداں
زہرا کے جگر بند، محمدؐ کے دل و جاں
تلواروں کو تولے ہوئے سب جنگ کے خواہاں
میداں میں عجب تنگ سے مرنے پہ تُلے تھے
حیدر کے مرقع کے ورق رن میں کھلے تھے

کچھ طفل تھے اور تازہ جواں تھے کئی خوش رُو
خوش ظاہر و خوش باطن و خوش قامت و خوش خُو
وہ چاند سے رُخ اور وہ گوندھے ہوئے گیسو
بھینی کو سوں تک اُن فاطمہ کے پھولوں کی خوشبو
مرجائیں گے فاقے میں قسم کھائے ہوئے تھے
پانی کا جو تھا قحط تو مرجھائے ہوئے تھے
(کیا فوج حسینی .....)

ایک دوسرے مقام پر انیس کے مُوقلم نے اُن کی تصویر اس طرح کھینچی ہے ؎

اک صف میں سب محمد و حیدر کے رشتہ دار — اٹھارہ نوجواں ہیں اگر کیجیے شمار
پر سب جگر فگار و حق آگاہ و خاکسار — پیرو امام پاک کے دانائے روزگار
تسبیح ہر طرف تہِ افلاک انھیں کی ہے
جس پر درود پڑھتے ہیں یہ خاک انھیں کی ہے

دنیا سے اُٹھ گیا وہ قیام اور وہ قعود — اُن کے لئے تھی بندگیٔ واجب الوجود
وہ عجز وہ طویل رکوع اور وہ سجود — طاعت میں نیست جانتے تھے اپنی ہست و بود
طاقت نہ چلنے پھرنے کی تھی ہاتھ پاؤں میں
گر گر کے سجدے کر گئے تیغوں کی چھاؤں میں

انیس نے عمر و سن کے تفاوت اور دوسرے نفسیاتی امتیازات کو نمایاں کر کے بھی کرداروں میں تنوع کے امکانات پیدا کئے ہیں۔ چنانچہ بچوں کی گفتگو کا انداز علیحدہ ہے، جوانوں کا علیحدہ اور بوڑھوں کا اُن سے مختلف۔ عورتوں کا اپنی فطری کمزوری کے باعث کسی قدر ہراساں ہو جانا قرینِ قیاس تھا لیکن خانوادے کے وقار کا خیال، خلوص و ایثار کا جذبہ اور ادائے فرض کا احساس اُن کی سراسیمگی کو ہمت اور حوصلے کے مظاہرے سے بدل دیتا ہے۔ اس طرح ہر کردار اپنے نفسیاتی خصوصیات دکھا کر اُس پُرشوکت منزل پر پہنچ جاتا ہے جہاں ہر شخص اپنے مخصوص سانحے کا ہیرو نظر آتا ہے اور پھر یہ تمام انفرادی ہیرو مل کر ایک عظیم ترین ہیرو (یعنی امام) کے مقصد کی تکمیل کرتے ہیں۔ اسی نکتے کو نوبت رائے نظر نے اس طرح بیان کیا ہے:

"اشخاص مرثیہ میں سارا خاندانِ نبوت شامل ہے اور ان میں مرد، عورت، بوڑھے، جوان، بچے، آقا اور ملازم سب ہی موجود ہیں اور سب کی گفتگو میں جو لفظ جس کے مناسب حال ہے وہ میر انیس سے زیادہ کوئی

نہیں ادا کر سکا۔ تاہم اُن کے کمال کی انتہا یہیں نہیں ہوتی بلکہ اُن کے سارے مرثیے بالاستیعاب دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے ایسے صدہا التزام کیے ہیں اور فنِ بلاغت کے سارے مدارج طے کر دیئے ہیں۔ نو عمر بچوں سے لیکر جوان اور بوڑھے میدانِ جنگ میں ایک ہی آن بان سے آتے ہیں اور دقیق نگاہیں بھی یہ نکتہ حل نہیں کر سکتیں کہ ان میں کون ہیرو ہے۔ لیکن فنِ بلاغت کے جاننے والے سمجھ سکتے ہیں کہ جس نے سب سے زیادہ ضبط سے کام لیا اور سب سے آخر میں شہادت پائی وہی ہیرو ہے۔ میرانیس نے اس واقعۂ عظیم کے ہیرو امام حسین علیہ السلام اور دیگر اشخاص میں یہ فرق جس خوبی سے دکھایا ہے وہ حال کے ڈرامیٹک اصول کی جان ہے۔[1]

مختصر یہ کہ واقعۂ کربلا بقول کارلائل کسی ایک قوم کسی ایک ملک کی ملکیت نہیں بلکہ انسانیت کی مشترکہ میراث ہے اور اس کے ہیرو یعنی امام حسین نے اپنے ساتھیوں کی معیت میں ایک عظیم قومی مقصد کی تکمیل کی ہے۔ اُن کے حادثۂ عظیم نے اسلامی تاریخ پر گہرا اثر کیا اور اسلام کی تاریخ بدل دی۔ اُن کے کارنامے سے یقیناً سچے دین کی شان و شوکت ظاہر ہوتی ہے اور یہی وہ عناصر ہیں جو ایپک کی نہایت اہم شرط کو پورا کرتے ہیں۔ اِس واقعہ کو سُن کر ایک مثالی انسان اپنی مثالی جماعت اور مثالی خانوادے کے ساتھ سامنے آتا ہے اور انسان کی نیکی اور بدی کے تصادم سے خیر کو سربلند کر کے آفاقی انسان کی عظمت کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اُس کے کارناموں کے تذکرے سے نہ صرف اُس کے قبیلے، نسل، مذہب اور ملت کے دلوں میں جوش، فخر اور عظمت کے احساسات اُبھرتے ہیں بلکہ عام دنیائے انسانیت کے سامنے بھی حق کی سربلندی کا نشان اونچا ہوتا ہے اور اُنھیں نہایت ستودہ اخلاقی

[1] مقالہ نوبت رائے نظر مطبوعہ ماہنامہ "زمانہ" کانپور شمارہ فروری ۱۹۰۷ء

کا سبق دیتا ہے۔

موضوع اور کردار کے جائزے کے بعد ہماری نظر روئیداد کی تنظیم کا جائزہ لیتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لکھنؤ کا ہر مرثیہ ایک مقررہ پلاٹ پر تعمیر ہوا ہے۔ اس تنظیم کی تکمیلی صورت تک مرثیہ نگاروں کی جماعت رفتہ رفتہ ترقی کرتی ہوئی پہنچی ہے۔ یعنی اردو مرثیہ دکن سے شروع ہو کر دلّی اور فیض آباد ہوتا ہوا جب لکھنؤ پہنچا تو خلیقؔ و ضمیرؔ اور اُن کے معاصرین نے اُسے پلاٹ کے اعتبار سے آخری صورت دے دی۔ جس پر انیسؔ و دبیرؔ نے کوئی خاص اضافہ نہیں کیا۔ اس مروّجہ پلاٹ میں اگرچہ وحدتِ عمل اور وحدتِ زمان و مکان کی خوبیاں موجود تھیں لیکن وافر گنجائش و وسعت Greatness of scope نہیں تھی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ انیسؔ و دبیرؔ یا اُن کے معاصرین زیادہ وسیع سطح پر امام حسین کی زندگی کا پورا کارنامہ تفصیل کے ساتھ ایک نظم کی صورت میں پیش کرتے لیکن بعض وجوہ سے ایسا نہ ہو سکا اور اُن کے منتشر مرثیے چھوٹی چھوٹی ایپک نظموں کا مجموعہ ہو کر رہ گئے۔ ہم نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے انیسؔ کے مراثی کو نئی ترتیب دی ہے تاکہ نظم میں وہ وسعت پیدا ہو جائے جو اس اہم موضوع کیلئے مناسب و موزوں تھی۔ اس صورت میں کربلا کا حادثہ ایک مربوط و مکمّل واقعہ معلوم ہوتا ہے جس میں اس حادثے کے عوامل و عواقب بھی نظر آتے ہیں اور اس کے اہم کرداروں کی سیرت و اعمال پر کسی قدر تفصیل سے روشنی بھی پڑتی ہے۔

ہر ایپک میں ٹریجڈی کی طرح ایک بنیادی عمل ہوتا ہے جو عام سطح سے اُبھر کر رفتہ رفتہ بلند ہوتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا ایک پُرسکون عالم میں ڈوب جاتا ہے۔ کلاسکی ایپک میں اُس عظیم واحد عمل کے دامن میں بہت سے ضمنی واقعات اور ذیلی قصّے بھی ہوتے ہیں لیکن یہ ذیلی قصّے اصل عمل سے گہرا تعلق رکھتے

ہیں اور ہیرو کی سربرآوردہ شخصیت سے متعلق ہوتے ہیں ۔ کچھ رومانی انداز کی ایپک نظموں میں ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی تاریخی عمل کے ایک مخصوص دور کو ایک مشترکہ اصول Unifying principle بنا کر بہت سے مخصوص کرداروں کو جمع کر دیا ہے ۔ پیش نظر نظم میں ہم نے جن مرثیوں کے حصے جوڑے ہیں اگرچہ وہ خود بھی ابتدا، وسط اور انتہا کے احساس کے باعث اپنی تنظیم میں مکمل تھے لیکن نئی ترتیب میں ہر ہیرو کا انفرادی بیان ایک ضمنی حادثے کی حیثیت رکھتا ہے اور پھر یہ تمام ذیلی حادثے ایک سربرآوردہ شخصیت یعنی امام حسین کے زیر اثر آ گئے ہیں ۔ اس طرح تمام نظم مجموعی طور پر ایک مکمل زندگی کے اہم کارناموں کا بیان ہے اور ایک عظیم مقصد کی تکمیل کرتی ہے ۔ اس کے واقعات کرداروں کی گفتگو اور عمل کے ذریعہ آگے بڑھتے ہیں یہاں تک کہ نئی ترتیب میں بھی تمام نظم روئیداد کے اعتبار سے مربوط و مکمل ہو گئی ہے یعنی واضح طور پر اپنی ابتدا، وسط اور انتہا کا احساس دلاتی ہے ۔ گویا بہ حیثیت مجموعی روئیداد ایک ہے اور مکمل ۔ اس میں مناسب طوالت پائی جاتی ہے یعنی نہ اتنی مختصر ہے کہ ایک نظر میں کل کا ادراک ہو جائے اور نہ اتنی طویل ہے کہ اس کی وحدت صفائی اور آسانی کے ساتھ قاری یا سامع کے ذہن میں نہ آ سکے ۔ اس میں ایک خانوادے کے راحت سے کلفت تک پہنچنے کا مضمون بہت صفائی کے ساتھ سمویا ہوا ہے اور تاریخی واقعات نہایت آسانی کے ساتھ سمجھ میں آ جاتے ہیں ۔ اب یہ نظم ایڈیسن کے اس مطالبہ کو بھی پورا کرتی ہے جو اس نے پیراڈائز لاسٹ پر تنقید کرتے ہوئے کیا تھا یعنی ایک عمل One Action عظیم عمل Great Action: مکمل عمل Entire Action ۔ انیس کی اس نئی نظم میں ایک بنیادی عمل ہے جو عظیم بھی ہے اور مکمل بھی ۔ ایک روئیداد ہے جس کے واقعات بھی اہم ہیں اور جن کے بیان میں بھی حسن زبان اور حسن کلام کا خاص خیال رکھا گیا ہے ۔ اس پوری روئیداد کے

مطالعہ کے بعد آسانی سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس کے کرداروں کے عمل سے خوف اور ہمدردی کے جذبے نمایاں ہوتے ہیں۔ ایک مخصوص اور المیہ فضا تیار ہوتی ہے۔ حزنیہ پہلوؤں کا یہ غلبہ اس کی کامیابی اور عظمت کے لئے ایک اور دلیل بن جاتا ہے کیونکہ اس عنصر سے قاری کا دل نرم ہو کر مظلوم کا ہمدرد ہوجاتا ہے۔ ڈاکٹر شمس الدین زور نے مراثیِ انیس کا دنیا کی عظیم ایپک نظموں سے مقابلہ کرتے ہوئے اُن کی برتری کے متعلق یہ فیصلہ دیا تھا:

"دنیا کی عظیم الشان نظمیں جن کی زبان اور خیالات نے اپنے اپنے ملک قوم کی ذہنیت اور اخلاق و عادات کی اصلاح کی حسب ذیل ہیں ——
(۱) ایلیڈ (۲) اینیڈ (۳) مہابھارت (۴) رامائن (۵) پیراڈائز لاسٹ (۶) شیکسپیر کے بعض ڈرامے (۷) شاہنامۂ فردوسی۔ گو ان تمام کے مصنفین زندۂ جاوید فلسفی، ممتاز شاعر اور بلند خیال معلّم اخلاق ہیں، اُن کے دماغوں کی ساخت میں یکسانیت نمایاں ہے اور ان میں زبان پر ایسی قدرت اور ان کے خیالات میں اس درجہ وسعت نظر آتی ہے کہ ان کا کلام انسانی طاقت سے باہر نظر آتا ہے لیکن ان سب شہ کاروں پر ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے مراثیِ انیس کو فوقیت حاصل ہے۔ ہومر کی ایلیڈ میں سولہ ہزار، والمیکی کی رامائن میں اڑتالیس ہزار اشعار سے زائد نہیں برخلاف اس کے میر انیس کا کلام اسّی نوّے ہزار اشعار پر مبنی ہے۔ ایلیڈ، اینیڈ اور مہابھارت کے رجالِ داستان پُرعظمت شخصیتیں نہیں ہیں۔ ان کی ذاتی خوبیاں اس درجہ کی نہیں کہ پڑھنے والے کے دل و دماغ کو فوراً اپنی طرف متوجہ کرلیں۔ نیز مہابھارت کسی خاص فکر کا نتیجہ نہیں۔ اس کی تہذیب و ترتیب میں متعدد دماغ لگے ہیں اور صدیوں کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ بعد

یہ اس درجہ تک پہنچی ہے۔ پیراڈائز لاسٹ کا موضوع عظیم بالشان نہیں۔ شیکسپیر کے ڈراموں اور فردوسی کے شاہنامے کے موضوع بے حد وسیع ہیں اور ان میں اس قدر متفرق ہستیاں کام کرتی نظر آتی ہیں کہ پڑھنے والا کسی ایک ہی شخص سے کامل ہمدردی پیدا نہیں کر سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ رامائن کا موضوع اعلیٰ ہے۔ اس نے ہندوستان کے ادب و اخلاق کی درستی میں زبردست حصہ لیا ہے اور اس کے رجالِ داستاں بھی نہایت عظمت مآب شخصیتیں ہیں لیکن وہ ایک طربیہ ہے اور طربیہ حُزنیہ سے بہت کم درجے کا کارنامہ ہوتا ہے۔" [1]

موضوع، کردار، تنظیمِ روئیداد اور مقصدِ نظم کے بعد زبان کی اہمیت کا سوال باقی رہتا ہے اور یہ بھی خاصا اہم سوال ہے کیونکہ موضوع کو خواہ آپ بیانیہ طور پر پیش کریں یا کرداروں کے تاثرات، گفتگو اور مکالموں کے ذریعے سے ظاہر کریں یا ڈرامے کے انداز پر مصروفِ عمل دکھائیں بہر صورت زبان کا استعمال ضروری ہوتا ہے اور نظم ہو یا نثر ہر ادبی تخلیق کی خوبی کا سب سے بڑا انحصار زبان ہی کی موزونیت پر ہے۔ رزمیہ کا موضوع چونکہ جلیل ہوتا ہے اور اس کے کردار عظیم اس لئے زبان پُر وقار، متین اور سنجیدہ ہونی چاہئے بالخصوص ایسے موقعوں پر جب مقربانِ خدا کلام کر رہے ہوں تو طلاقت میں سروشِ غیب کا انداز آجانا چاہئے۔ مراثیٔ انیس اس پہلو سے بھی نہایت مستحکم ہیں۔ انیس اُس خانوادے کے ایک فرد تھے جس کی کم از کم چار پشتیں تو ضرور ہی محافظتِ زبان میں گزری تھیں۔ اُن کے خاندان نے فیض آباد اور لکھنؤ میں ایک لسانی ادارہ قائم کیا تھا جس کی خصوصیات ہی صحت، صفائی، پاکیزگی، شگفتگی اور شیرینی تھیں۔ انیس اپنے عہد میں اس تحریک کے سب سے بڑے محافظ اور پاسبان تھے۔ انھیں اپنی معجز بیانی کا صحیح

---

[1] تنقیدی مقالات (ڈاکٹر محی الدین زور) صفحات ۲۷۵ تا ۲۷۷

اندازہ تھا اس کے ساتھ وہ بہت محتاط بھی تھے اور جادۂ مدح کی نزاکتوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ توفیقِ الٰہی کے بغیر یہ راستہ طے نہیں ہو سکتا ؎

میں کیا ہوں مری طبع ہے کیا اے شہِ شاہاں
حسّان و فرزدق ہیں یہاں عاجز و حیراں
شرمندہ زمانے سے گئے وائل و سحباں
قاصر ہیں سخن فہم و سخن سنج و سخن داں
کیا مدح کفِ خاک سے ہو نورِ خدا کی
لکنت یہاں کرتی ہیں زبانیں فصحا کی

لا یعلم و لا عِلم کی کیا سحر بیانی
حضرت پہ ہویدا ہے مری ہیچمدانی
نے ذہن میں جودت نہ طبیعت میں روانی
گویا ہوں فقط ہے یہ تری فیض رسانی
میں کیا ہوں فرشتوں کی طلاقت ہے تو کیا ہے
وہ خاص یہ بندے ہیں کہ مدّاح خدا ہے

اندیشۂ توصیف شہنشاہِ اُمم ہے
زانو پہ سرِ فکر ہے سجدے میں قلم ہے
یہ راہ ہے باریک کہ لغزش میں قدم ہے
اے دستِ زبردستِ خدا وقتِ کرم ہے
خامے سے نہ کچھ طبعِ خداداد سے ہوگا
یہ مرحلہ طے آپ کی امداد سے ہوگا

انصاف پسند نگاہیں جانتی ہیں کہ مبدءِ فیض کی امداد سے انیسؔ نے اس تلوار کی دھار جیسے جادے کو بھی بڑے حسن و خوبی کے ساتھ طے کیا ہے اور ان کا یہ شاعرانہ دعویٰ اپنے مبالغے کے باوجود قرینِ صدق ہے ؎

ہے لعل و گہر سے یہ دہن کانِ جواہر
ہنگام سخن کھلتی ہے دُکانِ جواہر
ہے بند مرصّع تو ورق خوانِ جواہر
دیکھے اسے ہاں ہے کوئی خواہانِ جواہر
بینائے رقوماتِ ہنر چاہیے اس کو
سودا ہے جواہر کا نظر چاہیے اس کو

ایپک کی زبان کے سلسلے میں ارسطو نے یہ مشورہ دیا تھا کہ تکلم کے اُن حصّوں میں جہاں اطوار اور تاثرات بیان کئے جا رہے ہوں مزیّن زبان استعمال نہیں ہونی چاہیئے ورنہ واقعات اور کرداروں کی خوبیاں واضح نہیں ہوسکیں گی۔ اس کے برخلاف جہاں عمل کی رفتار سُست ہو وہاں مزیّن اور آراستہ زبان مناسب رہے گی۔ انیسؔ کے مراثی میں اس اصول کا پُورا احترام کیا گیا ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے مراثی کے تمہیدی حصّے یعنی چہرے، زبان کے لحاظ سے نہایت مزیّن ہیں اور جب مدح و ستائش، سراپا اور رجز کے بیان کرنے کے مواقع آتے ہیں تو زبان کے اندر حکیمانہ جزالت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے برخلاف رخصت، مبارزطلبی، سپاہیانہ رد و بدل اور شہادت وغیرہ کے بیانات میں جہاں حرکت اور عمل کا موقع ہوتا ہے انیسؔ کا کلام سہل ممتنع سے قریب آجاتا ہے۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انیسؔ کے یہاں سلاست، شیرینی اور شکوہ کے امتزاج سے رفعتِ بیان پیدا ہوتی ہے۔ اس میں ندرتِ تشبیہ و استعارات کا عمل بھی نمایاں ہے لیکن اور صنعتوں کا استعمال بھی بڑے حسین انداز سے ہوا ہے۔ رعایتِ لفظی کا فن جو استعمال کی بے راہ روی کے باعث خاصا بدنام ہو گیا ہے انیسؔ کے یہاں اپنے پورے جمال پر ہے۔ اُن کے کلام میں ایسے اشعار کی کوئی کمی نہیں جن میں حسنِ رعایت اپنے عروج پر ہے ؂

اللہ رے خوشبوئے تنِ محبُوبِ خدا کی ‌‌ ‌‌ ‌‌ ‌‌ پھولوں کی مہک آگئی کلیوں سے قبا کی

ارسطو نے زبان کے ذیل ہی میں بحر کی موزونیت کا سوال بھی اُٹھایا ہے اور رجزیہ بحر کو ایپک جیسے سنجیدہ موضوع کے لئے اور آئمبی Iambic کو ہجویہ نظموں کے لئے مناسب قرار دیا ہے۔ انیسؔ نے اپنی خوش مذاقی سے اپنے مراثی کے لئے اُن موزوں اور آزمودہ بحروں کو برتا ہے جو سپاہیانہ ساز و آہنگ کے عین مطابق تھیں اور جن میں رزم و بزم کے مرقعے خوبصورتی اور زیبائش کے ساتھ جگہ پا سکتے

تھے۔ ان مراثی کو چونکہ مجلس میں تحت اللفظ کے طور پر پڑھنا تھا اور خدوخال، چہرہ مہرہ اور اعضا کی حرکت سے تصویریں بنانے کے علاوہ سانس کے زیروبم، سینہ کے دباؤ اور اُبھار اور آواز کے اُتار چڑھاؤ سے بھی کام لینا تھا اس لئے وہ بحریں برتی گئی ہیں جو ان سب مقاصد کو بیک وقت پورا کرسکتی تھیں۔ سب جانتے ہیں کہ انیس کو موزونیت اور انتخاب کا کیسا اچھا سلیقہ تھا۔ اُنھوں نے الفاظ، مناظر اور واقعات کے انتخاب کی طرح بحروں کے انتخاب میں بھی یہی سلیقہ برتا ہے۔ چنانچہ زیرِ نظر نظم میں بحرِ مضارع استعمال ہوئی ہے جس کے ارکان "مفعول فاعلات مفاعیل فاعلات" ہیں۔ اس بحر میں رجز اور سپاہیانہ گفتگو خصوصیت کے ساتھ مؤثر ہوتی ہے کیونکہ بحرِ مضارع میں جب "ی" اور "و" پر رُکن ختم ہوا اور بعد میں ایک ساکن حرف آجائے تو اس لفظ کے ادا ہونے میں ایک فطری اُبھار پیدا ہوجاتا ہے جیسے بات، چراغ، حال وغیرہ۔ اس طرح بحرِ مضارع میں الفاظ کا اجتماع مؤثر ہوجاتا ہے خواہ وہ الگ الگ کوئی بھی کیفیت رکھتے ہوں۔

مولانا امداد امام اثرؔ اور مولانا شبلی کے زمانے سے اُردو نقادوں کا یہ عام خیال تھا کہ انیس کے مراثی ایپک کا اعلیٰ نمونہ ہیں لیکن لکھنؤ میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کی قیادت اور حضرت نیاز فتحپوری کی پشت پناہی میں اس موقف پر بحث کا آغاز ہوا کہ مراثیٔ انیس ایپک شاعری کی شرائط پوری نہیں کرتے۔ نواب جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی نے اپنے سلسلۂ مضامین میں جو بعد کو "انیس کی مرثیہ نگاری" کے نام سے شائع ہوئے ان شبہات کا ازالہ کردیا تھا لیکن یہ گفتگو یہیں ختم نہیں ہوگئی تھی بلکہ اس کا سلسلہ کچھ آگے بھی بڑھتا رہا تھا آخر پروفیسر راجیندر ناتھ شیداؔ نے جو ہمیں اپنے فیصلے میں کسی نہج سے جذباتی ہونے کا شبہ نہیں دلاتے اپنے ایک گرانقدر مقالے میں جو "اُردو کی ایپک شاعری" کے عنوان سے ماہنامہ آجکل۔ دہلی کی اشاعت

بابت ماہ اکتوبر و نومبر ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا ہے اور جس میں ڈاکٹر احسن فاروقی جعفر علی خاں اثر اور آل احمد سرور وغیرہ نقادوں کے نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے ہمیں بھی کم و کاست یہ فیصلہ دیا ہے کہ "انیس و دبیر کے مرثیے بھی ایپک سمجھے جانے کے مستحق ہیں"

شیدا کے علاوہ پروفیسر محمد طاہر فاروقی نے بھی اس اہم موضوع پر غور کیا ہے اور اپنے مقالے "اردو مرثیہ" مطبوعہ نقوش (لاہور) بابت ماہ جون ۱۹۶۰ء میں مرثیہ اور ایپک کی مشابہت و مناسبت پر بڑے عالمانہ انداز سے یہ رائے دی ہے:

"رزمیہ (ایپک) یونان میں ہر اُس نظم کو کہتے ہیں جس میں موضوع کے ساتھ الفاظ پر، بیان کے ساتھ زبان پر اور خیال کے ساتھ طرز ادا پر زور دیا جاتا ہے۔ ہومر کی "ایلیڈ" اور "اوڈیسی" ورجل کی "اینیڈ"، فردوسی کا "شاہنامہ" والمیکی کی "رامائن" اور ویاس کی "مہابھارت" دنیا کی بہترین رزمیہ تصانیف شمار کی گئی ہیں۔ اُردو مرثیہ بھی ایک رزمیہ ہے اور بلا شبہ ان شہ پاروں کی صف میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔ رزمیہ کی سب سے بڑی خصوصیتیں دو ہیں۔ موضوع کی عظمت اور اسلوب کا شکوہ اور مرثیے میں یہ دونوں باتیں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ موضوع کی عظمت کے لئے کسی لمبی چوڑی دلیل کی ضرورت نہیں۔ امام حسین اور ان کے رفقا کی شہادت جیسا اہم اور پُرعظمت واقعہ ہے، ظاہر ہے۔ در اصل اُردو مرثیہ اس عظیم سانحے کی بازآفرینی ہے۔ رزمیہ ایک اُمت کے افکار، جذبات اور ولولوں کی ترجمانی کیا کرتا ہے اور ایک پورے عہد کے خیالات اُس میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اُردو مرثیہ میں اسلامی اخلاق و کردار کی عظمت ہے، ایثار و قربانی ہے، حق کے لئے سرفروشی کا جذبہ ہے۔ صداقت کے لئے سب کچھ قربان کر دینے کی تڑپ ہے۔ چھوٹوں پر شفقت اور بزرگوں کا احترام ہے۔

دوستوں سے محبت اور دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک کی مثالیں ہیں۔ غرض اردو مرثیہ اسلام کی بلند قدروں کا حامل ہے اور اس کے کردار ان قدروں کے جیتے جاگتے مرقعے ہیں۔

رزمیہ کے لئے جس تخیّل کی بلندی اور پاکیزہ وجدان کی ضرورت بتائی گئی ہے وہ ہمارے مرثیہ نگاروں میں موجود ہے بلکہ اکثر دوسرے رزمیہ نگاروں سے بہتر ہے۔ ان دونوں اوصاف کے ساتھ ان میں ایک خاص قسم کا جوش اور عقیدتمندانہ خلوص بھی پایا جاتا ہے جس نے مرثیہ کے کرداروں میں زندگی کو اور زیادہ تابناک بنا دیا ہے اور اس کو ابدیت اور ان قدروں کو آفاقیت عطا کی ہے۔ اردو مرثیے کی فضا ایک وسیع اور غیر محدود فضا ہے۔ مرثیہ نگار اس میں اپنے تخیّل کی بلند پروازی دکھاتا ہے اور اس نقطے پر پہنچ جاتا ہے جہاں دوسروں کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ تخیّل کی یہ بلند پروازی ایک Epic کی خاص چیز ہے۔ اس سے رزمیہ میں عظمت و شان اور شوکت و شکوہ پیدا ہوتا ہے اور یہ صفت مرثیہ میں بدرجۂ کامل پائی جاتی ہے۔

مرثیے پر دو بڑے اعتراض ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ محض رونا رُلانا سکھاتا ہے، دوسرے یہ کہ اس میں تاریخی واقعات کو بڑی حد تک بدل دیا گیا ہے بلکہ بہت سے واقعات اپنی طرف سے تراش کے شامل کردئے گئے ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مرثیہ مجلسوں کے لئے لکھا جاتا تھا۔ اس کی حیثیت کسی تاریخی کتاب کی نہیں ہے۔ اس لئے مرثیہ گو اور مرثیہ خوان کے مقصد کے لئے رنگ آمیزی اور مبالغہ مفید اور ضروری ہوتا ہے۔ پھر اس پر اس زاویے سے بھی نظر ڈالنی چاہئے کہ مرثیہ ایک طرف رُلاتا ہے تو

دوسری طرف جھنجھوڑتا بھی ہے۔ مرثیہ سُلاتا نہیں بلکہ سوئے ہوئے قومی شعور کو بیدار کرتا ہے۔ رُلانا مرثیہ کا ابتدائی درجہ ہے یہ اُس کا مقصدِ اعلیٰ نہیں بلکہ اُس کی اگلی منزل ہے بلند جذبات کو بیدار کرنا اور اعلیٰ اخلاق کو اُبھارنا۔ اسی طرح رزم و پیکار اور معرکہ آرائی مرثیے کی انتہا نہیں بلکہ اُس کی انتہا ہے اخلاق کو استوار کرنا، مزاحمت اور مقاومت کا جذبہ پیدا کرنا اور کردار کو بلندیوں تک پہنچانا۔ اگر اردو مرثیہ کو غور و تامل سے دیکھا پڑھا جائے تو وہ اُن مفید اور بلند مقاصد کو پورے حُسن و خوبی کے ساتھ انجام دیتا ہے۔"[1]

پروفیسر طاہر فاروقی سے دس بارہ سال قبل ڈاکٹر شوکت سبزواری نے بھی مرثیہ اور رزمیہ کی مشابہت اور مطابقت پر غور کیا تھا۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کو مرثیہ کے ایپک ماننے میں جو اعتراضات تھے جعفر علی خاں اثر کی طرح ڈاکٹر شوکت نے بھی ان کا جائزہ لیا تھا اور اثر کے سلسلۂ مضامین کی اشاعت ہی کے زمانے میں اُنھوں نے بھی اپنا مقالہ "مرثیہ یا رزمیہ" لکھ کر اُن لوگوں کے موقف کی تائید کر دی تھی جو مرثیہ کو ایپک مانتے تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری کا مرثیہ سے کوئی جذباتی لگاؤ نہیں ہے۔ اُنھوں نے یہ مقالہ نہ کسی اضطراری کیفیت کے زیرِ اثر لکھا ہے اور نہ اس سے کسی کی رُورعایت مقصود ہے۔ اُنھوں نے سوچ سمجھ کر اور غور کر کے اپنی رائے دی ہے۔ انصاف پسند نگاہیں ایسی بے لاگ رائے کی قدر کریں گی۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کو سب سے پہلے تو یہ اعتراض تھا کہ اردو ادب کے متوالے لفظ ایپک کا ترجمہ رزمیہ غلط کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ میر انیس ایپک کے مفہوم سے آشنا نہ تھے اور اُن کے مراثی ایپک کا نمونہ نہیں سمجھے جا سکتے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری جواب میں لکھتے ہیں کہ:

"مجھے اس سے بحث نہیں کہ ایپک کا ترجمہ رزمیہ صحیح ہے یا نہیں۔ کسی

---

[1] رسالہ نقوش شمارہ جون ۱۹۶۰ء صفحات ۲۲ و ۲۳

لفظ کا دوسری زبان میں ترجمہ اُس کی پوری وسعتوں کے ساتھ، حدود کا لحاظ کرتے ہوئے قریب قریب ناممکن ہے۔ لیکن اصطلاحی الفاظ کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ اصطلاح خود زبان کے عام، متداول اور روزانہ استعمال میں آنے والے الفاظ میں سے کسی لفظ کو کسی قدر وسیع معنی میں استعمال کرنے کا نام ہے۔ ایپک یونانی میں جس مادے سے بنا ہے اُس کے متعارف معنی لفظ ہیں۔ اس اعتبار سے ایپک کا لغوی ترجمہ ہے "لفظوں کی شاعری" لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ یونانی ایپک صرف لفظوں کی شاعری ہے۔ ایپک کے اصطلاحی معنی اُس کا شاعرانہ مفہوم کچھ اور ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ اصطلاحی معنی اور وہ شاعرانہ مفہوم اُردو لفظ رزمیہ سے ادا ہوتا ہے یا نہیں۔ رزمیہ رزم سے ماخوذ ہے۔ فارسی میں رزم کے معنی جنگ جدال اور ضرب و قتال ہیں۔ اس لئے رزمیہ وہ نظم ہے جس میں معرکہ آرائیاں دکھائی جائیں۔ یہ کہنا اتنا ہی مضحکہ خیز ہے جتنا یہ سمجھنا کہ ایپک کے معنی لفظوں کی شاعری ہے"[1]

دوسری بات کی تردید میں ڈاکٹر سبزواری لکھتے ہیں کہ:

" ایپک ہیئت سے زیادہ موضوع کا نام ہے۔ طرزِ ادا سے زیادہ خیال کا نام ہے کسی صنفِ شاعری کی ہیئت مخصوص ہو سکتی ہے کسی ادب کے ساتھ، کسی قوم کے ساتھ، کسی زمان و مکان کے ساتھ۔ لیکن خیال ایک فطری سرمایہ ہے۔ اسے ہم زمان و مکان اور ادب و زبان کے ساتھ مخصوص قرار نہیں دے سکتے۔ یہ ذہن کی پیداوار ہے۔ فکر کا سرجوش ہے۔ خیال اور خیال میں یکسانی ہوتی ہے۔ مطابقت ہوتی ہے۔ توارد ہوتا ہے۔ ایپک یونان میں بھی ہے، روما میں بھی، ایران میں بھی ہے، ہندوستان میں بھی ہے۔ لیکن کیا اس کی شہادتیں بہم پہنچائی جا سکتی ہیں کہ ادب کی

---

[1] معیارِ ادب مطبوعہ مکتبۂ اسلوب کراچی صفحات ۱۳۸، ۱۳۹

یہ صنف کسی ایک مقام پر وجود میں آئی اور وہاں سے کسی دوسرے ملک میں پہنچی۔ اگر یہ غلط ہے کہ میرانیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے مرثیے ہومرؔ کی ایلیڈ ورجلؔ کی اینیڈ، فردوسیؔ کے شاہنامے، والمیکی کی رامائن' ویدویاس کی مہابھارت کی مثال پر رزمیہ نظمیں ہیں تو اس سے زیادہ غلط اور گمراہ کُن بات یہ ہے کہ میرانیسؔ ایپک کے مفہوم سے آشنا نہ تھے۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے وہ آشنا ہوں لیکن اس میں مجھے شبہ ہے کہ فردوسی رزمیہ کے مفہوم سے واقفیت رکھتے تھے۔ والمیکی ایپک کے اصولوں سے باخبر تھے۔ یہ بھی میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ ہومرؔ کے زمانے میں ایپک کی اصطلاح تھی یہ بھی مشکوک ہے۔ شاعر اصولوں سے واقف نہیں ہوتا وہ اصول بناتا ہے۔ وہ اپنی فطرت سے شعر کہتا ہے۔ وہ آرٹ کی تخلیق کرتا ہے۔ اصول اس کے فن پارے کو سامنے رکھ کر وضع کئے جاتے ہیں نقادؔ کے لئے اصول سے واقفیت ضروری ہے شاعر نقاد نہیں صنّاع ہے۔ شعر کی شریعت کا شارع ہے ..... نقادوں نے ایپک کے جو اصول بنائے ہیں وہ رزمیہ شاہکاروں سے اخذ کئے گئے ہیں۔ جس طرح آسمان کو دیکھکر وسعت، پہنائی، فراخی اور بلندی کا احساس ہوتا ہے اسی طرح ہومرؔ کی اوڈیسی اور ایلیڈ کے مطالعہ سے اس صنفِ سخن کی امتیازی صفات کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ یہ سب صفات رزمیہ میں ہونی چاہئیں یا ان میں سے زیادہ ضروری اور اہم صفات کا رزمیہ میں پایا جانا ضروری ہے۔ والمیکیؔ کا ویدویاسؔ سے، فردوسیؔ کا ملٹنؔ سے اور ہومرؔ کا ورجل سے موازنہ کرنے پر ہمیں ان فنکاروں میں بھی فرق نظر آتا ہے۔ اس فرق کو نظر انداز کرنے کے بعد ہم جو چیزیں ان میں مشترک پاتے ہیں انھیں رزمیہ کی بنیادی

صفات ٹھہراتے ہیں۔

اردو مرثیہ کی تاریخ ہے۔ اس کا ارتقا ہے۔ میر ضمیر سے پہلے مرثیہ اُردو کی کوئی جداگانہ شاعری کی صنف نہ تھی۔ وہ بین کے لئے مخصوص تھا۔ میر ضمیر نے اُسے ایک مستقل صنف کی حیثیت دی۔ حالی کو ضمیر کی یہ بدعتیں ناپسند تھیں۔ وہ رزم و بزم، فخر و خود ستائی، سراپا، لمبی لمبی تمہیدیں اور تو ریئے، گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں نازک خیالی اور بلند پروازی " مرثیہ کے موضوع کے خلاف سمجھتے تھے۔ میر ضمیر کے مرثیے جن میں یہ چیزیں ہیں مرثیے نہیں رزمیے ہیں۔ وہ مرثیہ بالکل جداگانہ چیز ہے جس کا موضوع بین ہے۔ مصائب کربلا کا بیان ہے۔ مرثیہ صرف شہدائے کربلا اور رفقائے امام کے کرب و بلا کی داستان نہیں۔ میر ضمیر اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے کے یہاں یہ اردو ادب کی ایک بلند و برتر صنف ہے جس میں امام ہمام کی بے مثال قربانی کو، حق کے لئے جاں سپاری کو ایک پر عظمت ابدی نقش بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

رزمیہ کی دو بڑی خصوصیتیں ہیں اسلوب کا شکوہ اور موضوع کی عظمت۔ یہ دونوں خصوصیتیں ہمیں مرثیوں میں ملتی ہیں۔ موضوع کی عظمت تو ظاہر ہی ہے حضرت امام حسینؑ کی شہادت اسلامی تاریخ کا ایک عظیم الشان واقعہ ہے۔ ایک ایسا سانحہ ہے جو قوم کی سیرت، اس کی تاریخ، اس کے ادب، اس کی سیاست اور اس کی ثقافت میں ایک زندۂ جاوید محرک کی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو مرثیہ اس سانحہ کی یاد ہے اس کے تاثرات کی بازآفرینی ہے۔ رزمیہ ایک اُمت کے افکار کی، جذبات کی، ولولوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ ایک پورے عہد کے خیالات اس میں جلوہ نما ہوتے ہیں۔ اردو مرثیے میں اسلامی اخلاق کی عظمت ہے، ایثار ہے، قربانی ہے۔ حق کے لئے جان دینے کا جذبہ ہے۔ خوردوں پہ

شفقت اور بزرگوں کا احترام ہے۔ حق کی حمایت میں سب کچھ قربان کر دینے کی سچی تڑپ ہے، شدت و رقت کا امتزاج ہے۔ فولاد کی سختی اور پرنیاں کی نرمی ہے۔ اُردو مرثیہ اسلام کی بلند قدروں کا حامل ہے۔ اس کے کردار اُن قدروں کے جیتے جاگتے مرقعے ہیں"۔ [1]

اس تفصیلی دفاع کے بعد ڈاکٹر سبزواری نے اُردو مرثیوں کی اُس کمی کا بھی اعتراف کیا ہے جس کے ازالے کے لئے ہم نے مراثیٔ انیسؔ سے یہ طویل ایپک ترتیب دی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"ان میں واقعات کی مکمل تصویر نہیں اور نہ طویل داستان کا تسلسل ہے۔ ہر مرثیہ بظاہر دوسرے سے الگ اور اپنی جگہ مکمل ہے۔ یہ غزل کے اشعار کی سی بے ترتیبی، انتشار، ناتمامی اور تشنگی ہے"۔ [2]

اُردو مراثی کی اسی کمی کو پُورا کرنے کی طرف پروفیسر طاہر فاروقی نے بھی ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

"انیسؔ و دبیرؔ کے مراثی میں حسن ترتیب کے ساتھ اگر واقعات کربلا اور اُن کے ماقبل و مابعد کے حالات کو ایک مسلسل مدون کتاب کی شکل میں لایا جائے تو کوئی سبب نہیں کہ ان کو دنیا کی رزمیہ کتابوں میں بہت آگے جگہ نہ ملے"۔ [3]

پروفیسر سید احتشام حسین نے دونوں متضاد حلقوں کے دلائل کی رعایت سے قدرے محتاط فیصلہ دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"میر انیسؔ کے مرثیوں میں واقعات کی پُر اثر اور شاعرانہ تصویر کشی سے

---

[1] معیارِ ادب مصنفہ ڈاکٹر شوکت سبزواری مطبوعہ مکتبہ اسلوب کراچی صفحات ۱۳۹ تا ۱۴۲

[2] معیارِ ادب مصنفہ ڈاکٹر شوکت سبزواری مطبوعہ مکتبہ اسلوب کراچی صفحہ ۱۴۲

[3] رسالہ نقوش لاہور بابت ماہ جون ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۳

جذبات عقیدت کی تسکین بھی ہوتی ہے اور احساسِ فن کے ساتھ ساتھ تزکیۂ نفس کا جذبہ بھی آسودہ ہوتا ہے۔ میر انیسؔ نے مرثیہ کو وہ شکل دے دی جہاں اُس میں غیر معمولی وسعت پیدا ہو گئی اور اردو شاعری کے بہت سے وہ پہلو جو تشنہ تھے یا زوال آمادہ تمدنی حالت میں پسندیدہ نہیں رہے تھے نمایاں حیثیت اختیار کر گئے مثلاً اہم اخلاقی موضوع کو نظم کی بنیاد بنانا، رزمیہ اندازِ بیان اختیار کرنا، نفسیاتی اور حقیقت پسندانہ پہلوؤں پر زور دینا، شاعری کو فطرت کی مصوری کے لئے استعمال کرنا۔ زبان کے بہترین عناصر اور سنجیدہ اندازِ بیان کے اعلیٰ ترین اسلوب سے کام لینا۔ ان تمام باتوں نے مل کر مرثیہ کو ایک خاص قسم کی نظم بنا دیا ہے جو اپنی وسعت کے لحاظ سے ایپک اور اپنے تاثر کے لحاظ سے ٹریجڈی کی سرحدوں کو چھوتی ہے۔ اس میں ایپک کے دائرے میں آنے والی گونا گونی بھی ہے اور ٹریجڈی کو کامیاب بنانے والی وحدتِ عمل اور وحدتِ زمان و مکان بھی"۔ [1]

آئیے ان متضاد نظریات کے بعد ہم پھر قدیم و جدید ایپک کے مخصوص عناصر کا جائزہ لیں اور مراثیٔ انیس میں ان کی تلاش یا نشان دہی کر کے خود کوئی فیصلہ کریں کہ یہ مراثی کس حد تک ایپک کی بنیادی شرائط پوری کرتے ہیں۔ ہڈسن اور باورا کی طرح ایران کے مشہور محقق و نقاد ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے بھی اپنی گرانقدر تالیف "حماسہ سرائی در ایران" کے مقدمے میں ایپک کی دو اقسام حماسۂ طبیعی و ملی Primitive Epic اور حماسۂ مصنوعی Epic of Art بتائی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ حماسۂ ملی میں عموماً قبلِ تاریخی دور کے اساطیری واقعات بیان ہوتے ہیں۔ شاعر اس نوعیت کی نظموں میں واقعات کے ابداع اور تخلیق کی طرف توجہ نہیں دیتا بلکہ وہ تدوین شدہ داستانوں، کتبوں اور زبانی یادداشتوں

---

[1] مقدمہ مراثیٔ انیس جلد اوّل مطبوعہ غلام علی اینڈ سنز صفحہ ۳۱ و ۳۲

سے اپنی نظم ترتیب دیتا ہے۔ یہ واقعات عموماً ایسے ہوتے ہیں کہ جن پر ناقلوں اور راویوں کے تخیل اور اُن کی نقلوں کے اثرات پڑ کر مقدار اور کیفیت دونوں لحاظ سے تغیر پیدا کر دیتے ہیں۔ فارسی شاعری میں اس قبیل کی نظمیں شاہنامۂ فردوسی، بہمن نامۂ حکیم ایران شاہ، گرشاسپ نامۂ اسدی طوسی، برزو نامہ اور جہانگیر نامہ وغیرہ ہیں۔ ایپک کی یہ قسم کسی مخصوص ملت کے نتائج افکار قرائح، علائق اور عواطف سے عبارت ہوتی ہے اور اس ملت کی عظمت کے اسباب بیان کرنے کے خیال سے وجود میں آتی ہے۔ اس میں قومی اہمیت کی جنگ کے واقعات، دورِ پہلوانی کے قصے، جاں فشانی و فداکاری کے حالات بیان ہوتے ہیں۔ ان مذکورہ واقعات کے ذیل ہی میں یہ ظاہر ہو جایا کرتا ہے کہ اپنی حیات کے معینہ ادوار میں جنہیں عموماً دورہ ہائے پہلوانی سے تعبیر کیا جاتا ہے اُس مخصوص اقلیم کی آبادی یا ملت کا تمدن کیا تھا اور اُس کی روح و فکر کے مظاہر کیا تھے[۱]۔ ظاہر ہے کہ اس نوعیت کی ایپک جغرافیائی بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہے اور اُس میں حب الوطنی کے جذبات کی رعایت مقصود ہوتی ہے۔ مراثی انیس نہ اپنے اندر اساطیری مواد رکھتے ہیں اور نہ اُن کی سطح جغرافیائی احساس سے بنی ہے۔ اس لئے وہ ایپک کی دوسری قسم یعنی حماسۂ مصنوع Epic of Art سے زیادہ قریب ہیں جس کے متعلق ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا لکھتے ہیں:

> در ایں منظومہ ہا سروکارِ شاعر با داستانہائے پہلوانیٔ مدوّن و معینے نیست بلکہ خود بابداع و ابتکار می پردازد و داستانے را از پیشِ خود بوجود می آورد۔ دریں گونہ داستانہا شاعراں آزاد و خود مختارند۔ با رعایت قواعد و قوانینے کہ برائے شعرِ حماسی درمیان ست ہر گونہ بخواہند موضوعِ داستانِ خویش را ابداع کنند و تخیلِ خود را دراں دخیل سازند[۲]۔

---

[۱] حماسہ سرائی در ایران تصنیف ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا صفحہ ۵ [۲] ایضاً

ترجمہ: اُن نظموں میں شاعر کو پہلوانی کی مرتب اور معین داستانوں سے واسطہ نہیں ہوتا بلکہ وہ خود اپنی متخیلہ سے بلند پروازی کرتا اور کوئی داستان اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہے۔ اس قسم کی داستانوں میں شاعر آزاد و خود مختار ہوتا ہے کہ رزمیہ کے لوازم کے پیش نظر جس طرح چاہے اپنی داستان کا موضوع ایجاد کرے اور اپنے تخیل کو اس میں دخل دے۔"

مرثیہ اپنے واقعات کی تخلیق و ترتیب کے لحاظ سے اور اپنے دور کے ادبی مزاج کے اعتبار سے یقیناً حماسۂ مصنوع کی صف میں آتا ہے اور اپنی تاریخی اہمیت کے لحاظ سے بھی وہ اساطیری ہونے کے بجائے تاریخی ہے لیکن یہ تاریخ چونکہ مذہبی پہلو زیادہ نمایاں رکھتی ہے اس لئے اس نوع کے مراثی کو حماسۂ دینی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ذبیح اللہ صفا نے بھی خاوراں نامۂ ابن حسام، حملۂ حیدری باذل، کتاب حملۂ راجی، خداوند نامۂ صبا، اُردو بہشت نامۂ سروش وغیرہ کی مثالیں دے کر ایسی نظموں کے لئے یہی اصطلاح استعمال کی ہے۔

ڈاکٹر ٹلیرڈ E.M.W. Tillyard نے اپنی تازہ تصنیف دی انگلش ایپک The English Epic and its Background میں پیرز پلاؤمین Piers Plowman، فیری کوئن، آرکیڈیا Arcadia by Sidney، پیراڈائز لاسٹ، دی ہولی وار The Holy War by Bunyan، ایلیڈ Iliad by Pope اور ڈکلائن اینڈ فال آف رومن ایمپائر —— The Decline and Fall of the Roman Empire by Gibbon کو پہلو بہ پہلو جگہ دے کر ایپک کے مفہوم میں بہت وسعت پیدا کر دی ہے۔ کچھ اس رابطے اور مشابہت کو مستحکم کرنے کے خیال سے اور کچھ گھٹیا، سستی اور روایتی نظموں کو نظر انداز کرنے کی نیت سے انھوں نے ایپک کی روایتی ہیئت کو کسوٹی نہیں بنایا

اس طرح بہت سی خام سورمائی نظمیں صرف یہ کہہ دینے سے اس حلقہ میں جگہ نہیں پاسکیں کہ سورمائی Heroic عنصر کو ایپک کی لازمی شرط سمجھنے کے بجائے ہم نے محض ایپک کے جوہر Epic Spirit کو وجہ اختصاص سمجھا ہے۔ اُردو مرثیہ نہ خالص سورمائی نظم ہے اور نہ اُس کا موضوع اساطیری حکایات ہیں۔ وہ تاریخی اور ادبی چیز ہے اور اپنے اندر وہ جوہر رکھتا ہے کہ جس کی بنیاد پر اُسے ایپک نظموں کے ہر مجموعہ میں مناسب جگہ مل سکتی ہے۔ آئیے دیکھیں کہ ڈاکٹر ٹلیرڈ نے انگریزی ادب کی ان کم مشابہ تخلیقات کو ایک ہی صف میں جگہ دینے کے خیال سے ایپک کے لازمی اجزا کیا مقرر کئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں

The first epic requirement is the simple one of high quality and of high seriousness (i)

یعنی ایپک کی پہلی شرط یہ ہے کہ نظم اعلیٰ ہو اور انتہائی درجہ سنجیدہ اور متین ہو۔ ہم مراثیٔ انیس کو کسی نوعیت سے نہ غیر متین کہہ سکتے ہیں اور نہ اُن کی ادبی فضا کی عظمت سے انکار کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اسلوب کا شکوہ اور موضوع کی عظمت کے تعین سے مرثیوں کے اس رُخ کو مسلّم ثابت کر دیا ہے اور اس سلسلے میں ہم کسی مزید شہادت یا جرح کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ دوسری شرط ڈاکٹر ٹلیرڈ نے یہ لگائی ہے:

"The second epic requirement can be roughed out by Vague words like amplitude, breadth, inclusiveness, and so on." (ii)

یعنی ایپک کے دوسرے مطالبہ کا خاکہ اس طرح کے مبہم الفاظ سے بنایا جا سکتا ہے جیسے

The English Epic and its Background, Page 5. (i)

The English Epic and its Background, Page 6 (ii)

وسعت **Amplitude** ، عرض **Breadth** اور قطعیت یا جامعیت **Inclusiveness**

مراد یہ کہ ایپک میں ایک مناسب طول ہونا چاہئے۔ اس میں خیالات، واقعات اور مناظر وغیرہ کے لحاظ سے گونا گونی ہونی چاہئے اور نظم ہر اعتبار سے مکمل ہو یعنی سانحہ اپنے قطعی ہونے کا اظہار کرے۔ یہ وہ نکتے ہیں جن پر ہم پچھلے صفحات میں ارسطو کی مقرر کردہ شرائط کی جستجو میں تفصیل سے گفتگو کر آئے ہیں۔ اب اُن باتوں کا اعادہ مناسب نہ ہوگا۔ تاہم مختصراً اتنی بات کہی جا سکتی ہے کہ ہر مرثیہ جو کسی اہم حادثے یا کسی مقرب خدا کی شہادت سے متعلق ہے وہ ایک اوسط درجے کی ایپک کی ضروری شرائط پوری کرتا ہے۔ لیکن عظیم ایپک کے لئے واقعات اور کرداروں کے جس پھیلاؤ کی ضرورت تھی وہ ان انفرادی مرثیوں میں نہیں ہے۔ ہاں اگر ایک بحر کے مختلف مراثی کو سلیقہ سے جوڑ دیا جائے تو نئی تشکیل کی صورت میں مختلف کردار اپنا انفرادی کارنامہ بھی پیش کر سکیں گے اور ایک المناک واقعے کے مشترک افراد بن کر امام حسین کے عظیم حادثے کی تصویر بھی مکمل کرا سکیں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پیشِ نظر ترتیب کی تکمیل کے بعد کسی کو انیس کی اس عظیم نظم کے پھیلاؤ، اس کی گونا گونی اور اس کی قطعیت میں کلام نہ ہوگا۔

ٹلیرڈ نے تیسری شرط ایپک کے لئے یہ رکھی ہے:

The third epic requirement has been hinted already through what I said about fortuitous concatenations. Exuberance, however varied, is not enough in itself; there must be a control commensurate with the amount included (i)

میں نے پچھلے صفحات میں ایپک کے تیسرے مطالبہ کی طرف اشارہ "اتفاقی ارتباط" کے الفاظ میں کر دیا تھا۔ مواد خواہ کتنا ہی وافر اور گونا گوں کیوں نہ ہو بجائے خود کافی نہیں سمجھا جائے گا۔

(i) **The English Epic and its Background, Page 8**

جب تک اس کے استعمال اور اس کی ترتیب پر شاعر کو ماہرانہ تسلط نہ ہوگا۔ یعنی مواد کی تنظیم مناسب، موزوں اور جامع ہو۔ نہ کوئی ضروری چیز چھوٹنے پائے اور نہ غیر ضروری چیز شامل ہوسکے۔ نظم کے تمام حصّوں میں بیان کی کڑیاں ایک دوسرے سے ایسی مربوط ہوں کہ نظم کی وحدت میں کسی طرح کا شبہ نہ پیدا ہونے پائے۔ مواد کے اخذ وقبول اور انتخاب و ترتیب میں جس سلیقہ اور حسن کی ضرورت تھی وہ عام طور پر اُردو کے تمام ترقی یافتہ مراثی میں ملتا ہے اور پیش نظر ترتیب میں بھی اُس کا خاص خیال رکھا گیا ہے تاکہ بڑی نظم کا ہر حصہ ایک دوسرے سے مربوط رہ کر نظم کے ایک ہونے کا احساس دلائے۔ اب مراثی انیس کی ترتیب جدید بھی اس معیار پر پوری اُترے گی۔

آخری شرط ایپک کے لئے یہ بتائی گئی ہے:

The fourth requirement can be called Choric. The epic writer must express the feelings of a large group of people living in or near his own time (i)

ایپک کی چوتھی ضروری شرط کو ربط اجتماعی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ ایپک نگار کو ان لوگوں کی اکثریت کے احساسات کی ترجمانی کرنی چاہیئے جو اس کے عہد یا اُس عہد سے قریبی زمانے میں موجود رہے ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ اُردو مرثیہ نے وہ واقعات اخذ کئے تھے جو تقریباً بارہ صدی قبل پیش آچکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے عہد کا سچا ترجمان ہے۔ لکھنوی سماج، لکھنوی تہذیب، لکھنوی معتقدات اور لکھنوی ذوق کی جتنی سچی اور صالح ترجمانی مرثیہ میں ملتی ہے اتنی نظم کی کسی اور صنف میں نہیں ملتی اور یہ کتنا بیجا نہ ہوگا کہ مرثیہ شہدائے کربلا کی سیرتوں کو اُن مثالی تصورات کے رنگ میں پیش کرتا ہے جن سے امام حسین اور ان کے اعزہ و انصار ایسے قومی ہیرو بن جاتے ہیں کہ جنہیں مخاطبین مرثیہ اپنے قبیلے کے بزرگ اور اپنے اسلاف سے جداگانہ

The English Epic and its Background Page · 12 (i)

نہیں سمجھتے۔

غرض ہر اردو مرثیہ بصورت موجودہ بھی ایک محدود و مختصر ایپک کہلانے کا مستحق ہے لیکن اگر کسی ایک شاعر کے تمام مرثیوں کی مجموعی فضا کو ذہن میں رکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ یہ ایک عظیم ایپک کے غیر مربوط حصے ہیں اور اگر حسنِ ترتیب کے ساتھ انھیں مربوط کر دیا جائے تو یقیناً ان سے کئی عظیم ایپک تیار ہو سکتی ہیں۔ ہم نے یہاں مختصر ایک طویل ایپک انیس کے مراثی سے ترتیب دیدی ہے۔ زمانے نے فرصت دی تو اس نوع کی چند اور ایپک بھی انیس کے کلام سے پیش کرنے کی جرأت کریں گے۔

ڈاکٹر صفدر حسین

لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

توصیفِ سخن

رطب اللساں ہوں مدحِ شہِ خاص و عام میں
ہے سر بسر حدیثِ حسن اس کلام میں
لب ہیں خموش پر ہے زباں اپنے کام میں
گویا کہ ذوالفقارِ علی ہے نیام میں

دعویٰ نہیں غرورِ زباں آوری نہیں
جوہر تو لاکھ ہیں پہ کوئی جوہری نہیں

ہر جا ہے مُلکِ نظم میں نظم و نسق مرا
کہتے ہیں انتظام جسے ہے وہ حق مرا
ہے سہلِ ممتنع یہ کلامِ اَدق مرا
برسوں پڑھیں تو یاد نہ ہووے سبق مرا

پائی نہیں کبھی یہ حلاوت نبات میں
مضمونِ نوشتک رہے ہیں بات بات میں

فوجِ سخن میں شُقّہ کُشا ہے علم مرا
بڑھتا ہے سب سے مدح میں بڑھ کر قدم مرا
ڈنکا بجے جہاں میں نہ کیوں دم بدم مرا
ہے معرکہ میں رستمِ دستاں قلم مرا

نقشہ جو کھینچتا ہے صفِ کارزار کا
خامہ دکھا رہا ہے چلن ذوالفقار کا

ہے گوہرِ محیطِ فصاحت سخن مرا
گویا ہے موتیوں کا خزانہ دہن مرا
ہے مدح خوانیٔ گُلِ زہرا چلن مرا
محفوظ ہے خزاں سے جہاں میں چمن مرا

بلبل نے ایسے نغمۂ رنگیں سُنے نہیں
دامن میں ہیں وہ گل جو کسی نے چُنے نہیں

مقبول ہے کلام فصاحت نشاں مرا   ہے بادشاہِ کون و مکاں قدرداں مرا
شہرہ زمیں سے کیوں نہ ہو تا آسماں مرا   بلبل وہ ہوں کہ عرش پہ ہے آشیاں مرا
مداحیٔ حسین سے حسنِ قبول ہے
یہ رتبہ غلامیٔ آلِ رسول ہے

نورِ خدا کی مدح بشر کی ہے کیا مجال   پہنچا کبھی نہ خیلِ ملک کا جہاں خیال
اوصافِ آل میں فصحا کی زباں ہے لال   ناقص کو ہاں اگر وہی چاہے تو دے کمال
برسوں لکھیں تو وصفِ ائمہ بیاں نہ ہو
ہر موئے تن زباں ہو تو شمہ بیاں نہ ہو

کیونکر بیاں ہو شوکت و شانِ پیمبری   عاجز ہیں یاں فرزدق و حسان و حمیری
طاقت ہے یہ کسے جسے لکھے زورِ حیدری   دوڑے کمیتِ خامہ تو کھائے سکندری
قرآں میں جن کا وصف مقرر خدا کرے
کس کی زباں ہے پھر بشر ان کی ثنا کرے

کیا وصف کر سکے کوئی، تابِ بیاں کہاں   طاہر ہو سلسبیل سے، ایسی زباں کہاں
ذرہ کہاں، وہ مہرِ تجلی نشاں کہاں   نسبت ہے کیا زمین کہاں آسماں کہاں
حقا کہ پنجتن کے شرف بے قیاس ہیں
پانچوں حواس آپ یہاں بے حواس ہیں

بینا ہوئی جو چشم تو نورِ خدا کہا   عقدہ کھلا تو عقل نے مشکل کشا کہا
مطلب ہوا حصول تو حاجت روا کہا   پایا دُرِ مراد تو بحرِ سخا کہا
ہم خوش ہوئے کہ مدح کے دریا بہا دیئے
کیا بڑھ گیا جو بحر میں قطرے ملا دیئے

(رطب اللساں ہوں...)

ہے زیورِ عروسِ سخن پنجتن کی مدح　　زینت کلام کی ہے رسولِ زمن کی مدح
ہے لذتِ زباں شہِ خیبر شکن کی مدح　　آرامِ جان و دل ہے حسینؑ و حسنؑ کی مدح
ہر دم یہ ذکر باعثِ عیش و سرور ہے
دل کی جو روشنی ہے تو آنکھوں کا نور ہے

مدحِ حسینؑ

محبوبِ ذوالجلال کا پیارا حسینؑ ہے　　مہرِ عرب کی آنکھوں کا تارا حسینؑ ہے
بعد از حسنؑ امام ہمارا حسینؑ ہے　　بخشش کا عاصیوں کی سہارا حسینؑ ہے
سب کو اسی کی حشر کے دن احتیاج ہے
حقا کہ اس کے سر پہ شفاعت کا تاج ہے　　(ہے زیورِ عروسِ ....)

غافل نہ ہو درود سے ہاں اے زبانِ پاک　　دکھلا دے فیضِ چشمۂ کوثر دہانِ پاک
قرباں ہے جانِ احمدِ مرسل پہ جانِ پاک　　جھکتا ہے عرش دیکھ کے وہ آستانِ پاک
کاٹیں زباں کو لوح پہ گر بے محل چلے
سجدے کی جا ہے کیوں نہ قلم سر کے بل چلے

شبیرؑ سا جہاں میں نہیں دُرِّ شاہوار　　نانا محمدِ عربی مخبرِ روزگار
بابا سرِ جہاں کے لئے تاجِ افتخار　　مادر جنابِ فاطمہؑ زہرائے ذی وقار
نکلا یہ نور نورِ رسالتمآب سے
جس طرح کوئی عطر نکالے گلاب سے

آئینۂ جلالتِ محبوبِ ذوالجلال　　تصویرِ شوکتِ اسدِ حق دمِ جدال
خُلقِ حسنؑ تو عظمتِ زہرائے خوش خصال　　کیا گل تھا جس سے باغِ دو عالم ہوا نہال

دنیا ہو یا بہشت ہو فیض ان کا عام ہے
طوبیٰ اسی نہال کے سایہ کا نام ہے (رطب اللساں ہوں...)

شمشادِ بوستانِ رسالت حسینؑ ہے   مفتاحِ بابِ گلشنِ جنّت حسینؑ ہے
ابرِ عطا و آیۂ رحمت حسینؑ ہے   نقشِ نگینِ مُہرِ نبوت حسینؑ ہے
ہر جا ظہورِ حق ہے انھیں کے ظہور سے
سب خاک سے بنے ہیں یہ خالق کے نور سے

عنوانِ نُہ صحیفۂ اخضر حسینؑ ہے   فیاضِ آبِ چشمۂ کوثر حسینؑ ہے
جسمِ نبیؐ کی روحِ مطہر حسینؑ ہے   کشتیٔ عرش و فرش کا لنگر حسینؑ ہے
قربان رتبۂ شہِ عرش احتشام کے
بیٹے امامِ دیں کے پدر نو ۹ امام کے

مشکل کشائے حاضر و غائب حسینؑ ہے   خورشید و ماہِ مکہ و یثرب حسینؑ ہے
فرماں روائے مشرق و مغرب حسینؑ ہے   دوشِ رسولِ پاک کا راکب حسینؑ ہے
چھوٹے سے سن میں عرش سے رتبہ سوا ملا
لیکن نگیں بھی مُہرِ نبوت کو کیا ملا

عاجز نہ اُس کی مدح میں ہو کس طرح خِرد   افضل کرے جہاں سے جسے مفضلِ احد
اس کی کتابِ وصف کے اک جُز کی ہے یہ جلد   آغاز جس کا ہے ازل انجام ہے ابد
اس میں بھی سب صفاتِ شہِ بحر و بر نہیں
فقرے ہیں مبتدا کے خبر کی خبر نہیں

حدِّ بشر نہیں ہے تری مدح یا امام   بندے سے کس طرح ہو زبانِ خدا کا کام
قُدسی درود بھیجتے ہیں تجھ پہ صبح و شام   میں خاک اور عرش سے اعلیٰ ترا مقام

ذرّے سے وصفِ نیّرِ تاباں ہو کس طرح
اک مور سے ثنائے سلیماں ہو کس طرح

عرشِ خدا ہے تیرے شرف سے بزرگوار — کرسی ترے قدم کی بدولت ہے پائدار
پہنچے فلک پہ گر تری نعلین کا غبار — سمجھے وہ خلعتِ شرف و تاجِ افتخار

ہے راہ پر وہی کہ جسے تجھ سے راہ ہے
نقشِ قدم برائے فلک سجدہ گاہ ہے

روحی فداک اے قمرِ بُرجِ ہل اتیٰ — قلبی لدیک اے گہرِ تاجِ لافتا
ابرِ عطا، محیطِ کرم، منبعِ سخا — شمعِ حریمِ حق، گلِ گلزارِ قل کفا

اے نوحِ خلق تو ہے سفینہ نجات کا
طوفاں میں آسرا ہے فقط تیری ذات کا

قیصر تری جناب کا اک بندۂ کمیں — خاقانِ چیں ہے اک ترے خرمن کا خوشہ چیں
ہے غیرتِ بہشت ترے نور سے زمیں — جاروبِ فرشِ عرشِ شرف، زلفِ حورِ عیں

کرسی کی زیب دوشِ پیمبر کی زیب ہے
تیرے قدم سے عرشِ منوّر کی زیب ہے (شمشادِ بوستان.....)

حسینؑ کی ناز برداریاں

سب جانتے ہیں ان پہ جو تھا مصطفیٰؐ کا پیار — مخفی کسی بشر پہ نہیں مرتضیٰؑ کا پیار
مستغنی البیان ہے خیر النساؑ کا پیار — ان سب کے چاہنے سے سوا تھا خدا کا پیار

بچپن سے بے نیاز کو ناز ان کے بھاتے ہیں
جس چیز پر ہو جی وہی جبریل لاتے ہیں

حاضر ہوئی وہ شے انھیں جس کی طلب ہوئی   ہرنی کو دیر بچے کو لانے میں کب ہوئی
ان کے ہر ایک کھیل میں تائیدِ رب ہوئی   شب کا کبھی جو دن ہوا تو دن کی شب ہوئی
آنکھوں میں اشک بھر کے جو سر کو فرو کیا
روح الامین نے آن کے موتی کو دو کیا

عریاں تھا روزِ عید جو وہ چودھویں کا ماہ   بھیجے خدا نے حلۂ جنت بہ عزّ و جاہ
رومال و زیر جامہ و پیراہن و کلاہ   ہنستے ہوئے پہن کے گئے سوئے عیدگاہ
رستے سے پھر کے آئے محمدؐ کے سامنے
گردن جھکا کے بیٹھ گئے جدّ کے سامنے

بولے یہ مسکرا کے رسولِ فلک اساس   کیوں آج دور بیٹھے ہو آؤ ہمارے پاس
شبیرؑ واہ وا تمھیں زیبا ہے یہ لباس   جی چاہتا ہے ہم بھی پھریں آج آس پاس
ہے روزِ عید چھاتی سے لگ جاؤ آن کے
اے میرے جامہ زیب فدا تیری شان کے

کیا لائے عیدگاہ سے اے میرے گلبدن   شرماتے ہونگے دیکھ کے لڑکے یہ پیرہن
کھِلا ہوا ہے پیشِ نظر خلد کا چمن   اس رنگ کا نہ ہوگا کبھی جامۂ حسنؑ
موضوع ہے یہ رنگ شہادت کے واسطے
جامہ یہ قطع ہے اسی قامت کے واسطے

چھوٹے سے اس عمامہ و شملہ کے میں نثار   صدقے ان آستینوں کے لے میرے گلعذار
قربان اس قبا و عبا پر یہ جانِ زار   یوسف کے پیرہن کی ہے بو جس سے آشکار
کپڑے یہ دیکھ کر شہِ مرداں نے کیا کہا
پیار سے گلے لگا کے تمہیں ماں نے کیا کہا

سب کے تو مل چکے مری جاں لو ادھر تو آؤ ننھے سے ہاتھ اٹھا کے ہمیں تو گلے لگاؤ
صدقے ہوں اس دہن کے ذرا منہ تو آگے لاؤ دے لو جو بوسۂ لب و دنداں تو گھر میں جاؤ
کس غم سے بند لب ہے کہ اب کھولتے نہیں
کیا ہم سے تم خفا ہو کہ کچھ بولتے نہیں

بولا یہ ہاتھ جوڑ کے دستِ خدا کا لال حضرت کو برقرار رکھے ربِّ ذوالجلال
پوشاک پہ ہمیں کے تو ہم خوش ہوئے کمال ناقہ نہیں کہ جس پہ چڑھیں اب ہے یہ ملال
عزت میں ہیں بزرگ، شرف میں زیادہ ہیں
لڑکے تو سب سوار ہیں اور ہم پیادہ ہیں

پیدل تو عیدگاہ میں جانا ہے ننگ و عار ہم کو بھی آج اونٹ منگا دو تو ہوں سوار
کہنے لگے حسینؑ سے محبوبِ کردگار معلوم اب ہوا یہی غصہ تھا میں نثار
ہاں آپ روٹھتے ہیں تو مشکل سے منتے ہیں
اچھا سوار ہو جئے ہم اونٹ بنتے ہیں

فرما کے یہ کمر میں رکھا دامنِ قبا رکھ کر زمیں پہ ہاتھ بنے اونٹ مصطفےٰ
جیبِ قبا میں رکھ کے قدم کو وہ مہ لقا پشتِ جنابِ سیدِ لولاک پر چڑھا
پائے حسینؑ عرش کا سرتاج ہو گیا
وہ روزِ عید کا شبِ معراج ہو گیا

کرسی و عرش دونوں بلندی سے انکی پست تھا ایک ان کے زیرِ قدم ایک زیرِ دست
پڑھ کر درود کہتے تھے مردانِ حق پرست پائی ہے شہسوار نے کیا خوشنما نشست
دونوں ہیں عرش و فرش کی زینت کے واسطے
ایسا نگیں ہو مہرِ نبوت کے واسطے

بولے بلا کے پاؤں حسینِ فلک مقام ہے کس طرح کا ہونٹ کہ جس کے نہیں لگام
گردن پھرا کے کہنے لگے سیّد الانام ہاتھوں میں تھام لو مرے گیسوئے مشکفام
تم سا سوار کا ہے کو دنیا میں پائیں گے
باگیں جدھر پھراؤ اُدھر دوڑے جائیں گے

گیسو نبی کے ننھے سے ہاتھوں میں تھام کر کہنے لگے حسینؑ کہ یا سیّد البشر
لڑکوں کے اونٹ بولتے ہیں سب اُچھل کے گر منہ سے ہمارا اونٹ نہیں بولتا مگر
اس کا نہ بولنا تو بہت دل کو شاق ہے
اب اونٹ کی صدا کا ہمیں اشتیاق ہے

الفت رسولِ حق کو نواسے سے تھی کمال غم تھا کہیں نہ رونے لگے فاطمہ کا لال
آخر بپاسِ خاطرِ فرزندِ خوش خصال عف عف کہا تو ہلنے لگا عرشِ ذوالجلال
جنباں جو یک بیک طبقاتِ زمیں ہوئے
نازل خدا کے حکم سے روح الامیں ہوئے

کی عرض مصطفےٰ سے کہ اے کُل کے عیب پوش اب کی صدا سے پھر نہ رہیں گے کسی میں ہوش
اس دم ہے بحرِ رحمتِ ربّ العلا کو جوش ساتوں جہنم آج ہوئے جاتے ہیں خموش
جس دم رہی نہ آتشِ دوزخ جہان میں
دشمن علی کے جائیں گے پھر کس مکان میں

کیوں مومنو حسینؑ کا رتبہ ہے کیا جلیل بس اک حسنؑ سوا نہیں ان کا کوئی عدیل
آسائشیں کثیر تھیں جب عمر تھی قلیل مرکب جو تھے رسول تو خادم تھے جبرئیل
نوبت جو ایک گام بھی چلنے کی آتی تھی
زہرا زمیں کو جھاڑ کے آنکھیں بچھاتی تھی

(یہ بیت دوسرے بند کی شامل کردی ہے) لہ

• بند ۲۱ صفحہ ۲۲۶ جلد سوم مراثی میر انیس مطبوعہ نولکشور

روتی تھی ٹوٹتا تھا جو گیسو کا ایک تار — لگتی ہوائے گرم تو ہوتی تھی بیقرار
باراں میں بوندیوں سے بچاتی تھی بار بار — سائے سے ان کا دھوپ میں جلنا تھا ناگوار
یوسف کی طرح اس لئے رکھا نقاب میں
سنولا نہ جائے چاند مرا آفتاب میں

تکیہ تھا سر کا بازوئے سلطانِ بحر و بر — راتوں کو فرشِ خواب رہا سینۂ پدر
زہرا کی گود حضرتِ روح الامیں کے پَر — جا سوئے واں توجہِ خاطر ہوئی جدھر
برجِ شرف تھے سب مہِ کامل کے واسطے
رحلیں کئی تھیں ایک حمائل کے واسطے

قرباں تھے جبرئیل تو خیر البشر نثار — مادر ہزار جان سے صدقے پدر نثار
بہنیں فدا برادرِ عالی گہر نثار — طفلی سے تھا حسینؑ پہ سب گھر کا گھر نثار
بُو عنبر میں بھی اس گلِ تازہ کی چھا گئی
گودی میں جس کی ہنس کے گئے جان آ گئی

سی کر سدا پنہاتی تھی ماں نرم پیرہن — تا سُرخ ہو نہ جائے مرے لال کا بدن
اللہ ری احتیاطِ تنِ سرورِ زمن — بدلا وہیں لباس اگر پڑ گئی شکن
واحسرتا کہ واقفِ حالِ پسر نہ تھی
تیغوں سے چور ہوں گے یہ ماں کو خبر نہ تھی (روئے سخن ثنائے...)

مخبرِ صادق کی زبان سے شہادتِ حسینؑ کی پیش گوئی

منظور تھا کہ اور روایت کروں رقم — یاد آ گئی مگر یہ حدیثِ غم و الم
مسجد میں جلوہ گر تھے رسولِ فلک حشم — ہلتے تھے ذکرِ حق میں لبِ پاک دمبدم

روشن تھے بام و در رخِ روشن کے نور سے
آئینہ بن گئی تھی زمیں تن کے نور سے

تھا جو ستوں کہ رکنِ رسالت کا تکیہ گاہ
کرسی بھی اُسکی پشت کی تھی ڈھونڈتی پناہ
تھا جس حصیر پہ وہ دو عالم کا بادشاہ
حسرت سے عرش کرتا تھا اُس فرش پر نگاہ

اوجِ زمیں بہشتِ بریں سے دوچند تھا
منبر کا نُہ فلک سے بھی پایہ بلند تھا

اصحابِ خاص گرد تھے انجم کی طرح سب
تاباں تھا بیچ میں وہ مہِ ہاشمی لقب
سر پہ ملک صفات مگس راں تھے وہ عرب
جبریل تہ کئے ہوئے تھے زانوئے ادب

خادم بلال و قنبرِ گردوں اساس تھا
نعلین اُس کے پاس، عصا اُس کے پاس تھا

گیسو تھے وہ معنبر "واللیل اذا سجیٰ"
رخ سے عیاں تھے معنیٔ والشمس والضحیٰ
وہ ریشِ پاک اور رخِ سردارِ انبیا
گویا دھرا تھا رحل پہ قرآں کھلا ہوا

اوڑھے سیہ عبا جو وہ عالم پناہ تھا
کعبے کا صاف حاجیوں کو اشتباہ تھا

پہلو میں بادشاہ کے تھا جلوہ گر وزیر
سردارِ دیں علیؑ ولیِ خلق کا امیر
دونوں جہاں میں کوئی نہ دونوں کا تھا نظیر
احمدؐ تھے آفتاب تو حیدرؑ مہِ منیر

ظاہر میں ایک نور کا دوجا ظہور تھا
گر غور کیجیے تو یہی ایک نور تھا

مصروفِ وعظ و پند تھے سلطانِ مشرقین
جو گھر سے نکلے کھیلتے زہرا کے نورِ عین
نانا بغیر دونوں نواسوں کو تھا نہ چین
بڑھ جاتے تھے حسنؑ کبھی آگے کبھی حسینؑ

کہتے تھے دیکھیں کون قدم جلد اُٹھاتا ہے
نانا کے پاس پہلے بھلا کون جاتا ہے

وہ گورے گورے چہروں پہ زلفیں اِدھر اُدھر — کُرتے گلوں میں نور بدن جن سے جلوہ گر
اختر سے وہ چمکتے ہوئے کان کے گہُر — رشکِ ہلال طوق، گلے غیرتِ قمر
ہیکل پہ نقش نامِ خدائے جلیل کے
تعویذ گردنوں میں پرِ جبرئیل کے

مسجد میں آئے ہنستے ہوئے جب وہ گلبدن — خوشبو سے صحنِ مسجدِ جامع بنا چمن
تسلیم کو حسینؑ سے پہلے جھکے حسنؑ — خوش ہو کے مسکرانے لگے سرورِ زمن
بڑھ بڑھ کے خم سلام کو چھوٹے بڑے ہوئے
بیٹھے رہے رسولِ فلک اُٹھ کھڑے ہوئے

بیٹوں کو تھا علی کا اشارہ کہ بیٹھ جاؤ — لازم نہیں کہ وعظ میں نانا کو تم ستاؤ
پھیلا کے ہاتھ بولے محمدؐ کہ آؤ آؤ — شبیر نے کہا ہمیں پہلے گلے لگاؤ
بھائی حسنؑ جو آپ کی گودی میں آئیں گے
ہم تم سے نانا جان ابھی رُوٹھ جائیں گے

بولے حسنؑ کہ واہ ہمیں اور کریں نہ پیار — اقرار کر چکے ہیں شہنشاہِ نامدار
بولے بچشمِ نم یہ حسینؑ فلک وقار — دیکھیں تو کون ہوتا ہے کاندھے پہ اب سوار
سب سے سوا جو ہیں سو ہمیں ان کے پیارے ہیں
آگے نہ بڑھئے آپ کہ نانا ہمارے ہیں

بھائی سے تب کہا یہ حسنؑ نے بالتفات — بے وجہ ہم سے روٹھے ہو تم اے نکو صفات
نانا ہمارے کیا نہیں سلطانِ کائنات — ہوتی ہے ناگوار تمہیں تو ذرا سی بات

غصہ نہ اتنا چاہیے خوشخو کے واسطے
مچلے تھے یوں ہی بچۂ آہو کے واسطے

یہ سن کے منہ علیؑ کا لگے دیکھنے رسولؐ — ہنس کر کہا یہ دونوں ہیں میرے چمن کے پھول
میں چاہتا ہوں ایک کی خاطر نہ ہو ملول — روئیں گے یہ تو گھر سے نکل آئیں گی بتولؑ
ہوئے نہ رنج میرے کسی نورِ عین کو
تم لو حسنؑ کو گود میں مَیں لوں حسینؑ کو

شبیرؑ سے پھر اشارہ کیا ہو کے بے قرار — غصہ نہ کھاؤ پہلے تمہیں کو کریں گے پیار
پھر بولے دیکھ کر سوئے شبیرِ نامدارؑ — آ اے حسینؑ آ تری باتوں کے میں نثار
چھاتی سے ہم لگائیں گے جان اپنی جان کر
دیکھیں تو پہلے کون لپٹتا ہے آن کر

دوڑے یہ بات سن کے برابر وہ خوش سیر — پاس آئے آفتابِ رسالت کے دو قمر
لپٹے حسینؑ ہنس کے اُدھر اور حسنؑ اِدھر — تھے پاؤں زانوؤں پہ تو بالائے دوش سر
نانا کے ساتھ پیار میں دونوں کا ساتھ تھا
گردن میں ایک اُن کا اور اک اِن کا ہاتھ تھا

پھر پھر کے دیکھتے تھے شہنشاہِ مشرقین — گہ جانبِ حسنؑ تو کبھی جانبِ حسینؑ
بیٹھے جو زانووں پہ وہ زہراؑ کے نورِ عین — تھا تن کو لطف، قلب کو راحت، جگر کو چین
جھک جھک کے منہ رسولِ زمن چومنے لگے
اِن کا گلا تو اُن کا دہن چومنے لگے

شبیرؑ چاہتے تھے کہ چومیں مرے بھی لب — پر کچھ گلے کے بوسوں کا کھلتا نہ تھا سبب
نانا کے منہ کے پاس یہ لاتے تھے منہ کو جب — جھک جھک کے چومتے تھے گلا سیدِ عرب

بھائی کو دیکھ کر جو حسنؑ مسکراتے تھے
غیرت سے اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے

اُٹھے حسینؑ زانوئے احمدؐ سے خشمگیں — غصے سے رنگ زرد اور آنکھوں پہ آستیں
رُخ پر پسینہ، جسم میں رعشہ، جبیں پہ چیں — پوچھا کدھر چلے تو یہ بولے کہیں نہیں
گھر میں اکیلے تیوری چڑھائے چلے گئے
دیکھا نہ پھر کے سر کو جھکائے چلے گئے

بیت الشرف میں آئے جو شبیرؑ نامدار — کُرتے کو منہ پہ رکھ کے لگے رونے زار زار
دوڑیں یہ کہہ کے فاطمہؑ زہرا جگر فگار — ہے ہے حسینؑ کیا ہوا تو کیوں ہے اشکبار
تجھ کو رُلا کے غم میں مجھے مُبتلا کیا
قربان ہو گئی تجھے کس نے خفا کیا

میرا کلیجہ پھٹتا ہے اے دلربا نہ رو — زہراؑ ہزار جان سے تجھ پر فدا نہ رو
سر میں نہ درد ہو کہیں اے مہ لقا نہ رو — بس بس نہ رو حسینؑ برائے خدا نہ رو
میری طرف تو دیکھو کہ بے تاب ہوتی ہوں
چادر سے منہ کو ڈھانپ کے لو میں بھی روتی ہوں

تو منہ تو کھول اے مرے شبیرِ خوش خصال — تر ہو گئے ہیں آنسوؤں سے گورے گورے گال
مَل مَل کے پشتِ دست سے آنکھیں کرو نہ لال — سلجھاؤں آؤ اُلجھے ہوئے گیسوؤں کے بال
گھر سے گئے تھے ساتھ جدا ہو کے آئے ہو
سمجھی میں کچھ حسنؑ سے خفا ہو کے آئے ہو

تم چپ رہو وہ گھر میں تو مسجد سے پھر کے آئیں — گزری میں کھیل سے مرے بچے کو کیوں رُلائیں
اُن سے نہ بولیو وہ تمہیں لاکھ گر منائیں — لو آؤ جانے دو تمہیں چھاتی سے ہم لگائیں

واری اگر حسنؑ نے رُلایا بُرا کیا
پوچھونگی کیا نہ میں مرے پیارے نے کیا کیا

بولے حسینؑ ہم تو ہیں اس بات پر خفا
ناناؐ نے چومے بھائی کے ہونٹ اور مرا گلا
تم اماں جان مُنہ کو تو سونگھو مرے ذرا
کچھ بوئے ناگوار ہے میرے دہن میں کیا
بھائی کے لب سے اپنے لبوں کو ملاتے ہیں
اب ہم نہ جائیں گے ہمیں نانا رُلاتے ہیں

منہ رکھ کے منہ پہ بولی یہ زہراؑ جگر فگار
بوئے گلاب آتی ہے اے میرے گلعذار
چوما اگر گلا تو خفا ہو نہ میں نثار
تم کو زباں چوستے تھے محبوبِ کردگار
یہ مُشک میں مہک نہ گُل یاسمن میں ہے
خوشبو اُسی دہن کی تمہارے دہن میں ہے

کہنے لگے حسینؑ یہ ماں سے بچشمِ نم
کیا جانو تم حسنؑ سے ہمیں چاہتے ہیں کم
یہ کیا اُنھیں پہ لطف و عنایت ہے دم بدم
معلوم ہو گیا اُنھیں پیارے نہیں ہیں ہم
رو رو کے جان آج ہم اپنی گنوائیں گے
پانی نہ اب پئیں گے نہ کھانا ہی کھائیں گے

یہ بات سُن کے ہو گیا زہراؑ کا رنگ فق
بولی پسر سے رو کے وہ بنتِ رسولِ حق
صدقے گئی کرو نہ کلیجے کو میرے شق
ہے ہے یہ کیا کہا مجھے ہوتا ہے اب قلق
میرا لہو بہے گا جو آنسو بہاؤ گے
کاہے کو ماں جیے گی جو کھانا نہ کھاؤ گے

یہ کہہ کے اوڑھ لی سرِ پُرنور پہ ردا
موزے پہن کے گود میں شبیرؑ کو لیا
در تک گئی جو گھر سے وہ دلبندِ مصطفیٰ
فضّہ نے بڑھ کے بُوذر و سلماں کو دی صدا

بیٹھیں نبیؐ حسینؑ کو گودی میں لاتی ہیں
ہٹ جاؤ سب کہ فاطمہؑ مسجد میں آتی ہیں

اللہ ری آمد آمدِ زہراؑ کا بندوبست — ساتوں فلک تھے اوجِ شرافت سے جس کے پست
احمدؐ کے گرد و پیش سے اُٹھے خدا پرست — انساں تو کیا ملک کو نہ تھی قدرتِ نشست
آئیں تو شاد شاد رسولِ زمن ہوئے
گھر میں خدا کی ایک جگہ پنجتن ہوئے

تعظیمِ فاطمہؑ کو اُٹھے سیّد البشر — دیکھا کہ چشمِ فاطمہؑ ہے آنسوؤں سے تر
خم تھے حسینؑ دوش پہ ماں کے جھکائے سر — تھا اک ہلال مہر کے پہلو میں جلوہ گر
ماں کہتی تھی نہ روؤ مگر چپ نہ ہوتے تھے
آنکھیں تھیں بند ہچکیاں لے لے کے روتے تھے

گھبرا کے پوچھنے لگے محبوبِ ذوالجلال — روتا ہے کیوں حسینؑ، یہ کیا ہے تمہارا حال
بولیں بتولؑ آج قلق ہے مجھے کمال — رویا ہے یہ حسینؑ کہ آنکھیں ہیں دونوں لال
آتے ہیں ہنستے روتے ہوئے گھر میں جاتے ہیں
شفقت بھی آپ ہی کرتے ہیں آپ ہی رُلاتے ہیں

ہاتھوں کو جوڑتی ہوں میں یا شاہِ بحر و بر — شفقت کی اس کے حال پہ ہر دم رہے نظر
رونے سے اس کے ہوتا ہے ٹکڑے مرا جگر — مجھ فاقہ کش غریب کا پیارا ہے یہ پسر
حیدرؑ سے پوچھیئے مری عسرت کے حال کو
کس کس دُکھوں سے پالا ہے اس نونہال کو

اشک اس کے جتنے ٹپکے ہیں یا شاہِ نیک خو — اتنا ہی گھٹ گیا ہے مرے جسم کا لہو
روئے ہیں پھوٹ پھوٹ کے یہ میرے روبرو — تر ہو گیا ہے آنسوؤں سے چاند سا گلو

دیکھا نہ تھا یہیں نے جو حال اس کا آج ہے
حضرت تو جانتے ہیں کہ نازک مزاج ہے

شفقت سے آج آپ نے چومے حسنؑ کے لب　　بوسہ لیا نہ اِن کے لبوں کا یہ کیا سبب
رتبے میں دونوں ایک ہیں یا سرورِ عرب　　میں سچ کہوں یہ سُن کے مجھے بھی ہوا عجب
اِس کو جو ہو خوشی تو دل اُس کا بھی شاد ہو
چھوٹے سے چاہیے کہ محبت زیادہ ہو

آپ ان کے ناز اُٹھاتے ہیں یا شاہِ بحر و بر　　پھر کس سے روٹھیں آپ سے روٹھیں نہ یہ اگر
اکثر انھیں چڑھایا ہے حضرت نے دوش پر　　گیسو دیئے ہیں ننھے سے ہاتھوں میں بیشتر
روٹھے تھے یہ سو قدموں پہ سر دھرنے آئے ہیں
منہ کے نہ چومنے کا گلہ کرنے آئے ہیں

یہ کہہ کے پھر حسینؑ سے بولیں بچشمِ تر　　لو جا کے اب نبیؐ کے قدم پر جھکا دو سر
آئے حسینؑ ہاتھ جو ننھے سے جوڑ کر　　بے اختیار رونے لگے سیّد البشر
رہ رہ کے دیکھتے تھے علیؑ و بتولؑ کو
نزدیک تھا قلق سے غش آئے رسولؐ کو

تھی آنسوؤں سے ریشِ مبارک تمام نم　　فرطِ بکا سے خاک پہ جھکتے تھے دمبدم
گاہے ستوں سے لگ کے ہوئے راست گاہ خم　　ہر لحظہ اضطراب زیادہ تھا صبر کم
ہو سکتا تھا نہ ضبط شہِ مشرقین سے
روتے تھے بار بار لپٹ کر حسینؑ سے

شبیرؑ رو کے کہتے تھے نانا نہ روئیے　　روٹھیں گے اب نہ ہم شہِ والا نہ روئیے
ہلنے لگے گا عرشِ معلّیٰ نہ روئیے　　پھٹتا ہے اب ہمارا کلیجہ نہ روئیے

سو بار دن میں ہم تو منہ اشکوں سے دھوتے ہیں
حضرت ہمارے رونے پہ کاہے کو روتے ہیں

گھبرا گئے علیؑ ولی شاہِ بحر و بر ۔۔۔ کی عرض فاطمہ نے جھکا کے قدم پہ سر
بیٹی نثار ہو گئی یا سید البشر ۔۔۔ کیا وجہ ہے جو آپ ہیں اس طرح نوحہ گر
جلدی بتائیے کہ مجھے تاب اب نہیں
رونا خدا کے دوست کا یہ بے سبب نہیں

حضرت کو علمِ غیب ہے یا شاہِ انس و جاں ۔۔۔ آئندہ و گذشتہ کا سب حال ہے عیاں
کیا آئی آج وحیٔ خداوندِ دو جہاں ۔۔۔ ہونا ہے جو حسینؑ پہ مجھ سے کرو بیاں
فاقوں میں کاٹتی ہوں مصیبت جہان کی
کیوں بابا جان خیر تو ہے اس کی جان کی

بولے جگر کو تھام کے محبوبِ ذوالجلال ۔۔۔ تجھ سے سُنا نہ جائے گا اے فاطمہؑ یہ حال
کس منہ سے میں کہوں کہ قلق ہے مجھے کمال ۔۔۔ زہرا شہید ہوئیں گے تیرے یہ دونوں لال
ماتم کی یہ خبر ابھی جبریل لائے تھے
سارے ملک حسینؑ کے پُرسے کو آئے تھے

الماس پی کے ہوئے گا بے جاں ترا حسنؑ ۔۔۔ یہ وجہ ہے کہ چومتا ہوں اُس کا میں دہن
بھر جائے گا کلیجہ کے ٹکڑوں سے سب لگن ۔۔۔ ہو گا زمردی ترے اس لال کا بدن
سوئے بہشت جب یہ جہاں سے سدھاریں گے
بدکیش تیر ان کے جنازے پہ ماریں گے

زہرا مجھے کلام کی طاقت نہیں ہے اب ۔۔۔ حلقِ حسینؑ چومنے کا کیا کہوں سبب
اک بن میں تین روز رہیں گے یہ تشنہ لب ۔۔۔ کٹ جائے گا گلا یہی خنجر سے ہے غضب

نیزے پہ سر چڑھے گا ترے نورِ عین کا
گھوڑوں سے روند ڈالیں گے لاشہ حسینؑ کا

روئے خبر یہ کہہ کے جو محبوبِ ذوالمنن　　گھبرا کے منہ حسینؑ کا تکنے لگے حسنؑ
زہراؑ پکاری ہائے لٹے گا مرا چمن　　میں مر گئی دہائی ہے یا سرورِ زمن
یہ کیسی آگ ہے کہ مری کوکھ جل گئی
ہے ہے چھری کلیجے پہ زہراؑ کے چل گئی

فریاد یا نبیؐ شہِ ابرار الغیاث　　اے مرسلانِ حق کے مددگار الغیاث
اے بیکسوں کے وارث و سردار الغیاث　　اے جزو کل کے مالک و مختار الغیاث
قدرت ہے سب طرح کی شہِ مشرقین کو
حضرت سے لوں گی اپنے حسنؑ اور حسینؑ کو

کس جرم پہ یہ لال مرے قتل ہوں گے آہ　　رو کر کہا رسولِ خدا نے کہ بے گناہ
کی عرض فاطمہؑ نے کہ اے عرش بارگاہ　　بچوں کو میرے کیا نہ ملے گی کہیں پناہ
تلواریں کھینچ کھینچ کے ظالم جو آئیں گے
حضرت نہ کیا نواسوں کو اپنے بچائیں گے

آساں ہے کیا جو قتل کریں گے ستم شعار　　کیا شیرِ حق کمر سے نہ کھینچیں گے ذوالفقار
اعدا پہ کیا چلے گا نہ دستِ خدا کا وار　　بالوں کو کیا نہ کھولے گی زہراؑ جگر فگار
ٹکڑے جگر جو ہوئے گا مجھ دل دونیم کا
پایا نہ کیا ہلاؤں گی عرشِ عظیم کا

زہراؑ سے رو کے کہنے لگے شاہِ نیک خو　　بیٹی مجھے ستائیں گے تربت میں کینہ جو
اس وقت قتل ہوئیں گے یہ دونوں ماہ رو　　دنیا میں جب نہ ہوگا علیؑ اور نہ میں نہ تو

لاشے پہ مجتبیٰؑ کے تو شبیرؑ روئے گا
شبیرؑ جب مرے گا تو کوئی نہ ہوئے گا

چلائی سر پٹک کے یہ زہراؑ کہ ہے ستم　　　پیٹے گا کون، تن سے جو نکلے گا اس کا دم
ماتم کی صف بچھائے گا کون اے شہِ امم　　　پرسے کو کون آئے گا اس کے بچشم نم
ہم میں سے ایسے وقت جو کوئی نہ ہوئے گا
ہے ہے مرے حسینؑ کو پھر کون روئے گا

بچے کی میرے تعزیہ داری کرے گا کون　　　منہ ڈھانپ ڈھانپ گریہ و زاری کرے گا کون
دریائے اشک چشم سے جاری کرے گا کون　　　امداد بعدِ مرگ ہماری کرے گا کون
ہوگا کہاں نبیؐ کے نواسے کا فاتحہ
شربت پہ کون دیوے گا پیاسے کا فاتحہ

بولے نبیؐ کہ آپ کو زہراؑ نہ کر ہلاک　　　فرما چکا ہے مجھ سے یہ وعدہ خدائے پاک
پیدا کریں گے قوم اک ایسی بروئے خاک　　　جو رات دن رہیں گے اسی غم میں دردناک
بزمِ عزا میں آئیں گے وہ دُور دُور سے
تن خاک سے بنائیں گے دل اُن کے نور سے

ہوگی انھیں سے مجلسِ ماتم کی زیب و زین　　　دیں گے انھیں وہ لب کہ رہے جن پہ واحسینؑ
آنکھیں وہ دیں گے رونے کو جیں جو فرضِ عین　　　ہاتھ ایسے غیرِ سینہ زنی ہو جنہیں نہ چین
سامان تعزیت کے کبھی کم نہ ہوئیں گے
وہ حشر تک حسینؑ کے ماتم میں روئیں گے

ہوگا عیاں فلک پہ محرمؑ کا جب ہلال　　　رختِ سیاہ پہنیں گے بر میں وہ خوش خصال
کھولیں گی بیبیاں بھی سب اپنے سروں کے بال　　　ہر گھر میں ہوگا شور کہ ہے ہے علیؑ کا لال

لیں گے صلے میں خلد ترے نورِ عین سے
آنسو عزیزو وہ نہ کریں گے حسینؑ سے

پیاسا شہید ہوگا جو تیرا یہ دلربا — مومن سبیلیں رکھیں گے پانی کی جا بجا
ہووے گی شاد روحِ شہیدانِ کربلا — بھر بھر کے آب سرد پکاریں گے بر ملا
محبوبِ کبریا کے نواسے کی نذر ہے
پیاسے نہ جائیو کہ یہ پیاسے کی نذر ہے

کہنے لگی نبیؐ سے بتولؑ فلک جناب — ہے ہے میں کیا کروں مرے دل کو نہیں ہے تاب
اے بادشاہِ کون و مکاں مالک الرقاب — درگاہِ حق میں آپ کی ہے عرض مستجاب
کیجے دعا کہ خالقِ اکبر مدد کرے
اللہ یہ بلا مرے بچے کی رد کرے

بیٹی سے رو کے کہنے لگے شاہِ کائنات — روح الامین نے مجھ سے تو یہ بھی کہی ہے بات
چاہو تو رد کرے یہ بلا ربِ پاک ذات — لیکن نہ ہووے گی مری امت کی پھر نجات
محبوبِ حق نثار ترے نورِ عین پر
موقوف ہے یہ امر تو قتلِ حسینؑ پر

اللہ رے صبر و رحمتِ محبوبِ کردگار — امت کا نام سن کے جھکا یا سر ایک بار
خوشنود ہو کے کہنے لگے شاہِ ذوالفقارؑ — صدقے حسنؑ، حسینؑ تصدق، علیؑ نثار
اس راہ میں نہ مال نہ دولت عزیز ہے
پیارے پسر نہیں ہمیں امت عزیز ہے

حسینؑ کا وعدۂ ایثار

کہنے لگے حسینؑ سے پھر شاہِ بحر و بر
بتلا مجھے کہ کیا تری مرضی ہے اے پسر
نانا سے بولے چھوٹے سے ہاتھوں کو جوڑ کر
اُمّت کے کام آئے تو حاضر ابھی ہے سر
وعدہ کو ہم نہ بھولیں گے گو خرد سال ہیں
جھوٹے نہیں ہیں مخبرِ صادق کے لال ہیں

روتے ہیں آپ کس لئے یا سیدِ اُمم
راضی ہیں ہم پہ راہِ خدا میں ہوں جو ستم
تلواریں بھی چلیں تو نہیں مارنے کے دم
اُمّت پہ اپنے سر کو تصدق کریں گے ہم
ہم راست گو ہیں بات پہ جس وقت آتے ہیں
کہتے ہیں جو زباں سے وہی کر دکھاتے ہیں (دشتِ وغا میں ....)

بچپن میں جو زباں سے کہا تھا کیا وہ کام
.. ..
.. ..
.. ..
.. ..

بعدِ رسولِ مقبولؐ

سر پر سے اٹھ گیا جو محمدؐ سا سرپرست
جاتا رہا تمام بھرے گھر کا بندوبست
زور اپنا وہ دکھانے لگے تھے جو زیر دست
کچھ دن کے بعد اور زمانے نے دی شکست
تھی حمل سے کہ پہلوئے زہراؑ پہ در گرا
زندہ تڑپ تڑپ کے شکم سے پسر گرا (روئے سخن شناسے ....)

اس پر ظالموں نے نہ کھینچا ستم سے ہات — گذری مہِ صیام کی اُنیسویں جو رات
مسجد میں مرتضیٰؑ گئے گھر سے پئے صلوٰت — قتلِ علیؑ کی گھات میں تھا اک بد صفات
پایا جو محوِ بندگیٔ بے نیاز میں
تلوار روزہ دار کو ماری نماز میں (عرشِ خدا مقام ....)

مسجد میں قتل جب شہِ خیبر شکن ہوئے — زینت دہِ سریرِ امامت حسنؑ ہوئے
سبطِ رسولؐ جب کہ امامِ زمن ہوئے — ممنونِ فیضِ عام سے سب مرد و زن ہوئے
چرچا تھا خوبیوں کا فلک سے زمیں تلک
خُلقِ حسنؑ کا شور تھا عرشِ بریں تلک

ہمت کو نامِ پاک کی نسبت سے تھا شرف — لعل و گہر سے بھر دیئے تھے سائلوں کے کف
پھرتے تھے کوچہ ہائے مدینہ میں جس طرف — ہو جاتے تھے فقیر غنی دم میں صف بہ صف
انبارِ نان دوش پہ اپنے اُٹھاتے تھے
بھوکوں کو جا کے راتوں کو کھانا کھلاتے تھے

شہادتِ امامِ حسنؑ

اخبارِ صادقین سے ہوتا ہے یہ عیاں — اسماء تھی ایک زوجۂ شہزادۂ زماں
اُس کی طرف سے رہتے تھے مولا جو بدگماں — کہتے تھے لوگ اُس کا پتا دیجئے نشاں
فرماتے تھے گریز نہیں ہے ممات سے
قطعِ حیات ہے شدنی اُس کے ہات سے

آخر ہوا وہ، کہتے تھے جو شاہِ تاجدار — شہد و رطب میں زہر دیا اُس نے تین بار
دردِ شکم سے رہتے تھے نالان و بے قرار — سو سو طرح کے رنج تھے اور ایک جانِ زار

کیا بے کسی تھی راحتِ جانِ بتولؑ پر
جا جا کے لوٹتے تھے مزارِ رسولؐ پر

معروف تھے خدا کی عبادت میں صبح و شام — گھر سے کہیں نہ جاتا تھا شہزادۂ امام
یثرب میں اک مکاں تھا بنا کردۂ امام — منظور ہو گیا شبِ رحلت وہیں مقام
رشکِ بہشت و غیرتِ باغِ جناں ہوا
اُس شب کو وہ مکان تو بس لامکاں ہوا

بستر پہ جلوہ گر جو ہوا وہ فلک جناب — تا نصف شب نہ چشم ہوئی آشنائے خواب
زیرِ زمیں تھا خاک بسر قرصِ آفتاب — داغِ جگر دکھاتا تھا جھک جھک کے ماہتاب
تارے زمیں پہ ٹوٹ کے بہیم گرا کئے
چشمِ فلک سے قطرۂ شبنم گرا کئے

پڑھ کر نمازِ شب کو جو سوئے شہِ امم — اسمار نے پھر ملا دیا پانی میں آ کے سم
زینب کو چونک کر یہ پکارے بصد الم — بھینا ابھی گلے سے نبیؐ کے لگے تھے ہم
رقت یہ تھی کہ اشکوں سے تر شانے پاک تھا
محبوبِ کبریا کا گریبان چاک تھا

نانا گلے لگا کے یہ کہتے تھے بار بار — اے بیکس و غریب حسنؑ میں ترے نثار
پھرتے تھے میرے گرد علیؑ کو نہ تھا قرار — امّاں بلائیں لے کے کرتی تھیں مجھ کو پیار
پوچھا جو میں نے آپ کا کیوں رنگ زرد ہے
رو کر کہا کہ آج کلیجے میں درد ہے

فرما کے یہ حسنؑ نے اُٹھایا زمیں سے جام — پایا درست اُس کو جو تھا مہر کا مقام
تھوڑا سا پانی پی کے پکارا وہ تلخ کام — دوڑو بہن کہ کام ہمارا ہوا تمام

یہ کہتے کہتے زرد رُخِ پاک ہو گیا
چلّاتے تھے کہ ہائے جگر چاک ہو گیا

دوڑیں جنابِ زینبؑ بیکس، برہنہ پا — دیکھا تو لوٹتے ہیں بچھونے پہ مجتبیٰؑ
بولی یہ سر کو پیٹ کے وہ غم کی مبتلا — ہے ہے بہن نثار ہو بھیا یہ کیا ہوا
کیا پھر کسی نے زہرِ دغا سے پلا دیا
کس نے مرے کلیجے پہ خنجر پھرا دیا

بولے امام آہ نہیں طاقتِ سخن — جس کی کوئی دوا نہیں وہ درد ہے بہن
لپٹی گلے سے بھائی کے رو کر وہ خستہ تن — یہ بے قرار تھے کہ سنبھلتے نہ تھے حسنؑ
در آیا تھا جو زہر جگر میں امام کے
جھکتے تھے بار بار کلیجہ کو تھام کے

فرماتے تھے حسنؑ کہ بلاؤ حسینؑ کو — تھا دم بدم یہ حکم کہ لاؤ حسینؑ کو
بھائی کا حالِ زار سناؤ حسینؑ کو — ٹکڑے مرے جگر کے دکھاؤ حسینؑ کو
کہہ دو کہ جلد آئیے رحلت کا وقت ہے
سُن جائیے کچھ آ کے وصیت کا وقت ہے

فضّہ نے جا کے دی شہِ ذی جاہ کو خبر — دارِ فنا سے آپ کے بھائی کا ہے سفر
دوڑے حسینؑ چاک گریباں برہنہ سر — دیکھا تڑپ رہے ہیں شہنشاہِ بحر و بر
گرنے لگے زمیں پہ جگر غم سے پھٹ گیا
پھیلا کے ہاتھ بھائی سے بھائی لپٹ گیا

دکھلا کے طشت بنتِ علیؑ نے کیا مقال — قربان جاؤں دیکھو تو یہ مجتبیٰ کا حال
اُمید اب نہیں کہ بچے فاطمہ کا لال — فریاد ہے تباہ ہوئی مصطفےٰ کی آل

اِک آن درد سے نہیں بھائی سنبھلتے ہیں
رہ رہ کے اب کلیجے کے ٹکڑے نکلتے ہیں

بھائی کا حال دیکھ کے اُٹھا جگر میں درد | لوٹے زمیں پہ گر کے بھری گیسوؤں میں گرد
تر تھا بدن پسینے میں اور ہاتھ پاؤں سرد | اُن کا تو رنگ سبز تھا اور ان کا رنگ زرد
رعشہ تھا تن میں آنکھوں سے آنسو نکلتے تھے
جھک جھک کے منہ کو بھائی کے قدموں سے ملتے تھے

ہر دم لپٹ کے بھائی سے با چشم اشکبار | چلاتے تھے کہ آپ کی غربت کے میں نثار
شبیرؑ گلے کو چوم کے کہتے تھے بار بار | میں تجھ پہ صدقے اے مرے نانا کی یادگار
مجھ سے زیادہ ظلم و ستم تم پہ ہوئیں گے
ہم قبر میں تمہاری مصیبت کو روئیں گے

بھیا تمہاری گود میں نکلے گا میرا دم | تم دو گے ہم کو غسل و کفن جیا رہیں گے ہم
ہو گا تمہارے پاس نہ کوئی بجز الم | قاتل سرہانے ہوئے گا یا خنجر ستم
شبیرؑ تو بعد مرگ کے راحت سے سوئیگا
لاشہ تمہارا گھوڑوں سے پامال ہوئیگا

عباس کو بلا کے کہا اے وفا شعار | بچپن سے تم کو کرتا ہے شبیرؑ دل سے پیار
اور تم بھی ان کے نام پہ سو جاں سے ہو نثار | حاجت تو کچھ نہیں ہے سفارش کی زینہار
تم شاہ بیکساں کی رفاقت نہ چھوڑیو
بھائی کا اپنے دامن دولت نہ چھوڑیو

قاسم کو پیار کر کے کیا اس طرح کلام | اس گھر کے تم چراغ ہو روشن ہے تم سے نام
ہیں بر سر سفر شہ مظلوم صبح و شام | کیجو وہ کام جس میں رضامند ہو امام

پیارے شہیدِ تیغ جفا ہو کے آئیو
فردوس میں چچا پہ فدا ہو کے آئیو
مجمل یہ تھا جو میں نے کہا آج میری جاں
پہونچو گے کربلا میں تو ہو جائے گا عیاں
لکھ کر کچھ اپنے ہاتھ سے باچشمِ خوں فشاں
بازو پہ اُس کے باندھ کے پھر یہ کیا بیاں
اس کو سوائے وقتِ مصیبت نہ کھولیو
یہ حرزِ جاں ہے غیرِ ضرورت نہ کھولیو
تھا ایک شاہزادوں میں فرزندِ خرد سال
حاضر حضورِ شاہ میں تھا وہ بھی نونہال
ہاتھوں کو اُس کے چوم کے کرتے تھے یوں مقال
اے آخری شہید خوشا تجھ پسر کا حال
نازک کلائیاں یہ تری دل سے بھائی ہیں
حوریں ابھی سے گود میں لینے کو آئی ہیں
یہ کہتے کہتے غش ہوئے شاہِ فلک جناب
غمگین تو تھے حسینؑ ہوا اور اضطراب
حاضر تھی روحِ احمدؐ و زہراؑ و بوترابؑ
وا تھے برنگِ دیدۂ نرگس جناں کے باب
تشریف خلد کو شہِ ذی جاہ لے گئے
جدّ و پدر جو آئے تھے ہمراہ لے گئے
ماتم کی اہلبیتِ رسالت میں تھی صدا
برپا تھا شورِ واحسنا وا محمدا
سادات کے محلے میں اک حشر تھا بپا
بامِ فلک سے آتی تھی ہاتف کی یہ ندا
آلِ نبیؐ سے سبطِ محمدؐ جدا ہوئے
زہراؑ کے آج لعل و زمرد جدا ہوئے
غسل و کفن امام کو جب دے چکے امام
اور جمع ہو چکے درِ دولت پہ خاص و عام
جس دم اٹھا جنازۂ شہزادۂ انام
کرتے تھے انبیائے سلف واں پہ اہتمام

تھے شیثؑ و نوحؑ چاک گریباں کئے ہوئے
الیاسؑ و خضرؑ جاتے تھے کاندھا دئے ہوئے

عباسؑ و عونؑ ، زیدؑ و محمدؑ تھے نوحہ گر / قاسم کو تھامے جاتے تھے سلطانِ بحر و بر
اور تھیں پسِ جنازۂ آقائے خوش سیر / ازواج و خادماتِ محل سب برہنہ سر
عریاں سروں پہ مریمؑ و حوّا کے ہاتھ تھے
جبریلؑ پا برہنہ جنازے کے ساتھ تھے

جس دم جنازہ پسرِ شاہِ لافتا / پہونچا قریبِ مرقدِ پیغمبرِ خدا
یہ دشمنوں پہ مطلبِ شبیرؑ کھل گیا / یعنی قریبِ مرقدِ سلطانِ انبیا
زیبِ کنارِ شاہِ رسلؐ یہ مزار ہو
منظور ہے کہ حق کو یہ مرکز قرار ہو

از بسکہ نسلِ فاطمہؑ سے تھا انھیں عناد / بس مستعد وہ ہو گئے سب برسرِ فساد
محبوبِ حق کے روضہ پہ آئے وہ بدنہاد / بولے کہ پوری ہونے نہ دیویں گے یہ مراد
یہ گھر ہماری ملک کا ہے اور مال کا
حصّہ نہیں ہے اس میں محمدؐ کی آل کا

برہم ہوئے یہ سن کے امامِ فلک جناب / تھرآیا جسم غیظ سے آنکھیں ہوئیں پُرآب
فرمایا دو گے حشر میں کیا حق کو تم جواب / ہے کچھ بھی پاسِ احمدؐ و زہراؑ و بوترابؑ
اوروں کی قبر ہائے نبیؐ کے قریب ہو
پہلوئے رسولؐ کا نہ حسنؑ کو نصیب ہو

عباسؑ نامدار کو بھی آگیا جلال / اور بھائی بند ہو گئے آمادۂ جدال
قبضہ پہ ہاتھ رکھے تھے شیرِ خدا کے لال / کہتے تھے ہم سے لڑ سکیں کیا انکی ہے مجال

ان باغیوں کے زور کو دم بھر میں توڑینگے
ہمسایۂ رسولؐ خدا ہم نہ چھوڑیں گے

اک اک کو روکتے تھے امامِ فلک سریر — آنے لگے جنازہ پہ جو اُس طرف سے تیر
کانپی زمین ہل گیا صدمے سے چرخِ پیر — نکلی لحد سے فاطمہؑ جیبِ کفن کو چیر
تابوت پر نواسے کے بدعت جو ہوتی تھی
روحِ رسولؐ پاک جنازے کو روتی تھی

تابوت پر جو آنے لگے تیر ناگہاں — آمادۂ نبرد ہوئے شاہِ اِنس و جاں
آئی ندائے غیب کہ اے شاہِ بیکساں — سر پیٹتی ہے فاطمہ زہرا بصد فغاں
جنبش سے اس اَلَم میں محمدؐ کی قبر ہے
اے شیرِ حق کے لعل یہ ہنگامِ صبر ہے

واں دی کسی نے زینبِ بیکس کو یہ خبر — چلتے ہیں تیرِ ظلم حسنؑ کے جنازے پر
تیغیں کھنچی ہیں غصے میں ہیں شاہِ بحر و بر — اُٹھ کر لگی وہ پیٹنے ہاتھوں سے اپنا سر
چلائی گھر سے مضطربُ الحال جاتی ہوں
قبرِ نبیؐ پہ کھولے ہوئے بال جاتی ہوں

زہراؑ کے گھر میں شورِ قیامت بپا ہوا — ڈیوڑھی پہ آئی دخترِ حیدرؑ برہنہ پا
بکھرے ہوئے تھے بال گریبان تھا پھٹا — ایک ایک سے یہ کہتی تھی آنسو بہا بہا
غصہ ہے آج فاطمہؑ کے نورِ عین کو
للہ کوئی جا کے سنبھالو حسینؑ کو

جا کر کہے یہ کوئی کہ اے شاہِ نامدار — صدقہ نبیؐ کی روح کا کیجو نہ کارزار
بابا کا صبر یاد کرو تم پہ میں نثار — ہے ہے نہ مجتبیٰؑ کا بناؤ وہاں مزار

آرام دو حبیبِ خدا کے حبیب کو
لے جا کے ماں کے پہلو میں گاڑو غریب کو

رو کر بیاں یہ کرتی تھی یاں زینبؑ حزیں — واں لے گئے بقیع میں تابوتِ شاہِ دیں
مہرِ سپہرِ دیں ہوا پنہاں تہہ زمیں — رو یا لپٹ کے قبر سے زہراؑ کا نازنیں
محشر بپا تھا نالہ و فریاد و آہ سے
ہفتاد تیر نکلے تھے تابوتِ شاہ سے (مسجد میں قتل جب ....)

کوئی حسنؑ کے داغ کو پوچھے حسینؑ سے — دنیا میں ایک دن انھیں گزرا نہ چین سے
رہتا تھا حشر مادرِ قاسم کے بین سے — بہتے تھے اشک چشمِ شہِ مشرقین سے
غم میں شریکِ محفلِ شادی نہ ہوتے تھے
آتے تھے جب سلام کو قاسم تو روتے تھے

تنہائی، دشمنوں کی جفا، ظالموں کے جور — جو بانیٔ فساد تھے اُن حاکموں کا دَور
جینے کی کوئی شکل نہ راحت کا کوئی طور — کوئی بزرگ تھا نہ کوئی سرپرست اور
ماتم تھا اہلبیت میں پُرسا تھا بین تھے
دو بہنیں رونے والی تھیں اور اک حسینؑ تھے

جا کر حسنؑ کی قبر پہ کرتے تھے یہ بیاں — مجھ کو بھی اپنے پاس بلا لیجے بھائی جاں
اس شہر میں حسینؑ کو ملتی نہیں اماں — زنداں وطن ہے میرے لئے یا شہِ زماں
دشمن خوشی ہوئے مرے بازو کو توڑ کے
جاؤں کدھر میں قبر کو حضرت کی چھوڑ کے

برسوں حسنؑ کے غم میں نہ سیدھی ہوئی کمر — راتیں تڑپ تڑپ کے ہوئیں آپ کو بسر
تنہا جو ہو اُسی کو ہے اس داغ کی خبر — روتا ہے پیٹتا ہے تڑپتا ہے عمر بھر

یوں سب ہیں پر برادرِ غمخوار اور ہے
یہ اُلفتیں ہی اور ہیں یہ پیار اور ہے (یا رب جہاں ہیں....)

مسند نشینی کے بعد یزید کے عزائم

جس دم یزید شام میں مسند نشین ہوا
سب مُلک روسیاہ کے زیر نگیں ہوا
شبیرؑ سے زیادہ اُسے بُغض و کیں ہوا
ایذائے اہلبیت کا درپے لعیں ہوا
کہتا تھا سلطنت کا تب ماں درست ہے
سختی نہ اُن پہ ہو تو ریاست یہ سُست ہے

خط حاکم مدینہ کو لکھا بشدّ و مد
مضموں یہ تھا کہ تجھ پہ اطاعت مری سند
بیعت مری حسینؑ سے لے تو بجد و کد
میں فوج بھیجتا ہوں کرے گی تری مدد
بیعت کریں تو جلد اِدھر بھیج دیجیو
راضی نہ ہوں تو کاٹ کے سر بھیج دیجیو

پہونچا اُسے مدینہ میں جب نامۂ یزید
پڑھ کر وہ خط بہت متردّد ہوا ولید
دل میں کہا یہ ظلم تو ہے عقل سے بعید
میں فاطمہؑ کے لعل کو کیوں کر کروں شہید
دعوائے سلطنت بھی نہیں بے قصور ہے
ایسے کنارہ کش پہ ستم کیا ضرور ہے

حاکم مدینہ اور امام حسینؑ کی ملاقات

آخر کسی کو بھیج کے شہ کو کیا طلب
بھائی بھتیجے شاہ کے حاضر تھے سب کے سب
فرمایا اُس سے جا کہ میں آؤں گا وقتِ شب
معلوم ہے مجھے جو بُلانے کا ہے سبب

سب جانتے ہیں بیعتِ فاسق حرام ہے
اُس کی طلب نہیں یہ اجل کا پیام ہے

گھبرا گئے یہ سُن کے عزیز و رفیق و یار — قاسم نے رکھ لی سامنے شمشیرِ آبدار
اکبر نے بھی طلب کیا اسبابِ کارزار — آئے کمال غیظ میں عباسِ نامدار
کہہ کر یہ بات صورتِ شیر اُٹھ کھڑے ہوئے
حاکم کے گھر نہ جائیں گے ہم بے لڑے ہوئے

زینبؑ کے دونوں بیٹوں کو اُس دم رہی نہ تاب — جا کر حرم سرا میں کہا با صدا اضطراب
حاکم کے گھر میں جاتے ہیں شاہِ فلک جناب — اماں ہمارے نیچے لا دیجئے شتاب
بگڑے گی گر تو خون کے دریا بہائیں گے
کام آج بھی نہ آئے تو کس کام آئیں گے

سُن کر سخن یہ ہو گیا زینب کا رنگ زرد — آنسو بھر آئے آنکھوں میں اُٹھا جگر میں درد
بولی کلیجہ تھام کے اور بھر کے آہِ سرد — کیا والیٔ مدینہ ہے آمادۂ نبرد
ایسی علیؑ کے نعل سے تقصیر کیا ہوئی
کیا جُرم کیا گناہ ہوا کیا خطا ہوئی

زینبؑ یہ کہہ رہی تھیں کہ آئے امامِ دیں — منہ دیکھ شہ کا رونے لگی زینبؑ حزیں
فرمایا شہ نے روتی ہو کیوں خوف کچھ نہیں — حاکم کے گھر میں جائے گا حیدرؑ کا جانشیں
وہ اور ہے جگہ تمہیں جس کا خیال ہے
یاں مجھ پہ ہاتھ اُٹھائے کوئی کیا مجال ہے

سمجھا چکے بہن کو جو حضرت بچشمِ تر — باندھی شہِ نجف کے کمر بند سے کمر
ڈالا عبائے پاکِ محمدؐ کو دوش پہ — لے کر عصا نبیؐ کا چلے شاہِ بحر و بر

یوں ساتھ تھے عزیزِ شہِ کم سپاہ کے
جیسے ستارے چرخ پہ ہوں گرد ماہ کے

اُس دم کمال حضرتِ زینبؑ تھیں بیقرار — بیت الشرف سے جاتی تھیں ڈیوڑھی پہ بار بار
عباسؑ سے بُلا کے کہا اے وفا شعار — بھائی کو چھوڑیو نہ اکیلا میں نثار
حاکم سے ہم سخن جو شہِ خوش خصال ہوں
تم اک طرف ہو ایک طرف میرے لال ہوں

یہ بات کہہ کے رونے لگی وہ جگر کباب — چالیس شخص لے کے چلا ابنِ بوترابؑ
جو دیکھتا تھا شانِ امامِ فلک جناب — کہتا تھا وہ کہ رات کو نکلا ہے آفتاب
رستے میں شب کو حُسنِ نبیؐ کا ظہور تھا
افلاک تک زمیں کے ستاروں کا نور تھا

حاکم کے در پہ پہونچے تو کہنے لگے امام — تم سب رہو یہیں کہ نہیں واں تمہارا کام
پر جب کروں پکار کے حاکم سے میں کلام — دَرانہ آئیو کہ مدد کا ہے وہ مقام
گھبراتے اتنا کیوں ہو کہ میں بے قصور ہوں
نہ تم ہو مجھ سے دور نہ میں تم سے دُور ہوں

پاسِ ادب سے کہہ نہ سکے کچھ رفیق و یار — بولے یہ ہاتھ جوڑ کے عباسؑ نامدار
دل کو غلام کے نہیں آنے کا یاں قرار — سایہ کی طرح ساتھ رہے گا یہ جاں نثار
شاید نہ پہونچے یاں تلک آواز دُور کی
کفشیں لئے رہے گا یہ خادم حضور کی

سمجھا کے بھائی کو گئے حاکم کے پاس شاہ — اُس نے کہا معاویہ نے لی عدم کی راہ
پڑھئے خطِ یزید کو اے شاہِ دیں پناہ — پڑھ کر وہ خط امام نے کھینچی جگر سے آہ

فرمایا سر کٹے تو کٹے کچھ الم نہیں
دانستہ دیویں ہاتھ سے عزت وہ ہم نہیں

امامِ حسینؑ کے ترکِ وطن کی تیاریاں

یہ کہہ کے اٹھ کھڑے ہوئے شاہِ ذوالاحترام — قبرِ رسولؐ پر اُسی شب کو گئے امام
لپٹے ضریحِ پاک سے اور یہ کیے کلام — رخصت کرو حسینؑ کو یا سیدِ انام
تربت میں لے کے، جلد لگا لیجیے سینہ سے
اعدا نکالے دیتے ہیں مجھ کو مدینہ سے

حضرت کی قبر چھوٹتی ہے مجھ سے نانا جاں — میں چھپ رہوں جہاں نہیں ایسا کوئی مکاں
آرام سے گھروں میں ہیں سب زیرِ آسماں — فریاد ہے حسینؑ کو ملتی نہیں اماں
ناموس کو حضور کے کس جا بٹھاؤں میں
بچے ذرا ذرا سے کہاں لے کے جاؤں میں

یہ جو کہا امام نے آنسو بہا بہا — بس یک بیک مزارِ نبیؐ کانپنے لگا
آئی ضریحِ پاکِ محمدؐ سے یہ صدا — ماں باپ میرے تجھ پہ فدا اور میں فدا
تیرے الم سے خنجرِ کیں دل پہ چلتے ہیں
جاتا ہے تو تو قبر سے ہم بھی نکلتے ہیں

واں سے وداع ہو کے گئے ماں کی قبر پر — دیکھا کہ بیٹھی روتی ہیں زینبؑ برہنہ سر
کہتی ہیں اپنے لال کی تم کو نہیں خبر — بھائی مرا مدینہ سے ہے عازمِ سفر
ملتی نہیں پناہ شہِ دیں پناہ کو
سب چاہتے ہیں قتل کریں بے گناہ کو

اماں تمہاری بیٹیاں ہوتی ہیں بے وطن کیوں کر بچائے بھائی کو آفت سے یہ بہن
ہے ہے اُجاڑ ہوتا ہے پھولا پھلا چمن دو دن سے بے قرار ہیں شاہِ شہِ زمن
کچھ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں نہ شب کو سوتے ہیں
تربت پہ ناناجان کی جا جا کے روتے ہیں

زینبؑ کو روتا دیکھ کے روئے بہت امام رخصت کا ماں کی قبر کو جھک کر کیا سلام
شب بھر تو گھر میں روتے رہے شاہِ خاص و عام وقتِ سحر وطن سے چلے سیدِ انام
رستے پہ شہر کے تو سواری کا شور تھا
اہلِ وطن کے نالہ و زاری کا شور تھا

مانوس تھے جو فاطمہؑ کے نورِ عین سے ملتے تھے آنکھیں پائے شہِ مشرقین سے
اُس رات کوئی گھر میں نہ سویا تھا چین سے غل تھا مدینہ ہوتا ہے خالی حسینؑ سے
رخصت حرم سے عورتیں آ آ کے ہوتی تھیں
کوٹھوں پہ پردے والیاں منہ ڈھانپے روتی تھیں

آتی تھی جب عماریٔ زینب قریبِ بام اُن عورتوں سے کہتی تھی یہ خواہرِ امام
اے بیبیو بطورِ ندا ہے مرا کلام شہ کی سلامتی کی دعا کیجیو صبح و شام
وہ دن خدا کرے کہ خوشی تم کو پاؤں میں
بھائی کو لے کے خیر سے پھر گھر میں آؤں میں (جس دم یزید.....)

یثرب سے سوئے کعبہ گیا فاطمہ کا ماہ تا خانۂ خدا میں ملے گوشۂ پناہ
حج بھی نہ کرنے پائے کہ آ پہونچے روسیاہ مولا نے اضطرار میں لی کربلا کی راہ
نہ رُخ کیا یمن کا نہ سوئے نجف گئے
یہ تنگ تھے کہ آپ اجل کی طرف گئے

صعوباتِ سفر

تھا ناوِ صیف تھی یہ حرارت کہ الاماں　　واں کی زمیں پہ تھا کرۂ نار کا گماں
واں دھوپ سے غزال بچاتے تھے اپنی جاں　　اور ہانپتے تھے شیر نکالے ہوئے زباں
دریا بھی گرم عکس سے تھا آفتاب کے
برپا کئے تھے آب نے خیمے حباب کے

سایہ سے اُشتروں کے قدم بڑھ نہ سکتے تھے　　چنگاریوں سے ریت میں ذرّے چمکتے تھے
جھونکے ہوا کے تھے کہ وہ شعلے لپکتے تھے　　لب خشک تھے جوانوں کے بچے بلکتے تھے
بستی نظر نہ آتی تھی رستے اُجاڑ تھے
یا ریگِ گرم راہ میں تھی یا پہاڑ تھے

بچوں کا ساتھ کوس کڑے خوف کا سفر　　منہ اُشتروں کے خشک تو گھوڑے عرق میں تر
ہر دم سکینہ کہتی تھی محمل سے جھانک کر　　پیاسی ہوں دوپہر سے چچا جان ہیں کدھر
بے چین ہے حسینؑ کی پیاری خبر نہیں
ہے ہے انھیں ابھی سے ہماری خبر نہیں

یہ سُن کے روتے جاتے تھے گردن جھکائے شاہ　　دل تھا خدا کی سمت تو رُخ سوئے قتل گاہ
ہر دم یہی زباں پہ دعا تھی کہ یا الٰہ　　دوری ہے ناگوار بس اب قطع ہو یہ راہ
مطلب یہ ہے کہ تیغِ ستم سے گلا ملے
مشتاق ہوں کہ جلد کہیں کربلا ملے

اُس دشت میں اُترنے کا ارمان ہے مجھے　　ریتی میں خیمہ کرنے کا ارمان ہے مجھے
دامن میں خون بھرنے کا ارمان ہے مجھے　　اُس سرزمیں پہ مرنے کا ارمان ہے مجھے
قربان تجھ پہ سبطِ رسالت پناہ ہو
پہنچا دے ایک دن میں جو دو دن کی راہ ہو　　(دردِ سخن تنہائے ...)

سبطِ نبیؐ سے منزلِ مقصد قریب ہے — آرامگاہِ جانِ محمدؐ قریب ہے
مولد تو دور رہ گیا مشہد قریب ہے — جس جا لحد بنے گی وہ سرحد قریب ہے
جاتے ہیں آپ خلق کی مشکل کشائی کو
آتی ہے کربلا سے اجل پیشوائی کو

وہ سالکِ طریقِ ہدایت ہے شاد شاد — ہے آرزو کہ جلد ملے گوہرِ مراد
بہتے ہیں اشک جوش پہ ہے بحرِ اتحاد — لب پر اُسی کا ذکر ہے دل میں اسی کی یاد
معشوق کے سوا کوئی پیشِ نظر نہیں
یہ شوقِ وصل ہے کہ کسی کی خبر نہیں

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہ سخت — پانی نہ منزلوں نہ کہیں سایۂ درخت
ڈوبے ہوئے پسینوں میں ہیں غازیوں کے رخت — سنولا گئے ہیں رنگ جوانانِ نیک بخت
راکب عبائیں چاند سے چہروں پہ ڈالے ہیں
تونسے ہوئے سمند زبانیں نکالے ہیں

جلتی ہے خوں حرارتِ خورشید ہے دو چند — مرجھا گئے ہیں نخل ہوا میں ہے یہ گزند
جھیلوں میں ہیں درند درختوں پہ ہیں پرند — ہے دھوپ میں رسول کا فرزندِ ارجمند
غربت میں بیکسی ہے شہِ دیں پناہ پر
سایہ ہے آفتاب کا زہراؑ کے ماہ پر

وہ دن ہیں جن دنوں کوئی کرتا نہیں سفر — صحرا کے جانور بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر
رنجِ مسافرت میں ہیں سلطانِ بحر و بر — لب برگِ گل سے خشک ہیں چہرہ عرق میں تر
آتی ہے خاک اُڑ کے یمین و یسار سے
گیسوئے مشکبار اَٹے ہیں غبار سے

اہلِ حرم ہیں محمل و ہودج میں بیقرار — معصوم پانی مانگتے ہیں رو کے بار بار
بانو پکارتی ہے کہ یا شاہِ نامدار — گرمی سے جاں بلب ہے مرا طفلِ شیر خوار
کیونکر یہ دُکھ اُٹھے چھ مہینے کی جان سے
گرمی ہے یا برستی ہے آگ آسمان سے

جب طے ہوئی وہ منزلِ آفت قریبِ شام — اُس روز ثعلبیہ میں شہ کا ہوا مقام
اکبر نے آن کر کیا پردے کا اہتمام — ناقوں سے اُترے آلِ نبیؐ باصد احترام
ڈوبے ہوئے عرق میں سبھوں کے لباس تھے
دل رُندھ گئے تھے چاند سے چہرے اُداس تھے

اُترے رفیقِ خاص قریبِ خیامِ شاہ — کچھ فاصلے سے گرد فروکش ہوئی سپاہ
نکلا حرم سے حضرتِ خیر النساء کا ماہ — کرسی پہ جلوہ گر ہوا وہ عرش بارگاہ
ہر نخل غیرتِ شجرِ طور ہو گیا
صحرا خدا کے نور سے معمور ہو گیا

اُس دن بہت اُداس تھا زہرا کا یادگار — زردی تھی رُخ پہ گیسوؤں پہ راہ کا غبار
صحرا پہ گہہ نظر تھی گہے سوئے کوہسار — کہتے تھے دیکھ دیکھ کے گردوں کو بار بار
کس کو نہ بے وطن کیا کس پر جفا نہ کی
اے دہر تو نے آہ کسی سے وفا نہ کی

کوفہ کی حالت

یہ کہہ کے رو رہے تھے شہِ دیں کہ ناگہاں — ناقے پہ اک سوار ہوا دُور سے عیاں
عباسؑ سے یہ کہنے لگے شاہِ دوجہاں — تم جا کے اس عرب کو بلا لاؤ بھائی جاں

تشویش ہے رسولِ خدا کے حبیب کو
کچھ پوچھنا ہے اس سے حسینؑ غریب کو
جلدی چلے یہ سنتے ہی بحکم شہِ انام
پاس اُس کے جا کے آپ نے کی سبقتِ سلام
ناقہ بٹھا کے کود پڑا تب وہ نیک نام
عباسِ نامور نے یہ اُس سے کیا کلام
آیا ہے تو جدھر سے اُدھر ہم بھی جاتے ہیں
اے شخص جلد چل تجھے آقا بلاتے ہیں
دیکھا جو رعب و دبدبہ و شوکت و جلال
دستِ ادب کو جوڑ کے اُس نے کیا سوال
ہے کون شخص آپ کا آقائے خوش خصال
عباس نے کہا کہ رسولِ خدا کا لال
نورِ نگاہ و فاتحِ بدر و حنین ہے
آقا کا میرے اسمِ مبارک حسینؑ ہے
یہ سُن کے اشک آنکھوں سے اُس شخص نے بہائے
چھاتی پہ ہاتھ مار کے بولا کہ ہائے ہائے
کیوں اِس طرف کو سیدِ والا وطن سے آئے
آفت سے نورِ چشمِ علی کو خدا بچائے
سب اہلِ شہر ہیں کوفیوں کو اُن سے بیر ہے
پھر جائیں آپ جانبِ یثرب تو خیر ہے
گھبرا گئے یہ سنتے ہی عباسِ باوفا
فرمایا اے عرب ترے رونے کی وجہ کیا
مسلم نے بھی یہ حال تو خط میں نہیں لکھا
اُس نے کہا کہ اور ہے کچھ واں کا ماجرا
سب شہر پھر گیا ہے شہِ خاص و عام سے
کہنا ہے جو کہوں گا مفصل امام سے
پہونچا وہ جب قریبِ شہنشاہِ سرفراز
تسلیم کر کے پاؤں پہ رکھا سرِ نیاز
ہاتھ اُس کا لے کے ہاتھ میں اُٹھے شہِ حجاز
بولا کنارے جا کے وہ اُمت کا کارساز

گر نیک ہو سفر تو وسیلہ ظفر کا ہے
آنا ہوا کدھر سے ارادہ کدھر کا ہے

کی عرض اُس نے اے پسرِ سیدالبشر — کوفے کے شہرِ شوم سے آتا ہوں میں اِدھر
فرمایا شہ نے ہے تجھے مسلم کی کچھ خبر — رونے لگا وہ مردِ مسافر جھکا کے سر
شہ بولے وجہ کیا جو ترا حال غیر ہے
جلدی بتا کہ میرے مسافر کی خیر ہے

گھبرا کے حال پوچھتے تھے شاہِ نامدار — گر گر کے وہ قدم پہ یہ کہتا تھا بار بار
پھر چلیئے اب وطن کی طرف بہرِ کردگار — کوفے میں سب ہیں عہد شکن اور ستم شعار
آلِ رسولِ پاک پہ کیا کیا جفا نہ کی
یہ ہیں وہی جنہوں نے علیؑ سے وفا نہ کی

بچوں پہ رحم کیجئے یا شاہِ انس و جاں — پہونچے نہ ان گلوں کو کہیں صدمۂ خزاں
بچھڑے نہ اس ضعیفی میں اکبر سا نوجواں — رکھے خدا جہاں میں یداللہ کا نشاں
پھولا پھلا رسولِ خدا کا چمن رہے
روشن سدا چراغِ مزارِ حسنؑ رہے

یہ مکر ہے جو آپ کو لکھے ہیں سب نے خط — مطلب یہ ہے کہ یاں تلک آویں کسی نمط
مضمون بھی غلط ہیں عبارت بھی سب غلط — یہ خط نہیں ہیں قتل کی تدبیر ہے فقط
حاکم کا مدعا ہے کہ ظلم و ستم کروں
گر جھوٹ ہو تو ہاتھوں کو اپنے قلم کروں

شہادتِ مسلمؑ کی خبر

کوفی تمام مایۂ جور و فساد ہیں　　مفسد ہیں بد طریق ہیں بد اعتقاد ہیں
تربت میں فاطمہؑ کے رُلانے پہ شاد ہیں　　تیغیں اِدھر ہیں دل سوئے ابنِ زیاد ہیں
بے ہمتوں نے کون سا وعدہ وفا کیا
کیونکر کہوں کہ مسلمِ بے کس سے کیا کیا

پھر بولا سر کو پیٹ کے با صد غم و محن　　آقا ہوا شہید وہ مظلومِ بے وطن
نیزے پہ سر ہے جسم ہے بے گور و بے کفن　　اور اب تلک بندھی ہوئی ہے پاؤں میں رسن
تربت نہیں نصیب تنِ پاش پاش کو
گلیوں میں لوگ کھینچتے پھرتے ہیں لاش کو

ہانی جو تھا حضور کا غم خوار و خیر خواہ　　مسلم نے لی تھی گھر میں اُسی دوست کے پناہ
کوڑے لگے پہ منہ سے نہ کی اُس جری نے آہ　　مسلم کے ساتھ وہ بھی ہوا قتل بے گناہ
صادق جو تھے وفا میں تو کامل تھے عشق میں
دونوں کے سر روانہ ہوئے ہیں دمشق میں

شہ نے سُنا عرب سے جو سارا یہ ماجرا　　فرمایا بازگشت ہے سب کی سوئے خدا
جو مسلمِ غریب پہ ہونا تھا ہو چکا　　باقی ہے کچھ جو ظلم وہ اب ہم پہ ہوئے گا
خواہان مرگ سبطِ رسالت مآب ہے
اُن کا جہاں سے کوچ مرا پا تراب ہے

یہ بات کہہ کے رونے لگے شاہِ نامدار　　وا مسلما کہا کئی باری بحالِ زار
فرماتے تھے کہ ہائے مرے یارِ غم گسار　　بھائی حسینؑ تیری غریبی پہ ہو نثار

میں جانتا تھا اب مرے لینے کو آؤ گے
اس کی خبر نہ تھی کہ ہمیں چھوڑ جاؤ گے

کوفی بدی کریں گے یہ مجھ کو نہ تھی خبر   شرمندہ ہے حسینؑ تمہیں پہلے بھیج کر
درپیش ہے ہمیں بھی اسی طرح کا سفر   اب ہم بھی آن پہنچے ہیں واں تم گئے جدھر
رتبے بڑے ہیں کُشتۂ اوّل کے واسطے
سبقت تو ہے ضرور ہراول کے واسطے

اتنے میں روتے روتے جو کچھ آگیا خیال   مسلم کے دونوں بیٹوں کا پوچھا عجب ہے حال
اُس نے کہا کہ کیا کہوں اے شاہِ خوش خصال   حارث کے ہاتھ آگئے وہ دونوں نونہال
بے رحم نے یتیموں پہ کیا کیا ستم کئے
بازو بندھے تھے دونوں کے جب سر قلم کئے

آتا تھا شہرِ کوفہ سے جس دم میں نوحہ گر   حاکم کے آگے جاتے تھے وہ چھوٹے چھوٹے سر
آنکھیں کھلی تھیں چاند سے چہرے تھے خوں میں تر   رُخ پر پڑی لٹکتی تھیں زلفیں اِدھر اُدھر
ہاتھوں سے آشکار نشانِ سجود تھے
بے رحم کے طمانچوں سے عارض کبود تھے

فریاد کرکے کہنے لگے سرورِ عرب   خاموش رہ کہ صبر کی طاقت نہیں ہے اب
بندوں کا اختیار ہے کیا جو رضائے رب   دونوں یتیم بھی نہ بچے اُس کے ہے غضب
معلوم تھا کہ کہ تب ہی یہ آئے گی
ماں اُن کی جب سُنے گی تو کیا خاک اڑائے گی

رو رو کے پوچھا بچوں کی قبروں کا جب پتا   وہ شخص دونوں ہاتھوں سے سر پیٹنے لگا
کی عرض کچھ نہ پوچھئے اے ابنِ مرتضا   تجہیز کیسی، قبر کہاں اور کفن کجا

یوں دفن کم ہوا ہے کوئی کائنات میں
خندق میں لاش باپ کی بیٹے فرات میں

یہ سن کے اُٹھ کھڑے ہوئے حضرت بچشمِ نم — کہنے لگا وہ مردِ عرب چوم کر قدم
اب کس طرف کا قصد ہے اے سرورِ اُمم — شہ نے کہا کہ جائیں گے مقتل پہ اپنے ہم
منہ کو سنان و تیغ سے موڑا نہ جائے گا
مجھ سے خدا کی راہ کو چھوڑا نہ جائے گا

رخصت ہوا وہ مردِ مسافر بصد فغاں — نہوڑائے سر کو گھر میں گئے شاہِ دوجہاں
آنکھوں سے اشک ریشِ مبارک پہ تھے رواں — حضرت کو روتے دیکھ کے گھبرائیں بیبیاں
صدمے سے رنگ بانوئے بیکس کا فق ہوا
زینبؑ زمیں پہ اُٹھ کے گری یہ قلق ہوا

کلثومؑ سر کو پیٹ کے آئی بہن کے پاس — قاسم کی والدہ میں نہ مطلق رہے حواس
تکتی تھی منہ کو شہ کے سکینہ بچشمِ یاس — سب سے زیادہ زوجۂ مسلم کو تھا ہراس
خیمے سے صحن تک جو گئی جا بجا گری
چہرے سے رنگ اُڑ گیا سر سے ردا گری

رونے سے شہ کے ہوش کسی کے نہ تھے بجا — سینوں میں دل دھڑکتے تھے لرزاں تھے دست و پا
کہتی تھی رو کے زوجۂ عباسِ باوفا — باہر سے یاں انھیں تو بلائے کوئی ذرا
پوچھوں تو حال کیوں شہِ والا کا غیر ہے
کیا ہو گیا؟ وطن میں تو لوگوں کی خیر ہے

کبرا پکارتی تھی کہ صغرا کی خیر ہو — یارب مریضِ بیکس و تنہا کی خیر ہو
مسلم کی بیٹی کہتی تھی بابا کی خیر ہو — غربت میں قاصدِ شہِ والا کی خیر ہو

ہے ہے وطن سے آن کے وہ لُٹ گئے نہ ہوں
بھائی مرے پدر سے کہیں چھُٹ گئے نہ ہوں

اتنے میں بڑھ کے شاہ سے زینبؑ نے یہ کہا | بھیّا مجھے بتاؤ تو رونے کی وجہ کیا
فرمایا شاہ نے کہ بہن قہر ہو گیا | بیٹوں سمیت قتل ہوا ابن عم مرا

مسلم سے کوفیوں نے بڑی بے وفائی کی
گاڑی نہ لاش بھی مرے مظلوم بھائی کی

پیٹیو کہ رانڈ ہو گئی عباس کی بہن | رنڈسالہ اس کو دو کہ نہ اس کو ملا کفن
مارا گیا مرے لئے ہے ہے وہ صف شکن | اب ہم نہ پھر کے جائیں گے ہم سے چھٹا وطن

آپہونچی فصل فاطمہؑ کے خاک اُڑانے کی
زینبؑ یہ ابتدا ہے مرے مارے جانے کی

سمجھو تم اس خبر کو مرے قتل کی خبر | بانو بھی سنا تھ زوجۂ مسلم کے کھولے سر
پُرسے کو آئے زوجۂ عباسؑ نامور | بیکس تھا وہ شریک عزا ہو تمام گھر

رنڈسالہ بیبیاں اُسے جس دم پنہائیں گی
اماں نکل کے قبر سے پُرسے کو آئیں گی

یہ سُن کے چھاتیوں کو لگے پیٹنے حرم | چلّائی رو کے زوجۂ مسلم کہ ہے ستم
مارا گیا سفر میں غلام شہِ اُمم | فریاد ہے کہ رانڈ ہوئی میں اسیر غم

صدمے اجل کے تین دموں پر گزر گئے
وارث بھی مر گیا مرے بچے بھی مر گئے

غل سُن کے آئے خیمے میں عباسؑ نامور | دیکھا بہن تڑپتی ہے سر ننگے خاک پر
دل غم سے ٹکڑے ہو گیا روئے جھکا کے سر | بولے قریب آ کے خدا پر کرو نظر

سمجھیں گے اُن سے قاتلِ مسلم نظر میں ہیں
پیٹو نہ سر کہ سیدِ والا سفر میں ہیں

وابستہ جس کے دم سے ہو اُس کار ہے خیال
لازم نہیں تمہیں کہ بھرے گھر میں کھولو بال
ہم سب غلام جن کے ہیں دیکھو تو اُن کا حال
مانگو دعا جہاں میں رہے فاطمہؑ کا لال
لازم ہے تم کو صبر کہ دنیا میں نام ہو
اُس کا زہے شرف کہ نثارِ امام ہو

مسلم ہوئے ہراولِ فوجِ شہِ انام
دنیا میں تا قیامِ قیامت رہے گا نام
کیا نیک کوچ تھا کہ ہوا خلد میں مقام
مخدومۂ جہاں انھیں روئیں گی صبح و شام
ماں سے سوا شفیق ہیں اور حق شناس ہیں
بچے تمہارے فاطمہ زہرا کے پاس ہیں

شوہر تمہارا صاحبِ عزت تھا اے بہن
حُلّے ملے بہشت میں پایا نہ گر کفن
زخموں کے بدلے ہاتھ لگا خلد کا چمن
ہمسایۂ رسول ملا گو چھٹا وطن
راضی علیؑ ہوں شاد خدا کا حبیب ہو
مانگو دعا کہ ہم کو یہ دولت نصیب ہو

مسلم کا خوں جو راہِ خدا میں ہوا سبیل
پہونچا کنارِ کوثر و تسنیم و سلسبیل
تائیدِ ذوالجلال سے رُتبہ ہوا جلیل
عاقل کمال تھا پسرِ حضرتِ عقیل
سمجھو نہ یہ سفر کی تباہی میں مر گیا
زندہ ہے وہ جو راہِ الٰہی میں مر گیا

سمجھاتے تھے بہن کو یہ عباسِ نامور
روتے تھے سر جھکائے ہوئے شاہِ بحر و بر
مسلم کو یاد کر کے حرم پیٹتے تھے سر
بیٹی پکارتی تھی کہ ہے ہے مرے پدر

تم بن ہماری زیست کی صورت بگڑ گئی
بیٹوں کو ساتھ لے گئے بیٹی بچھڑ گئی

شورِ بکا ذرا نہ ہوا کم تمام رات — سویا نہ کوئی خیمے میں اک دم تمام رات
تڑپا کیے امامِ دو عالم تمام رات — گھر میں رہا حسینؑ کے ماتم تمام رات[1]
کیونکر تلخ ہو نہ چشمۂ شیریں حیات کا
طوفاں میں آگیا ہے سفینہ نجات کا

دو منزلیں اِدھر تھے ابھی شاہِ کم سپاہ — ظاہر ہوا ہلالِ محرم فلک پہ آہ
دیکھا جو چاند رونے لگے شاہِ دیں پناہ — پڑھ کر دعا رُخِ علی اکبرؑ پہ کی نگاہ
رونے پہ شہ کے قاسمِ بے پَر نے رو دیا
بابا کے منہ کو دیکھ کے اکبرؑ نے رو دیا (ہے زیورِ عروسِ سخن ...)

اتمامِ سفر اور کربلا میں داخلہ

طے کر چکے حسینؑ جو راہِ ثواب کو — مقتل نظر پڑا شہِ گردوں رکاب کو
اُلفت جو واں کی خاک سے تھی اُس جناب کو — اک عید ہو گئی خلفِ بوتراب کو
دل مثلِ غنچہ واں کی ہوا کھا کے کھل گیا
رستہ ریاضِ خلد میں جانے کا مل گیا

مشتاق اس نواح کا تھا فاطمہ کا لال — رہتا تھا خواب میں بھی اسی دشت کا خیال
آفاق میں یہ ارضِ مقدس ہے بے مثال — سبزہ یہاں کا رحمتِ خالق سے ہے نہال

---

[1] سبطِ نبیؐ سے منزلِ مقصد قریب ہے۔ [2] بیت دوسرے مرثیہ کی ہے جس کا مطلع ہے
روئے سخن ثنائے حسینِ شہید ہے۔

اب تک کسی صدف کو نہ ایسے گہر ملے
گردوں کو ایک اس کو بہتر قمر ملے (ملے کو بچے حسین .....)

زہرا کے اختروں سے زمیں آسماں ہوئی — غازی جہاں چلے وہ جگہ کہکشاں ہوئی
سب ارضِ پاک غیرتِ باغِ جناں ہوئی — ایسا مکیں ملا کہ رفیع المکاں ہوئی
دامن جو پاک صاف تھا دشتِ مصاف کا
احرام باندھا کعبہ نے اُس کے طواف کا

ہاتف نے دی صدا کہ زہے شانِ کربلا — مختارِ کائنات ہے مہمانِ کربلا
پھولوں سے آج بھر گیا دامانِ کربلا — بس اب نواں بہشت ہے بُستانِ کربلا
خورشیدِ دیں کے فیض سے کیا کیا شرف ملے
روشن ہے جس سے عرش وہ دُرِ نجف ملے

یہ دشتِ ہولناک کہاں یہ چمن کہاں — جنگل کہاں بتول کے گل پیرہن کہاں
کنبہ کہاں نبیؐ کا یہ دارِ محن کہاں — قبریں کہاں شکستہ دلوں کی، وطن کہاں
آئے ہیں ڈھونڈتے ہوئے اس ارضِ پاک کو
سچ ہے کہ خاک کھینچتی ہے اپنی خاک کو

غل تھا چمن چمن کہ بہار آئی اب قریب — باغی جو چین دیں تو یہ ہے موسم عجیب
بولی یہ آشیاں سے جدا ہو کے عندلیب — آیا گلِ ریاضِ محمدؐ خوشا نصیب
فخر اُس زمیں کا جس پہ شہِ انس و جن پھرے
دیکھو خدا کی شان کہ جنگل کے دن پھرے

خوشبو سے اُن گلوں کی ہوا دشت باغ باغ — غنچے کھلے ہرے ہوئے بلبل کے دل کے داغ
پہونچا سرِ فلک پہ ہر اک کوہ کا دماغ — دریا نے بھی حبابوں کے روشن کئے چراغ

خورشید بن گئے طبقے ارضِ پاک کے
تاروں کو گرد کر دیا ذرّوں نے خاک کے

جنگل میں بن گیا شجرِ طور ہر درخت — بالیدگی سے ہو گئے ٹکڑے گلوں کے رخت
آئی صدا فلک سے کہ جاگے زمیں کے بخت — اب اس زمیں پہ سوئے گا مختارِ تاج و تخت
رفعت کا اس کی فرش سے غل عرش تک گیا
لو آج خاک کا بھی ستارا چمک گیا

کہتی تھی آسماں سے زمینِ فلک حشم — کیوں آج مرتبے میں زیادہ ہے تو کہ ہم؟
مجھ پر ہیں وہ جو مُہرِ نبوت پہ تھے قدم — ذرّے سے بھی نہاں ترے شمس و قمر ہیں کم
اب تو یہ خاکسار بھی کیواں اساس ہے
زیور جو عرش کا تھا وہ سب میرے پاس ہے

پھیلی جو نکہتِ چمنِ شاہِ بحر و بر — صحرا میں لہلہا گیا سبزہ بھی سر بسر
جلدی ہوا نے جا کے یہ دریا کو دی خبر — آیا تری کچھار میں محتاجِ خشک و تر
جب تک وہ بحرِ فیض برائے وضو بڑھے
بڑھ کر قدم تو لے کہ تری آبرو بڑھے

ساحل پہ ہوں گے جلوہ نما اب امامِ دہر — دریا دلی کا ہوگا تری شور شہر شہر
یہ سن کے بے قرار ہوئی علقمہ کی نہر — سر کو قدم کئے ہوئے دوڑی ہر ایک لہر
آمد سُنی جو سبطِ رسالت مآب کی
ساحل سے آنکھ لڑ گئی اک اک حباب کی

بولے فرس کو روک کے شاہِ فلک وقار — منزل پہ ہم پہونچ گئے احسانِ کردگار
آگے نہ اب بڑھائے کوئی یاں سے راہوار — یہ وہ زمیں ہے جس کے لئے دل تھا بے قرار

قربان اس مکانِ سعادت نشان کے
پایا دُرِ مُراد بڑی خاک چھان کے
اُترو مسافرو کہ سفر ہو چکا تمام
کوچ اب نہ ہوگا حشر تلک ہے یہیں مقام
مقتل یہی زمیں ہے یہی مشہدِ امام
اونٹوں سے بار اُتار کے برپا کرو خیام
بستر لگاؤ شوق سے اِس ارضِ پاک پر
چھڑکا ہوا ہے آبِ بقایاں کی خاک پر

مثلِ زمینِ خلد مصفّا ہے یہ زمیں
ساتوں فلک سے اوج میں بالا ہے یہ زمیں
روئے زمیں پہ عرشِ معلّٰے ہے یہ زمیں
فردوس کا کھنچا ہوا نقشا ہے یہ زمیں
اس کے مکیں نہ ہوں گے پراگندہ حشر میں
بے سر اسی زمیں سے ہم اُٹھیں گے حشر میں

مرغوبِ طبع ہے یہ زمینِ فلک جناب
سوئے گا اس کی خاک پہ فرزندِ بوتراب
ہے اسی طرح یہ ساری زمینوں میں انتخاب
جس طرح ذی شرف ہے ستاروں میں آفتاب
مرنا لکھا ہوا ہے یہیں سرنوشت میں
جائے گا ہاتھوں ہاتھ یہ طبقہ بہشت میں

ذرّوں سے اس کے اشرفیٔ مہر زرد ہے
مٹّی طلا ہے، نسخۂ اکسیر گرد ہے
کردے سقر کی آگ کو پانی یہ سرد ہے
کحلِ بصر ہے داروئے اندوہ و درد ہے
زندے اَلَم سے بچتے ہیں مُردے فشار سے
آنکھوں میں نور آتا ہے اس کے غبار سے

خاک اُس کے دل میں جو اس خاک سے غبار
مجرم بھی اس کے فیض سے اُٹھّے گا رستگار
پڑ جائے جس کے جسم پہ خاک اس کی ایک بار
سایہ سے اُس کے آتشِ دوزخ کرے فرار

یوں دُور ہوں گناہ سب اُس نیک بخت سے
پتّے خزاں میں گرتے ہیں جیسے درخت سے

کام آئے گی لحد میں یہ ہنگامِ دردو یاس — اس خاک سے بنے گا کفن نُور کا لباس
تسبیح اس کی قبر میں ہوئے گی جس کے پاس — تسو تسو طرح کی پائے گا راحت وہ حق شناس

فرمائیں گے مَلَک اِرم اِس کا مقام ہے
سوئے دو جنت سے یہ مطیعِ امام ہے

دیں گے جو اس کی خاک سے لکھا ہوا کفن — میت پہ پھر نہ ہوگا کوئی صدمہ و محن
ڈھانپے گا اُس کو چادرِ رحمت سے ذوالمنن — خوشبو سے ہوگا کنجِ لحد خلد کا چمن

پھولوں میں خاکِ پاک کفن کو بسائے گی
صُرتوں سے نکہتِ گُلِ فردوس آئے گی

توشہ مسافروں کا یہی اور یہی ہے زاد — یہ خاک آپ خضر سے رتبے میں ہے زیاد
طوفاں میں اِس کو ڈالے گا جو مردِ خوش نہاد — لے آئے گی ہوائے موافق دُرِ مُراد

دیکھے گا یاس میں کرم کارساز کو
تھامے گا دستِ موج سے دریا جہاز کو

اُترا یہ کہہ کے کشتیِ اُمت کا ناخدا — جتنے سوار تھے وہ ہوئے سب پیادہ پا
حضرت نے مُسکرا کے یہ ہر ایک سے کہا — دیکھو تو کیا ترائی ہے کیا نہر کیا فضا

اکبر شگفتہ ہو گئے صحرا کو دیکھ کر
عباس جھومنے لگے دریا کو دیکھ کر

بولے یہ اشک بھر کے شہنشاہِ سربلند — کیوں یہ مقام ہے تمہیں شاید بہت پسند
کی مسکرا کے عرض کہ یا شاہِ ارجمند — بس یاں تو خود بخود ہوئی جاتی ہے آنکھ بند

شبیر اب یہیں رہیں گے عنایت جو رب کی ہے
میں کیا کہوں حضور ترائی غضب کی ہے

گرمی میں ایسی سرد ہوا پایا شہِ انام — ہے لیٹنے کی جا یہ زمینِ فلک مقام
مشہور غاضریہ ہے شاید اسی کا نام — جی چاہتا ہے یاں سے سرکئے نہ ایک گام
ایسی جگہ بس اب نہ ملے گی کسی جگہ
کیا لطف ہو جو قبر بھی ہووے اسی جگہ

روتے ہوئے وہاں سے بڑھے آپ چند گام — گویا زمیں کی سیر کو اترا مہِ تمام
انجم کی طرح گرد تھے حیدر کے لالہ فام — شکلیں وہ نور کی وہ تجمل وہ احتشام
زلفیں ہوا سے اڑتی تھیں ہاتھوں میں ہاتھ تھے
لڑکے بھی بند کھولے ہوئے ساتھ ساتھ تھے

تکنے لگے پہاڑوں کو مسلم کے دونوں لال — پھولوں سے کھیلنے لگے زینب کے نونہال
سبزے سے واں کے ابنِ حسن خوش ہوئے کمال — کی عرض اس زمیں کا ہر اک گل ہے بےمثال
اے خسروِ زمیں یہ جگہ ہے جلوس کی
خوشبو ہے یاں کی خاک میں عطرِ عروس کی

صحرا سے آئے پھر سوئے دریا شہِ امم — الیاس شاد ہو کے پکارے زہے کرم
ابھریں درود پڑھتی ہوئی مچھلیاں بہم — بولے حباب آنکھوں پہ شاہا ترے قدم
پانی میں روشنی ہوئی حسنِ حضور سے
لے لیں بلائیں پنجۂ مرجاں نے دور سے

ٹھہرے کنارِ نہر جوانانِ ماہ رو — دھویا کسی نے رخت کسی نے کیا وضو
گھوڑے جو آئے پیاس بجھانے کنارِ جو — بھر لائے اشک آنکھوں میں شبیرِ نیک خو

کھینچی اک آہ سرد ترائی کو دیکھ کر
ہاتھوں سے دل پکڑ لیا بھائی کو دیکھ کر

خیموں کے نصب کرنے کی تیاریاں

بولے یہ ہاتھ جوڑ کے عباسِ نامور
خیمہ کہاں بپا کریں یا شاہِ بحر و بر
ایذا ہے محملوں میں بہت اہلبیتؑ پر
بچے ہیں نازکی میں گلوں سے زیادہ تر
گرمی کے مارے دم ہیں سبھوں کے گھٹے ہوئے
کب سے عماریوں کے ہیں پردے چھٹے ہوئے

کچھ سوچ کر امامِ دو عالم نے یہ کہا
زینبؑ جہاں کہیں وہیں خیمہ کرو بپا
پیچھے ہٹے یہ سنتے ہی عباسؑ باوفا
جاکر قریبِ محملِ زینبؑ یہ دی صدا
حاضر ہے جاں نثار امامِ غیور کا
برپا کہاں ہو خیمۂ اقدس حضور کا

بولی یہ سن کے دخترِ خاتونِ روزگار
اس امر میں بھلا مجھے کیا دخل ہے نثار
خشکی ہو یا ترائی چمن ہو کہ سبزہ زار
ہر جا مسافروں کا نگہباں ہے کردگار
مختار کائنات کے تم نورِ عین ہو
اترو وہاں جہاں مرے بھائی کو چین ہو

عاقل ہو تم تو نام خدا اے علیؑ کے لال
مجھ سے زیادہ بھائی کی راحت کا ہے خیال
دریافت کرلو پہلے کسی سے یہاں کا حال
وارد کسی طرح کا نہ آفت کو ہو ملال
گوشہ ملے ہمیں نہ فضا ہو نہ سیر ہو
اب تو یہی پڑی ہے کہ جانوں کی خیر ہو

آرام کو ترس گئے جب سے چھٹا ہے گھر — کن آفتوں میں پانچ مہینے ہوئے بسر
یہ آندھیاں، یہ گرمی کے ایام، یہ سفر — دن بھر چلے ہیں دھوپ میں، جاگے ہیں رات بھر
گرمی سے کھیت خشک تھے جنگل اُجاڑ تھا
ایک ایک کوس راہِ جبل میں پہاڑ تھا

آج اس زمین پر ہمیں لایا ہے آسماں — اب دیکھئے دکھاتی ہے تقدیر کیا یہاں
آقا کی خیریت کی دعا مانگو بھائی جاں — یارب مسافروں کو مبارک ہو یہ مکاں
دشمن بہت ہیں بادشہِ خوش خصال کے
بھائی بہن نثار ذرا دیکھ بھال کے

بھائی سے اس زمیں کی سُنی ہے بہت صفت — ہے وہ امام واقفِ اسرارِ شش جہت
جو جو محسن ہیں اُن سے بھی لازم ہے مصلحت — صدقے گئی حبیب سے بھی کر لو مشورت
ساحل پہ دشمنوں میں کسی کا عمل نہ ہو
بھیا مجھے یہ ڈر ہے کہ ردّ و بدل نہ ہو

دستِ ادب کو جوڑ کے اُس شیر نے کہا — تشویش کچھ نہ کیجئے اے بنتِ مرتضیٰ
ہر چند مصلحت مری کیا اور عقل کیا — لیکن کوئی ترائی سے بہتر نہیں ہے جا
جو مہر فاطمہؑ میں ہے یہ وہ فرات ہے
گرمی میں قربِ نہر کا آبِ حیات ہے

جس سرزمیں پہ دلبرِ زہراؑ عمل کرے — زہرہ کسی کا کیا ہے جو ردّ و بدل کرے
مانع وہ ہو جو دینِ نبیؐ میں خلل کرے — کافر ہے جو حسینؑ سے جنگ و جدل کرے
دخل اس میں روم کا ہے نہ سلطانِ شام کا
دنیا کی سب زمیں پہ ہے قبضہ امام کا

حضرت کے حکم کا منتظر ہے جہاں نثار — ارشاد یہ ہوا کہ دیا تم کو اختیار
آیا حضورِ سبطِ پیمبر وہ ذی وقار — کی عرض خیمہ نہر پہ کرتا ہے خاکسار
اُتریں یہیں یہ مرضیٔ آلِ رسول ہے
بولا وہ بحرِ فیض کہ اچھا قبول ہے

یہ سُن کے خادموں کو پکارا وہ مہ جبیں — فرّاش آ کے جلد مصفّا کریں زمیں
حاضر ہوں آبپاش محل دیر کا نہیں — یاں ہوگا خیمۂ حرمِ بادشاہِ دیں
جلد اُن کو بھیجو لوگ ہیں جو کاروبار کے
لے آؤ اُشتروں سے قناتیں اُتار کے

بولے زہیرِ قین کہ حاضر ہیں سب غلام — بڑھ کر حبیب بھی ہوئے مصروفِ اہتمام
کرسی منگا کے بیٹھ گئے اک طرف امام — رتبے میں ہو گئی وہ زمیں عرش احتشام
پرتو فگن تھا نور رسالتمآب کا
سر پہ لگا تھا چترِ زری آفتاب کا

تھا فکر میں خموش وہ عالم کا تاجدار — کھلوا رہے تھے خیموں کو عباسِ ذی وقار
ناگہ اُٹھا شمال کی جانب سے کچھ غبار — رایت سیاہ و سُرخ نظر آئے تین چار
مڑ کر کہا حبیب نے کچھ رنگ اور ہے
بولا کوئی یہ شام کے لشکر کا طور ہے

یک جا ہوئے یہ سُن کے جوانانِ صف شکن — نکلا ہر اک ولی کی زباں سے یہی سخن
آئے ہیں مُلکِ غیر میں ہم چھوڑ کر وطن — تو سب کی خیر کیجیو اے ربِّ ذو المنن
اعدائے دیں کے شر سے حفاظت میں ہم رہیں
ناحق کوئی لڑے بھی تو ثابت قدم رہیں

کہنے لگے پکار کے عباسِ حق شناس ہاں ناصرانِ قبلۂ کونین باحواس
دل میں نہ خوف ہو نہ زباں پر کلامِ یاس جیتے ہو تو حسینؑ سے ہو قدرداں کے پاس
گر مر گئے تو روضۂ رضواں کی سیر ہے
دونوں طرف مآل تمہارا بخیر ہے

کیا ڈر قشونِ روم ہے یہ یا جنودِ شام ہم اپنے کام میں ہیں ہمیں کیا کسی سے کام
جو مرد ہیں ہراس کے کرتے نہیں کلام ہونے دو گر ہیں سُرخ علم یا سیاہ فام
سرسبز ہیں وہی جو علیؑ کے نشان ہیں
خود جھک کے وہ ملیں گے کہ ہم میہمان ہیں

فوجِ یزید کی آمد

یہ ذکر تھا کہ بن میں سیاہی سی چھا گئی ڈنکے کی دشتِ ظلم سے کوسوں صدا گئی
گھوڑوں کے دوڑنے سے زمیں تھرتھرا گئی جنگی سپاہ گھاٹ کے نزدیک آ گئی
ایک ایک پیل زور تہمتن شکوہ تھا
ابنِ رکاب پیہ سبز قدم سر گروہ تھا

بولے ملازموں سے یہ عباسِ باوفا دریافت تو کرو کہ ارادہ ہے اِن کا کیا
آتے ہی سرکشی یہ طریقہ ہے کونسا کہہ دو کہ اہلبیت کے خیمہ کی ہے یہ جا
لازم رسولؐ زادیوں کا احترام ہے
اُتریں الگ کہیں یہ ادب کا مقام ہے

کرسی نشیں ہے تختِ دلِ سیّد البشر آئینِ خسروی سے یہ واقف نہیں مگر
آتی ہے اُڑ کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے گرد ادھر کیا ہے جو روکتے نہیں باگیں یہ خیرہ سر

بھولے ہوئے ہیں اس پہ کہ ہم خاکسار ہیں
شاید ہوا کے گھوڑوں پہ ظالم سوار ہیں

اُس فوج کے رئیس نے بڑھ کر کیا کلام
حکمِ امیر یہ ہے یہیں اُترے سپاہِ شام
چھوڑیں گے ہم اُسے کہ جو راحت کا ہے مقام؟
دریا سے ہٹ کے آپ بپا کیجیے خیام
لشکر کشی ہے بادشہِ کائنات پہ
کل مورچے سپاہ کے ہوں گے فرات پہ

کوفے سے کل جواں اِدھر آئے ہیں دس ہزار
رستے میں شام کی ابھی فوجیں ہیں بے شمار
خالی ہیں منزلیں نہ بیاباں نہ کوہسار
شہروں سے پرگنوں سے چلے آتے ہیں سوار
لاکھوں ہیں کوئی قبل کوئی بعد آئے گا
گیتی ہلے گی جب پسرِ سعد آئے گا

فوجوں کا جائزہ تھا وہاں ہم چلے تھے جب
گردے میں بیس کوس کے لشکر پڑا تھا سب
دستوں کی روم و شام کے آمد ہے روز و شب
اس ارض پر نہ ہو جو سمائی تو کیا عجب
کیجے مقام اگر کوئی گوشہ جُدا ملے
ممکن نہیں کہ نہر پہ خیمے کی جا ملے

عباسؑ کا جلال

ہم گھاٹ روکنے کے لیے آئے ہیں اِدھر
ہے آج شب کو داخلۂ شمر کی خبر
سُنتے ہی یہ ترائی میں گونجا وہ شیرِ نر
تیوری چڑھا کے تیغ کے قبضہ پہ کی نظر
کم تھا نہ ہمہمہ اسدِ کردگار سے
نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

غصے میں رکھ کے دوش پہ شمشیرِ برق دم — نعرہ کیا اسد نے کہ تم سے نبٹیں گے ہم
گر فوجِ قاہرہ کی ہے آمد تو کیا ہے غم — گرتا ہے کٹ کے سر وہیں جس جا جمے قدم
بپھریں جو شیر سامنے آتا نہیں کوئی
یہ آنکھ وہ ہے جس میں سماتا نہیں کوئی

دنیا ہو اک طرف تو نہ آئے خیال میں — لاکھوں پہ اپنی تیغ چلی ہے جدال میں
گیتی ہو بے نشاں اگر آئیں جلال میں — ہے سب طرح کا زور محمد کی آل میں
دریا ہے کیا یہ شیر ہٹیں جس کو چھوڑ کے
جب پُل بنا دیا درِ خیبر کو توڑ کے

تم کون ہو حسینؑ ہے مختارِ خشک و تر — ان کے سوا ہے کون شہنشاہِ بحر و بر
دیکھو فساد ہو گا بڑھو گے اگر ادھر — شیروں کا یاں عمل ہے تمہیں کیا نہیں خبر
سبقت کسی پہ ہم نہیں کرتے لڑائی میں
بس کہہ دیا کہ پاؤں نہ رکھنا ترائی میں

کیا ابنِ سعدِ شوم کی فوج اور کیا حشم — سر لوٹتے پھریں گے بڑھایا اگر قدم
اُترے ہیں آکے فخرِ سلیماں کے ساتھ ہم — کیا اُن کے مورچے کہ جو ہوں چیونٹیوں سے کم
کچھ ڈر نہیں جو لاکھ اگر بد خصال ہیں
ہم بھی کشندۂ درِ خیبر کے لال ہیں

کیا سر پہ موت آئی ہے بس سامنے سے جاؤ — فوجوں کا ذکر کرکے کسی اور کو ڈراؤ
دعویٰ ہے کچھ سپاہ گری کا اگر تو آؤ — بیٹا رحیم کا ہوں مجھے غیظ میں نہ لاؤ
تلوار اِدھر کھنچی کہ اُدھر کھیت پڑ گیا
پھر کچھ نہ بن پڑے گا اگر میں بگڑ گیا

ہم شیر ہیں قسم اسدِ کردگار کی
رکھتے ہیں ناخنوں میں بُرش ذوالفقار کی
تنتو کی نہ اصل یاں نہ حقیقت ہزار کی
ٹوکے یہ کیا مجال کسی نابکار کی
گرجیں ابھی تو رعد ہیں برسیں تو ابر ہیں
اک ہیں نہیں بہت ابھی ایسے ہزبر ہیں

چھوڑیں نہ یہ زمیں جو گرے سر پہ آسمان
بڑھ کر ہٹا نہیں کبھی اس فوج کا نشان
جب تک کہ دم میں دم ہے نہ جائیگی آن بان
ریتی پہ ہم بپا کریں خیمہ خدا کی شان
مرجائیں وہ جو ساتھ کئی شیرخوار ہیں
فی الواقعی ہم ایسے ہی تقصیروار ہیں!

ہم پہلے آئے ہیں کہ تم آئے ہو تا بہ نہر
کیوں غاصبو! یہ نہر نہیں فاطمہ کا مہر؟
چھوڑ آئے ہیں تمہارے بلانے پہ اپنا شہر
کوئی مسافروں پہ یہ کرتا ہے جبر و قہر
اُترے ابھی نہیں کہ لڑائی ٹھہر گئی
وعدے وہ کیا ہوئے وہ محبت کدھر گئی

شر اس قدر زمیں پہ تمہارے سروں پہ خاک
مٹی ہوئے لکھے تھے عریضوں میں جو تپاک
ہے بوتُرابیوں کی جگہ یہ زمینِ پاک
ہوئیں گی تربتیں بھی یہیں گر ہوئے ہلاک
تم لوگے کس طرح یہ جگہ ہم کو بھائی ہے
مشہور ہے کہ شیروں کا مسکن ترائی ہے

سوچو تمہیں دلوں میں کہ حقدار کون ہے
عالم میں بر و بحر کا مختار کون ہے
ہادی ہے کون سیدِ ابرار کون ہے
ہے بے قصور کون گنہگار کون ہے
لازم ہے تم کو پاس کلامِ مجید کا
کلمہ نبیؐ کا پڑھتے ہو تم یا یزید کا

یہ کس کے گھر سے دین کی دولت ملی تمہیں　　صدقہ ہے کس ولی کا جو عزت ملی تمہیں
خوانِ کرم سے کس کے یہ نعمت ملی تمہیں　　ہادی ہوئے جو ہم، تو ہدایت ملی تمہیں
پھلتا نہیں نہال حسد پھولتا نہیں
محسن کو اس طرح سے کوئی بھولتا نہیں

ہم تو تمہیں سمجھتے ہیں سیّد کا خیرخواہ　　کیا خوب میہمانوں کی دعوت ہے واہ واہ
اُلفت نہ دلدہی نہ تعارف نہ رسم و راہ　　معصوم سے وہ کون ایسا ہوا گناہ
چشمے پہ جنگ فاطمہؑ کے نورِ عین سے
نا منصفو! پھراتے ہو آنکھیں حسینؑ سے

ہر چند خاکسار ہیں فرزندِ بوتراب　　پر سرکشی کی ہم سے کسی کو نہیں ہے تاب
کھنچ تک آستیں کو جو اُلٹیں دمِ عتاب　　گردوں میں تھرتھرا کے چھپے قرصِ آفتاب
آجائے انقلاب کی آفت جہان پہ
ہو آسماں زمیں پہ زمیں آسمان پہ

ارض و سما کو ہم تہ و بالا کریں ابھی　　جو سرکشی کرے اُسے پسپا کریں ابھی
اِس سرزمیں کو خون کا دریا کریں ابھی　　ساحل تک آئے جو اُسے ٹھنڈا کریں ابھی
بولے کوئی تو تن سے سر اُس کا جدا کریں
خیمہ بپا نہ ہو تو قیامت بپا کریں

ظالم بگڑ بگڑ کے بڑھے ایک بار سب　　بلوہ جو ہو گیا سمٹ آئے سوار سب
نیزے علم کئے ہوئے تھے نیزہ دار سب　　باندھے تھے ایک غول ضلالت شعار سب
لیکن ملا نہ سکتے تھے آنکھ اُس دلیر سے
اک شور تھا کہ چھین لو دریا کو شیر سے

جوانانِ حسینی کی برہمی

بگڑے ابو ثمامہ و سعدِ فلک سریر — تولی زہیرِ قین نے شمشیرِ بے نظیر
جوڑا کماں میں ابنِ مظاہر نے ایک تیر — بولے اسد کہ زجر کے قابل ہیں یہ شریر

عابس کو غیظ لشکرِ بد خو پہ آگیا
غصے سے بل ہلال کے ابرو پہ آگیا

بولے اُٹھا کے نیزے کو ضر غامۂ دلیر — بس اب سزا میں ان کی مناسب نہیں ہے دیر
بولے شبیب ادھر سے جو نکلے گا ایک شیر — بھاگیں گے سب یہ گھوڑوں کی باگوں کو پھیر پھیر

آقا کا ہے یہ پاس کہ ہم دُور دُور ہیں
کثرت پہ اپنی پھولے ہیں کیا بے شعور ہیں

اُٹھی جناب قاسمِ ذی شاں نے آستیں — قبضے پہ ہاتھ رکھ کے بڑھے اکبرِ حسیں
بولے پکڑ کے نیچے زینب کے مہ جبیں — شیروں سے کیا ترائی کو لیں گے یہ اہلِ کیں

کہیے تو نیزہ بازوں کو ہم دیکھ بھال لیں
تیوری کوئی چڑھائے تو آنکھیں نکال لیں

آگے تھے سب کے حضرتِ عباسِ ذی حشم — بڑھ بڑھ کے روکتے تھے دلیروں کو دم بدم
تیغیں جو تولتے تھے اُدھر بانیٔ ستم — کہتے تھے سر نہ ہوگا بڑھایا اگر قدم

لرزہ تھا رُعبِ حق سے ہر اک نابکار کو
روکے تھا ایک شیرِ جری دس ہزار کو

بڑھتا تھا جھومتا ہوا جس دم وہ شیرِ نر — گرتا تھا کوئی ڈر کے اِدھر اور کوئی اُدھر
تیغیں جو کھنچ گئیں تو ہوا اور شور و شر — گھبرائے اہلبیتِ شہنشاہِ بحر و بر

آغوش میں پھوپھی کی سکینہ دہل گئی
غل پڑ گیا کہ گھاٹ پہ تلوار چل گئی

چلائی رو کے زینبِ ناشاد و نامراد ہے ہے خبر تو لو کہ یہ کس سے ہوا فساد
غربت زدوں سے کیا سبب کینہ و عناد دیکھے کوئی کدھر ہیں شہنشاہِ خوش نہاد
ہمشیر کو نثارِ امامِ اُمم کرو
لوگو دعائیں اکبرِ مہ رُو پہ دَم کرو

محمل سے منہ نکال کے فضہ نے یہ کہا بلوہ کنارِ نہر ہے اے بنتِ مرتضیٰؑ
نیزے بڑھا بڑھا کے ہٹاتے ہیں اشقیا قبضے پہ ہاتھ رکھتے ہیں عباسِ باوفا
کیا جانے کس نے ٹوک دیا ہے دلیر کو
سب دشت گونجتا ہے یہ غصہ ہے شیر کو

زینب پکاریں پیٹ کے زانو بصد ملال ہے ہے غضب ہوا اگر آیا انھیں جلال
کہہ دے کوئی کہ اے اسدِ کبریا کے لال غربت پہ ابنِ فاطمہؑ کی تم کرو خیال
قربان ہو گئی نہ لڑائی کا نام لو
میں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ غصہ کو تھام لو

لڑنے کو تیغ میان سے کھینچو گے تم اگر محمل سے گر پڑوں گی زمیں پر میں ننگے سر
عباس تم تو ساقیِ کوثر کے ہو پسر یہ نہر کیا ہے جس کے لئے رنج اس قدر
مر جاؤں گی سفر میں جو بچھڑوں گی بھائی سے
جنگل مجھے پسند ہے گزری ترائی سے

دریا کو روکتے ہیں اگر بانیِ ستم جلتی زمیں پہ بچوں کو لے کر رہیں گے ہم
غربت زدوں پہ چاہئے اللہ کا کرم پھر آؤ بس سکینہ کے سر کی تمہیں قسم

ثابت ہوا کسی کو ہماری وِلا نہیں
پانی بھی اب نہ دیں تو ہمیں کچھ گلا نہیں

امامِ حسینؑ کا فیصلہ

یہ بات کہہ کے رونے لگی خواہرِ امام — عباسؑ اُدھر غضب میں بڑھے سوئے فوجِ شام
کرسی سے جلد اُٹھ کے پکارے شہِ انام — بھیّا ہمارے سر کی قسم روک لو حُسام
یکساں ہے بر دبحر ہماری نگاہ میں
غیظ و غضب کو دخل نہ دو حق کی راہ میں

ہر چند اس میں کوئی تمہارا نہیں قصور — ناحق فساد کرتے ہیں تم سے یہ بے شعور
خیر امتحاں کا دن بھی کچھ ایسا نہیں ہے دُور — جانے دو جاہلوں سے یہ تکرار کیا ضرور
ادنیٰ سے بحث ننگ ہے عالی مقام کا
بس خامشی جواب ہے ان کے کلام کا

لے سکتے ہیں ترائی کو تم سے یہ نابکار ؟ — کس پر یہ خشم اے شہِ مرداں کی یادگار
جرأت میں تم نہ ایک نہ یہ اہلِ کیں ہزار — بخشا ہے ہر طرح کا تمہیں حق نے اختیار
بے آب تیغ دم میں یہ ناری ہلاک ہوں
گر منہ سے اُف کرو تو ابھی جل کے خاک ہوں

ہے گرچہ ان کی بے ادبی قابلِ سزا — پر تم پسر رحیم کے ہو بخش دو خطا
جنگل ہو یا ترائی ہو ہے ہر جگہ خدا — مظلوم کو غریب کو غصے سے کام کیا
کرتا ہے عاجزی وہی جو حق شناس ہے
ہم کو نبیؐ کی روحِ مطہر کا پاس ہے

صدقے ترے جلال کے اے میرے آفتاب
یاد آ گیا مجھے اسد اللہ کا عتاب
تم سے مقابلے کی جہاں میں کسے ہے تاب
جعفر ہو دبدبے میں شجاعت میں بوتراب
یہ کیا ہیں تم تو سدِ سکندر کو توڑ دو
لو ہم کو چاہتے ہو تو دریا کو چھوڑ دو

لازم ہے ان پہ رحم یہ امت ہے میں نثار
کرتے تھے مصطفیٰ انھیں بیٹوں کی طرح پیار
ان کے لیے حسنؑ نے کیا جبر اختیار
دشمن پہ بھی رہا کرم شیر کردگار
ہو نوجواں مزاج میں غصہ ہے آپ کے
بیٹا وہ ہے قدم بہ قدم ہو جو باپ کے

آؤ تمہیں قسم ہے جنابِ امیرؑ کی
بگڑو نہ سرکشی پہ سپاہِ شریر کی
ہمراہ بیٹیاں ہیں شہِ قلعہ گیر کی
سب سے جدا ہی چاہیے منزل فقیر کی
کیا دشت کم ہے صابر و شاکر کے واسطے
یہ اہتمام ایک مسافر کے واسطے

تھوڑے سے بستروں کی ہے درکار ہم کو جا
جنگل ہوا تو کیا جو ترائی ہوئی تو کیا
ہے عمر بے ثبات زمانہ ہے بے وفا
آرام کا محل نہیں یہ عاریت سرا
اب وہ کہاں ہیں شہر جنھوں نے بسائے ہیں
سب اس زمیں پہ خاک میں ملنے کو آئے ہیں

عباسؑ کی دل شکستگی اور پھر راضی برضا ہونا

آقا نے دی جو اپنے سرِ پاک کی قسم
بس تھرتھرا کے رہ گیا وہ صاحبِ کرم
پر تھی شکن جبیں پہ نہ ہوتا تھا غیظ کم
چپ ہو گئے قریب جب آئے شہِ امم

گردن جھکا دی تا نہ ادب میں خلل پڑے
قطرے لہو کے آنکھوں سے لیکن نکل پڑے

تیغ و سپر کو پھینک کے بولا وہ نامور   کہہ دیجیے اِن سے کاٹ کے لے جائیں میرا سر
حکمِ خدا ہے حکم شہنشاہِ بحر و بر   اب کچھ کہوں زبان سے کیا تاب کیا جگر
میں ہوں غلام آپ کے ادنیٰ غلام کا
آقا مجھے خیال تھا بابا کے نام کا

اُترے گی آ کے نہر پہ اب شام کی سپاہ   پانی بھی ہم پہ بند کریں گے یہ روسیاہ
اس دشت میں نہ اور ہے چشمہ کوئی نہ چاہ   سب قافلہ حضور کا ہو جائے گا تباہ
اِس فکر میں غلام کا دل آب آب ہے
پر عینِ مصلحت ہے جو حکمِ جناب ہے

گردن میں ہاتھ ڈال کے حضرت نے یہ کہا   کیوں کانپتے ہو غیظ سے بھائی یہ کیا یہ کیا
لو اب اُٹھا لو تیغ و سپر تم پہ میں فدا   دریا کو تم تو لے چکے اے میرے مرتضا
وہ شیر ہو کر دھاک ہے ساری خدائی میں
دیکھو کوئی تمہارے سوا ہے ترائی میں؟

اس قوم سے نہ رد و بدل چاہیے تمہیں   غصہ نہ بر ہمی نہ جدل چاہیے تمہیں
قربِ خدائے عزّ و جل چاہیے تمہیں   جو ہم کہیں اُسی پہ عمل چاہیے تمہیں
بھائی جگہ مزاروں کی پہچانتا ہوں میں
جو ہو گا اِس زمیں پہ وہ سب جانتا ہوں میں

ہے منکشف امام پہ احوالِ بحر و بر   حق نے کیا ہے واقفِ اسرارِ خشک و تر
صدمہ ہے دل پہ کیا میں کہوں تم سے بے خبر   قبضہ تمہارا آتا ہے قیامت ہے نہر پہ

دولت مٹے گی یاں اسدِ کردگار کی
بھیا یہی جگہ ہے تمہارے مزار کی

ہوتا ہے کیا ، ہزار کمیں ساکنانِ شام بخشا ہے تم کو خالقِ اکبر نے یہ مقام
کہتے ہیں اس زمیں پہ ملک آکے صبح و شام یاں ہوگی قبرِ حضرتِ عباسِ نیک نام
دیں دار گرد قبر کے بستی بسائیں گے
شہروں سے لوگ یاں کی زیارت کو آئیں گے

سچ ہے کہ ہاتھ آپ کے آئی ہے کیا جگہ پیارے ہمارے بھائی کو بھائی ہے کیا جگہ
ٹھنڈی ہوا میں سونے کو پائی ہے کیا جگہ کیا سبزہ کیا نفیس ترائی ہے کیا جگہ
لنگر ہو تم نجات کی کشتی کے واسطے
لازم ہے قرب نہرِ بہشتی کے واسطے

آؤ اب اپنی قبر کی جا ہم تمہیں دکھائیں مقتل میں نخل بھی نہیں سایہ کہاں سے لائیں
قسمت میں یہ لکھا ہے کہ جنگل کی دھوپ کھائیں چالیس روز تک نہ کفن اور نہ غسل پائیں
میداں ہو اور لاشِ حسینؑ غریب ہو
بھائی قریب ہو نہ ترائی قریب ہو

عباس آبدیدہ ہوئے سُن کے یہ کلام بھائی کا ہاتھ ہاتھ میں لیکر چلے امام
فرمایا واں پہونچ کے جو تھا قتل کا مقام دیکھو حسینؑ ہوگا یہیں قتل تشنہ کام
بھائی مقامِ خیمۂ آلِ عبا ہے وہ
باہر ہے جو نشیب سے تربت کی جا ہے وہ

رونے لگے پکار کے عباسِ نامدار شہ نے کہا کہ ضبط کرو تم پہ میں نثار
سُن پائے گی جو زینبؑ بیکس یہ حالِ زار مرجائے گی تڑپ کے ابھی وہ جگر فگار

مجھ کو بہت خیال ہے زہرا کی جائی کا
مرنا کوئی بہن نہ سُنے اپنے بھائی کا

قدموں پہ سر جھکا کے یہ بولا وہ نیک نام
ارشاد یہ تو کیجئے اے قبلۂ انام
پہلے مرے گا آپ سے یہ باوفا غلام
رو کر کہا کہ ہاں یہی ہوئے گا لاکلام
مجبوری ہے کہ بھائی کو ہاتھوں سے کھوئیں گے
روؤ گے تم نہ ہم کو، ہمیں تم کو روئیں گے

مژدہ یہ سُن کے شاد ہوا وہ اسیرِ غم
سجدہ کیا کہ بھائی سے پہلے مریں گے ہم
ریتی پہ آکے گاڑ دیا شیر نے عَلَم
برپا ہوئے خیامِ شہِ آسماں حشم
ذرّے نجوم بن گئے سارے زمین پر
اُترے خدا کے عرش کے تارے زمین پر

خیموں کا نصب ہونا اور اہلِ حرم کا محملوں سے اُتر کر داخلِ خیمہ ہونا

کھینچا فلک پہ خیمۂ زرنگار گوں نے
روشن ہوئے کلس کی تجلّی سے دشت و دَر
تارِ شعاع تھے کہ طنابیں تھیں جلوہ گر
پردہ حرم کا تھا کہ قناتیں اِدھر اُدھر
جنگل کا اوج ہو گیا خیمہ کی شان سے
پلّہ زمیں کا اُٹھ کے ملا آسمان سے

تھا اُس کے ارتفاع میں کرسی کا سب جو طَور
سکّانِ عرش دیکھتے تھے فرش کو بغور
شمسے کا اوج اوج تھا خیمے کا دَور دَور
گویا کہ آسماں کے تلے آسماں تھا اَور
سر جا ملا جو شمسۂ کیواں جناب کا
سونا اُتر گیا ورقِ آفتاب کا

خیمے میں جا چکے جو حرم باصد احترام ڈیوڑھی پہ آ کھڑے ہوئے عباسِ نیک نام
کمریں اِدھر کھلیں اُدھر اُتری سپاہِ شام بھائی کو لے کے خیمے میں داخل ہوئے امام
اُمڈا تھا دل جو سبطِ نبیؐ کی جدائی سے
زینب لپٹ کے رونے لگی چھوٹے بھائی سے

آنکھوں میں اشک بھر کے یہ بولے شہِ زمن صدقہ اُتارو کچھ مرے بھائی پہ اے بہن
تھے دس ہزار مستعدِ جنگ تیغ زن جیتا میں! زخمی ہوتے جو عباسِ صف شکن
آزردہ ہیں کہ ہاتھ سے دریا نکل گیا
دیکھو ابھی تلک نہیں ابرو سے بل گیا

لے کر بلائیں کہنے لگی وہ جگر فگار کیا جی میں آ گئی تھی یہ بھیا بہن نثار
محمل میں مَیں تو سر کو پٹکتی تھی بار بار صدقے کروں وہ نہر لڑیں جس پہ نابکار
پیارا رہے اُنھیں جنھیں پانی عزیز ہے
بھیا ہمیں تمہاری جوانی عزیز ہے

کہنے لگی یہ زوجۂ عباسِ خوش بیان غصے میں اِن کو کچھ نہیں رہتا کسی کا دھیان
ہر بات میں ہے شیرِ الٰہی کی آن بان یہ جان کو بھلا کبھی سمجھے ہیں اپنی جان
آتا ہے غیظ جب تو نہ کھاتے نہ پیتے ہیں
یہ تو فقط حسینؑ کے صدقے میں جیتے ہیں

فرمایا شہ نے بھائی سے اب کھولیے کمر زینبؑ نے لے لی ہاتھ سے شمشیر اور سپر
بیٹھے نہ تھے ابھی کہ یہ اکبر نے دی خبر فوج اور آئی شام سے یا شاہِ بحر و بر
مجمع غضب سپاہ کا دریا کے پاس ہے
شہ نے کہا کہ ہوئے، تمھیں کیا ہراس ہے (جب کربلا میں .....)

خیمہ میں اُترے یاں تو شہِ عرش بارگاہ　　آ آ کے اُس طرف بھی اُترنے لگی سپاہ
کوسوں علَم کھُلے تھے جدھر کیجیے نگاہ　　یاں تک کہ بند ہو گئی چاروں طرف سے راہ
فوجوں سے تا بہ صبح زمیں رَن کی بھر گئی
اک رات میں چڑھی ہوئی ندی اُتر گئی

پسرِ سعد کی آمد

اس کثرتِ سپاہ پہ ناگہ ہوئی یہ دھوم　　آ پہونچا شام سے پسرِ سعدِ نحس شوم
جس کے جِلَو میں لاکھ سواروں کا ہے ہجوم　　اکثر ہیں یکہ تاز جوانانِ شام و روم
بس کھُل گیا نہ طورِ صفائی کا ہوئے گا
اب کل سے بندوبست لڑائی کا ہوئے گا

جنگی وہ رومیوں کے پرے شامیوں کے دَل　　خوفِ خدا نہ جن کو نہ اندیشۂ اجل
مکّار و اہلِ نار و دغا باز و پُر دغل　　شکلیں مہیب، دیو سے قد، اَبروؤں پہ بل
بدخواہِ خاندانِ رسالت پناہ تھے
ایسے جلے ہوئے تھے کہ چہرے سیاہ تھے

تلواریں کھینچے بڑھ کے جمے دو طرف سوار　　غُل ہو گیا سلامی کے باجوں کا ایک بار
ڈنکے کی دَم بدم تھی صدا آسماں کے پار　　آگے بڑھے جِلَو سے نقیبوں کی تھی پکار
گھوڑوں پہ گرد و پیش رئیسانِ شام تھے
زرّیں کمر جِلَو میں کئی سو غلام تھے

اُترا قریبِ خیمہ فرس سے وہ خیرہ سر　　سر پہ لگایا دوڑ کے خادم نے چترِ زر
پہلے تو اپنی فوج پہ ظالم نے کی نظر　　بولا کسی سے پھر وہ سوئے نہر دیکھ کر

خیمہ ہے کس طرف کو شہِ خوش خصال کا
دریا پہ تو عمل نہیں زہرا کے لال کا

خولی نے تب کہا کہ ہماری طرف ہے نہر — آئے تھے یاں اُترنے کی خاطر امامِ دہر
فرماتے تھے یہ نہر تو ہے میری ماں کا مہر — ہم نے اُٹھا دیا اُنھیں لیکن بجبر و قہر
عباس مستعد تھے سبھوں سے لڑائی کو
شبیرؑ پھیر لے گئے سمجھا کے بھائی کو

وہ دھوپ میں ہے خیمۂ زنگاریِ حسینؑ — راحت نہ رات کو ہے کوئی دم نہ دن کو چین
پہروں علیؑ کی بیٹیاں روتی ہیں کر کے بَین — آفت میں مبتلا ہے محمدؐ کا نورِ عین
بچوں کی مارے پیاس کے حالت عجیب ہے
خیمہ نہ سایہ میں ہے نہ دریا قریب ہے

بولا شقی کہ کتنی ہے فوجِ شہِ اُمم — سُنتے تھے واں سپاہِ حسینی کی دھوم ہم
اُس نے کہا حسینؑ کے یاور بہت ہیں کم — فاقوں کے مارے دم میں کسی کے نہیں ہے دم
ایسی نہ فوج کچھ ہے نہ ایسے نشان ہیں
میں نے تو خود گِنا ہے اِکاسی جوان ہیں

ہے اِک علم، یہ قلتِ لشکر کا ہے نشاں — یہ حال ہے لُٹا ہوا جیسے ہو کارواں
اُردو میں جنسِ غم کے سوا جنس ہے گراں — غلّہ کی یہ کمی ہے کہ ہے قحطِ آب و ناں
اسوار بھی قلیل پیادے بھی تھوڑے ہیں
کُل ستّرہ تو اونٹ ہیں اور بیس گھوڑے ہیں

یہ سب غلط سُنا تھا کہ ہے لشکرِ کثیر — کچھ نوجواں ہیں طفل ہیں کچھ اور کچھ ہیں پیر
ہیں اُن میں سات آٹھ تو لڑکے، کئی صغیر — پس جائیں گے وہ ٹاپوں سے ہنگامِ دار و گیر

کیا چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی طاقت دکھائیں گے
اُن سے تو نیچے بھی سنبھالے نہ جائیں گے

کیا جانے دل میں سوچے تھے کیا شاہِ کربلا
مقتل میں کھینچ کر انھیں لے آئی ہے قضا
لشکر تو یہ قلیل اور اس فوج سے وغا
عمریں ہیں چھوٹی چھوٹی بھلا وہ لڑیں گے کیا
کچھ آزمودہ کارِ نبرد کچھ مسن نہیں
اُن کے ابھی تو گھر سے نکلنے کے دن نہیں

ہم شکلِ مصطفٰےؐ کو تو اٹھارھواں ہے سال
تیرہ برس کا ہے ابھی شبّر کا نونہال
تو دس برس کے ہوئیں گے زینبؑ کے دونوں لال
ہاں اک جواں ہیں حضرتِ عباسؑ خوش خصال
چھوٹے ہیں اور سب کوئی ان میں جواں نہیں
خط اک طرف مَسیں بھی کسی کی عیاں نہیں

سُنتا ہوں میں ہیں دو پسرِ شاہِ نامدار
بیمار اُن میں ایک ہے اور ایک شیرخوار
زینب کے دو ہیں تین حسنؑ کے ہیں گلعذار
دس ہیں عقیل و مسلم و حیدرؑ کے یادگار
زہرا کے جان و دل ہیں محمدؐ کے پیارے ہیں
یہ سترہ تو چاند ہیں باقی ستارے ہیں

بتیس سب سوار شہِ دیں کے پاس ہیں
اب رہ گئے پیادے سو دو کم پچاس ہیں
آفت میں مبتلا ہیں مگر با حواس ہیں
غازی ہیں سرفروش ہیں اور حق شناس ہیں
کھانے کا ہے خیال نہ پانی کی فکر ہے
سجدے ہیں اور دعائیں ہیں اور حق کا ذکر ہے

بولا وہ تب کہ ہوں گے جواں یاں کے کَے ہزار
خولی نے کی یہ عرض کہ ممکن نہیں شمار
ہیں تین چار کوس کے گردے میں سب سوار
ایک اک جواں ہے رستمِ میدانِ کارزار

کیا کوئی لڑ سکے گا قیامت کی فوج ہے
لشکر کی ہیں صفیں کہ سمندر کی موج ہے
پیدل ہیں اک طرف تو رسالے ہیں اک طرف
خنجر ہیں ایک سمت تو بھالے ہیں اک طرف
جاں باز ہاتھ قبضوں پہ ڈالے ہیں اک طرف
اور دس ہزار برچھیوں والے ہیں اک طرف
سب لوگ فکرِ قتلِ شہنشاہِ دیں میں ہیں
کھینچے ہوئے کمانوں کو سرکش کمیں میں ہیں
ہاتھوں میں پہلوانوں کے ہیں گرزِ گاؤ سر
ضربت سے جن کی ٹوٹتی ہے کوہ کی کمر
ہر جا بچھی ہوئی ہیں کمندیں ادھر ادھر
کالی گھٹا سی چھائی ہے ڈھالوں کی نہر پر
سب لوگ جا بجا پئے قتل و ستیز ہیں
تیغیں بھی ہیں اُپی ہوئی خنجر بھی تیز ہیں
بھالا ہلا کے کوئی یہ کہتا ہے بار بار
نوک اس کی سینۂ علی اکبر کے ہوگی پار
کہتا ہے کس غرور سے اک شام کا سوار
آئے تو رن میں حضرتِ شبیر کا یادگار
اب کوئی دم میں گھر کی حسن کے صفائی ہے
تلوار آج زہر میں میں نے بجھائی ہے
تیغا اٹھا کے کوئی یہ کہتا ہے بدمزاج
قیمت ہے اس کی شام کا اور روم کا خراج
دریا پہ اُن کو لائے تو پانی کی احتیاج
عباس نامدار کے کاٹوں گا ہاتھ آج
جب دولتِ علیؑ کو قضا لوٹ جائے گی
فرزندِ فاطمہؑ کی کمر ٹوٹ جائے گی
کہتا ہے کوئی تیر کو چلّے میں جوڑ کے
گزرے گا یہ گلا علی اصغر کا توڑ کے
سوئیں گے جب زمیں پہ جھولے کو چھوڑ کے
دونوں کڑے اتاروں گا پہنچے مروڑ کے

اصغر کا طوق اپنے پسر کو پنھاؤں گا
سوغات کربلا سے یہی لے کے جاؤں گا
سُنتا تھا میں کہ کہتا تھا اک شخص بر ملا — گھوڑے سے جب گریں گے شہنشاہِ کربلا
جو فاطمہؑ کے دُودھ کی دھاروں سے ہے پلا — چھاتی پہ چڑھ کے کاٹوں گا اُس شخص کا گلا
وارث نہ کوئی ہوئے گا سیّد کی لاش کا
لُوٹوں گا سب لباس تنِ پاش پاش کا
کوفے کے لوگ کرتے ہیں آپس میں یہ سخن — اب بعد فتح بازوئے زینبؑ ہے اور رسن
سر پہ ردا نہ ہوگی کہ بھائی کو دے کفن — خیمہ جلا کے لُوٹیں گے اسباب پنجتن
ہے آرزو کہ دولتِ آلِ عبا ملے
دیکھیں کسے علیؑ کی بہو کی ردا ملے
بولا خبر یہ سُن کے وہ بانیٔ ظلم و جور — کل تک ابھی تو شام سے آئے گی فوج اور
حاکم ہیں آج زیرِ فلک ہے ہمارا دور — سر کاٹ لیں گے صلح کا ہوگا اگر نہ طور
فرصت اب ایک دم کی نہ ہاں دو حسینؑ کو
بیعت اگر کریں تو اماں دو حسینؑ کو (طے کر چکے حسین .....)

ساتویں محرم سے شبِ عاشور تک

آمد اسی طرح رہی لشکر کی روز و شب — نرغے میں آ گیا پسرِ سیّد العرب
گرمی میں ساتویں سے ہوئی شدّتِ تعب — پانی مسافروں پہ ہوا بند ہے غضب
مُرجھا گیا چمن شہِ گردوں جناب کا
شورِ آٹھویں سے ہونے لگا آب آب کا

غش تھے نہم کو پیاس سے اطفالِ شاہِ دیں   جز آبِ اشک پانی کا قطرہ نہ تھا کہیں
تھا دودھ خشک چھٹی تھی بانوئے حزیں   دم توڑتا تھا جھولے میں اصغر سا نازنیں
خندق میں گرد خیمے کے آتش بھڑکتی تھی
باقر تڑپ رہا تھا سکینہ بلکتی تھی

رونے میں وہ پہاڑ سا دن جب ہوا تمام   آئی سیہ بلا کی طرح شامِ تیرہ فام
شب تھی مسافروں کے لئے موت کا پیام   غل تھا کہ ایک رات کے مہماں ہیں امام
بل لو جنابِ فاطمہؑ کے نورِ عین سے
خالی سحر کو ہوگا زمانہ حسینؑ سے   (جب کربلا میں داخلہ.....)

روشن تھیں فرشِ پاک پہ شمعیں جو دُور دُور   جلتا تھا نور دیکھ کے اُن کا چراغِ طور
شعلہ پری کا رُخ تو دھواں رشکِ زلفِ حور   جاری تھے اشکِ گرم کہ افسردہ تھی حضور
ہر چند گریہ کرنے کی پروانگی نہ تھی
ہو ضبط ایسی آگ دلوں میں لگی نہ تھی

مسند پہ جلوہ گر تھے شہنشاہِ خاص و عام   بیٹھی تھیں سر جھکائے ہوئے بیبیاں تمام
حضرت بہن سے کرتے تھے یہ درد کے کلام   کل شب کو ہوگا خلد میں زینب یہ تشنہ کام
دولت لٹے گی بادشہِ کائنات کی
یہ رات آخری ہے ہماری حیات کی

صبحِ فراق آتی ہے اے مصطفٰے کی آل   کل خالی ہوگا خانۂ محبوبِ ذوالجلال
مہماں ہے اور آج کی شب فاطمہؑ کا لال   کچھ اپنا غم نہیں مجھے تم سب کا ہے خیال
نرغہ ہے اُن کا جن کو جفائیں پسند ہیں
بھیجوں کہاں یتیم کو کہ راہیں بھی بند ہیں

واحسرتا کہ آج رسولِ زمن نہیں — افسوس فاطمہؑ نہیں خیبر شکن نہیں
صدمہ یہ ہے کہ خلق میں بھائی حسنؑ نہیں — آفت کا سامنا ہے اور اپنا وطن نہیں
اُن سے وداع ہونے کو جب آئے گا حسینؑ
کس کو سپرد کر کے تمہیں جائے گا حسینؑ

ہوتے حسنؑ بھی گر، تو نہ تھا فکر کا مقام — گھر کو سنبھالتے وہ، جو مرتا یہ تشنہ کام
اشفاق یاد آتے ہیں بھائی کے صبح و شام — جس دن چھٹے وہ، ہم تو اُسی دن ہوئے تمام
آنکھوں پہ بھتیجے کی نشانی لئے ہیں ہم
قاسم کو دیکھ دیکھ کے اب تک جئے ہیں ہم

تم بھی تو تھیں جو بھائی نے ہنگامِ انتقال — قاسم کے حق میں مجھ سے کہا تھا بصد ملال
بھولا نہیں وہ اُن کا سخن فاطمہؑ کا لال — اس وقت تک ہے مجھ کو اُسی بات کا خیال
کیوں کر رکھوں عزیز نہ اُس نورِ عین کو
سب یاد ہے حسنؑ کی وصیت حسینؑ کو

ہر چند غم کی فصل میں شادی کا کیا ہے کام — رونے کی یہ جگہ ہے خوشی کا نہیں مقام
پھر کچھ نہ ہو سکے گا جو ہم کل ہوئے تمام — لازم ہے عقد کا ہو اسی شب کو اہتمام
ہنگامِ صبح دیکھئے کیا انقلاب ہو
ایسا نہ ہو کہ بھائی سے مجھ کو حجاب ہو

بانو سے کہہ دو بیٹی کو اپنی دلہن بنائیں — بھابی کہاں ہیں بیٹے کو دولہا بنا کے لائیں
بھائی حسنؑ کا فاخرہ خلعت کوئی پنھائیں — اُس مہروش کو مسندِ زرتار پر بٹھائیں
شادی ہے عقدِ قاسمِ یوسف جمال کی
ہم بھی بہار دیکھ لیں اُس نونہال کی

قاسم کی ماں یہ سُن کے نہ کچھ کر سکیں عدول
حکمِ امام دیں بہ دل و جاں کیا قبول
شربت نہ تھا نصیب، نہ مہندی نہ ہار پھول
دولھا بنایا بیٹے کو لیکن رہیں ملول
تارہ آنسوؤں کا دونوں کی غربت پہ بندھ گیا
آخر کو عقدِ مہرِ شہادت پہ بندھ گیا

یک جا ہوئے وہ رشتۂ زہرا کے دو گہر
بیٹھے اُس ایک بُرج میں دو چاند ہم دگر
دو صبحیں شب کو ایک جگہ آ گئیں نظر
دو آفتاب نور ہوئے ساتھ جلوہ گر
دو گُل ریاضِ مرتضوی کے بہم ہوئے
روشن کُنِ حرم وہ چراغِ حرم ہوئے

دولھا دلہن کو دیکھ کے مسند پہ ایک بار
سب نے بلائیں دونوں کی لیں ہو کے بیقرار
دولھا پہ کوئی، کوئی دلہن پہ ہوئی نثار
شبّر کو یاد کر کے کوئی روئی زار زار
شادی و غم کا ساتھ تھا قاسم کے بیاہ میں
باقی جو رات تھی وہ کٹی اشک و آہ میں (سبحہ نجوا روش ....)

صبحِ کارزار

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے
جلوہ کیا سحر کے رُخِ بے حجاب نے
دیکھا سوئے فلک شہِ گردوں رکاب نے
مُڑ کر صدا رفیقوں کو دی اُس جناب نے
آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو
اُٹھو فریضۂ سحری کو ادا کرو

ہاں غازیو یہ دن ہے جدال و قتال کا
یاں خوں بہے گا آج محمّد کی آل کا
چہرہ خوشی سے سُرخ ہے زہرا کے لال کا
گذری شبِ فراق دن آیا وصال کا

ہم وہ ہیں غم کریں گے ملک جن کے واسطے
راتیں تڑپ کے کاٹی ہیں اس دن کے واسطے

یہ صبح ہے وہ صبح مبارک ہے جس کی شام — یاں سے ہوا جو کوچ تو ہے خلد میں مقام
کوثر پہ آبرو سے پہنچ جائیں تشنہ کام — لکھے خدا نماز گزاروں میں ان کا نام
سب ہیں وحیدِ عصر یہ غل چار سو اٹھے
دنیا سے جو شہید اٹھے سرخرو اٹھے

یہ سن کے بستروں سے اٹھے وہ خدا شناس — اک اک نے زیبِ جسم کیا فاخرہ لباس
شانے محاسنوں میں کئے سب نے بے ہراس — باندھے عمامے آئے امامِ زماں کے پاس
رنگیں عبائیں دوش پہ، کمریں کسے ہوئے
مشک و زباد و عطر میں کپڑے بسے ہوئے

سوکھے لبوں پہ حمدِ الٰہی رخوں پہ نور — خوف و ہراس و رنج و کدورت دلوں سے دور
فیاض، حق شناس، اولوالعزم، ذی شعور — خوش فکر و بذلہ سنج و ہنرپرور و غیور
کانوں کو حسنِ صوت سے حظ بر ملا ملے
باتوں میں وہ نمک کہ دلوں کو مزا ملے

سادات بردبار فلک مرتبت دلیر — عالی منش، سبا میں سلیماں، وغا میں شیر
گردانِ دہر ان کی زبردستیوں سے زیر — فاقے سے تین دن کے مگر زندگی سے سیر
دنیا کو ہیچ و پوچ سراپا سمجھتے تھے
دریا دلی سے بحر کو قطرہ سمجھتے تھے

تقریر میں وہ رمز و کنایہ کہ لاجواب — نکتہ بھی منہ سے گر کوئی نکلا تو انتخاب
گویا دہن کتابِ بلاغت کا ایک باب — سوکھی زبانیں شہدِ فصاحت سے کامیاب

لبوں پہ شاعرانِ عرب تھے مرے ہوئے
لپٹے لبوں کے وہ کہ نمک سے بھرے ہوئے

لب پر ہنسی، گلوں سے زیادہ شگفتہ رُو   پیدا تنوں سے پیرہنِ یوسفی کی بُو
غلماں کے دل میں جن کی غلامی کی آرزو   پرہیزگار و زاہد و ابرار و نیک خُو
پتھر میں ایسے لال صدف میں گہر نہیں
حُوروں کا قول تھا کہ ملک ہیں بشر نہیں

پانی نہ تھا وضو جو کریں وہ فلک جناب   پر تھی رُخوں پہ خاکِ تیمم سے طرفہ آب
باریک ابر میں نظر آتے تھے آفتاب   ہوتے ہیں خاکسار غلامِ ابو تُراب
مہتاب سے رُخوں کی صفا اور ہو گئی
مٹی سے آئینوں میں جِلا اور ہو گئی

خیمے سے نکلے شہ کے عزیزانِ خوش خصال   جن میں کئی تھے حضرتِ خیر النسا کے لال
قاسم سا گلبدن، علی اکبر سا خوش جمال   اک جا عقیل و مسلم و جعفر کے نونہال
سب کے رُخوں کا نور سپہرِ بریں پہ تھا
اٹھارہ آفتابوں کا غنچہ زمیں پہ تھا

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور   دیکھے تو غش کرے اَرِنی گوئے اوجِ طور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور   وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور
گلشن خجل تھے وادیٔ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوا میں سبزۂ صحرا کی وہ لہک   شرمائے جس سے اطلسِ زنگاریٔ فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک   ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک

ہیرے خجل تھے گوہرِ یکتا نثار تھے
پتّے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

قربانِ صنعتِ قلمِ آفریدگار   تھی ہر ورق پہ صنعتِ ترصیع آشکار
عاجز ہے فکرتِ شعرائے ہنر شعار   اِن صنعتوں کو پائے کہاں عقلِ سادہ کار
عالم تھا محو قدرتِ ربِّ عباد پر
مینا کیا تھا وادیٔ مینو سواد پر

وہ نور اور وہ دشت سہانا سا وہ فضا   درّاج و کبک و تیہو و طاؤس کی صدا
وہ جوشِ گل وہ نالۂ مرغانِ خوش نوا   سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا
پھولوں کے سبز سبز شجر سرخپوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبدِ گلفروش تھے

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار   پھولوں پہ جا بجا وہ گہر ہائے آبدار
اُٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار   بالائے نخل ایک جو بلبل تو گُل ہزار
خواہاں تھے نخلِ گلشنِ زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دئے تھے کٹورے گلاب کے

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم   کُوکُو کا شور نالۂ حق سرّہٗ کی دھوم
سبحانَ ربّنا کی صدا تھی علی العموم   جاری تھے وہ جو اُن کی عبادت کے تھے رسوم
کچھ گُل فقط نہ کرتے تھے ربِّ علا کی مدح
ہر خار کو بھی نوکِ زباں تھی خدا کی مدح

چیونٹی بھی ہاتھ اُٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار   اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار
یا حیُّ یا قدیر کی تھی ہر طرف پکار   تسبیح تھی کہیں کہیں تہلیلِ کردگار

طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

کانٹوں میں اک طرف تھے ریاضِ نبی کے پھول
خوشبو سے جن کی خلد تھا جنگل کا عرض و طول

دنیا کی زیب، زینتِ کاشانۂ بتولؑ
وہ باغ تھا لگا گئے تھے خود جسے رسولؐ

ماہِ عزا کے عشرۂ اوّل میں لٹ گیا
وہ باغیوں کے ہاتھ سے جنگل میں لٹ گیا

اللہ رے خزاں کے دن اس باغ کی بہار
پھولے سماتے تھے نہ محمدؐ کے گلعذار

دولہا بنے ہوئے تھے اجل تھی گلوں کا ہار
جاگے وہ ساری رات کے وہ نیند کا خمار

راہیں تمام جسم کی خوشبو سے بس گئیں
جب مسکرائے پھولوں کی کلیاں بکس گئیں

وہ دشت اور وہ خیمۂ زنگار گوں کی شاں
گویا زمیں پہ نصب تھا اک تازہ آسماں

بیچو بیچ سپہر بریں جس کا سائباں
بیت العتیق، دین کا مدینہ، جہاں کی جاں

اللہ کے حبیب کے پیارے اسی میں تھے
سب عرشِ کبریا کے ستارے اسی میں تھے

گردوں پہ ناز کرتی تھی اس دشت کی زمیں
کہتا تھا "آسمانِ دہم" چرخِ ہفتمیں

پردے تھے رشکِ پردۂ چشمانِ حورِ عیں
تاروں سے تھا فلک اسی خرمن کا خوشہ چیں

دیکھا جو نور شمسۂ کیواں جناب پر
کیا کیا ہنسی ہے صبحِ گلِ آفتاب پر

اذانِ صبح اور نماز

ناگاہ چرخ پر خطِ ابیض ہوا عیاں
تشریف جا نماز پہ لائے شہِ زماں
سجادے بچھ گئے عقب شاہِ انس و جاں
صوتِ حسن سے اکبرِ مہرو نے دی اذاں
ہر اک کی چشم آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی
گویا صدا رسولؐ کی کانوں میں آ گئی

چپ تھے طیور جھومتے تھے وجد میں شجر
تسبیح خواں تھے برگ و گل و غنچہ و ثمر
محوِ ثنا کلوخ و نباتات و دشت و در
پانی سے منہ نکالے تھے دریا کے جانور
اعجاز تھا کہ دلبرِ شبیر کی صدا
ہر خشک و تر سے آتی تھی تکبیر کی صدا

ناموسِ شاہ روتے تھے خیمے میں زار زار
چپکی کھڑی تھی صحن میں بانوئے نامدار
زینب بلائیں لے کے یہ کہتی تھی بار بار
صدقے نمازیوں کے مؤذن کے میں نثار
کرتے ہیں یوں ثنا و صفت ذو الجلال کی
لوگو اذاں سنو مرے یوسف جمال کی

یہ حُسنِ صوت اور یہ قرأت یہ شد و مد
حقا کہ افصح الفصحا ہے انھیں کا جد
گویا ہے لحن حضرتِ داؤدِ باخرد
یارب رکھ اس صدا کو زمانے میں تا ابد
شعبے صدا میں پنکھڑیاں جیسے پھول میں
بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسولؐ میں

میری طرف سے کوئی بلائیں تو لینے جائے
عین الکمال سے تجھے بچے خدا بچائے
وہ خوش بیاں کہ جس کی طلاقت دلوں کو بھائے
دو دو دن ایک بوند بھی پانی کی وہ نہ پائے

غربت میں پڑ گئی ہے مصیبت حسینؑ پر
فاقہ یہ تیسرا ہے مرے نورِ عین پر

صف میں ہوا جو نعرۂ قد قامت الصلوٰۃ — قائم ہوئی نماز اُٹھے شاہِ کائنات
وہ نور کی صفیں وہ مصلّی ملک صفات — قدموں سے جن کے ملتی تھی آنکھیں رہِ نجات

جلوہ تھا تا بہ عرشِ معلّٰے حسینؑ کا
مصحف کی لوح تھی کہ مصلّٰے حسینؑ کا

قرآں کھلا ہوا کہ جماعت کی تھی نماز — بسم اللہ جیسے آگے ہو یوں تھے شہِ حجاز
سطریں تھیں یا صفیں عقب شاہِ سرفراز — کرتی تھی خود نماز بھی اُن کی ادا پہ ناز

صدقے سحر بیاض پہ بین السطور کی
سب آیتیں تھیں مصحفِ ناطق کے نور کی

باہم تکبروں کی صدائیں وہ دل پسند — کرّوبیانِ عرش تھے سب جس سے بہرہ مند
ایماں کا نور چہروں پہ تھا چاند سے دوچند — خوفِ خدا سے کانپتے تھے سب کے بند بند

خم گردنیں تھیں سب کی خضوع و خشوع میں
سجدوں میں چاند تھے مہِ نو تھے رکوع میں (جب قطع کی مسافت...)

سیدھے کبھی الف کی طرح تھے وہ خوش خصال — جھک جاتے تھے رکوع میں گاہے بشکلِ دال
خم ہو گئے سجود میں گر صورتِ ہلال — پیشانیوں سے صاف عیاں نورِ ذوالجلال

حق سے دعا قنوت میں کوثر کے جام کی
طاعت خدا کی تھی تو اطاعت امام کی

وہ چاند سے سفید عمامے رخوں پہ نور — دیکھے سے جن کے سیر کبھی ہو نہ چشمِ حور
دیندار و حق پرست و دل آگاہ و باشعور — کم ریں کسے جہاد پہ راحت دلوں سے دور

لب پر درود، اشکوں سے آنکھیں بھری ہوئیں
تلواریں سجدہ گاہوں کے آگے دھری ہوئیں

حبِّ حسینؑ دل میں زبانوں پہ ذکرِ حق نہ فکر کچھ عیال کی نہ مرگ کا قلق
دیندار ایسے پھر نہ ہوئے زیرِ نہ طبق حقا کہ سب صحیفۂ ایماں کے تھے ورق

کس آفتِ عظیم میں ثابت قدم رہے
آقا کا دم بھرا کئے جب تک کہ دم رہے

اللہ نے دل اُن کے وفا سے بنائے تھے اور جسم پاک خاکِ شفا سے بنائے تھے
سینے خمیرِ صدق و صفا سے بنائے تھے دستِ کرم سخا و عطا سے بنائے تھے

اور لکھ دیا تھا روزِ ازل سرنوشت میں
پہنچیں گے یہ حسینؑ سے پہلے بہشت میں (طے کر چکا جو منزلِ شب ۔۔)

اک صف میں سب محمدؐ و حیدرؑ کے رشتہ دار اٹھارہ نوجواں ہیں اگر کیجیے شمار
پر سب وحیدِ عصر و حق آگاہ و خاکسار پیرو امامِ پاک کے دانائے روزگار

تسبیح ہر طرف تہِ افلاک انھیں کی ہے
جس پر درود پڑھتے ہیں یہ خاک انھیں کی ہے

دنیا سے اٹھ گیا وہ قیام اور وہ قعود اُن کے لئے تھی بندگیِ واجب الوجود
وہ عجز وہ طویل رکوع اور وہ سجود طاعت میں نیست جانتے تھے اپنی ہست و بود

طاقت نہ چلنے پھرنے کی تھی ہاتھ پاؤں میں
گر گر کے سجدے کرگئے تیغوں کی چھاؤں میں

ہاتھ اُن کے جب قنوت میں اُٹھے سوئے خدا خود ہو گئے فلک پہ اجابت کے باب وا
تھرائے آسمان ہلا عرشِ کبریا شہپر تھے دونوں ہاتھ پئے طائرِ دعا

وہ خاکسار محوِ تضرّع تھے فرش پر
روح القدس کی طرح دعائیں تھیں عرش پر

فارغ ہوئے نماز سے جب قبلۂ انام — آئے معانقے کو جوانانِ تشنہ کام
چومے کسی نے دستِ شہنشاہِ خاص و عام — آنکھیں ملیں قدم پہ کسی نے باحترام
کیا دل تھے کیا سپاہِ رشید و سعید تھی
باہم معانقے تھے کہ مرنے کی عید تھی

سجدے میں شکر کے تھا کوئی مردِ باخدا — پڑھتا تھا کوئی حزن سے قرآں کوئی دعا
نعتِ نبیؐ کہیں تھی کہیں حمدِ کبریا — مولاؑ اٹھا کے ہاتھ یہ کرتے تھے التجا
فاقوں پہ تشنہ کامی و غربت پہ رحم کر
یارب مسافروں کی جماعت پہ رحم کر

نادِ علی تھی التعب تھی مناجات تھی ادھر — واں صف کشی و ظلم و تعدّی و شور و شر
کہتا تھا ابنِ سعد یہ جا جا کے نہر پر — گھاٹوں سے ہوشیار ترائی سے باخبر
دو روز سے ہے تشنہ دہانی حسینؑ کو
ہاں مرتے دم بھی دیجو نہ پانی حسینؑ کو (جب قطع کی مسافت......)

تھا بس کہ روزِ قتلِ شہِ آسماں جناب — نکلا تھا خوں ملے ہوئے چہرے پہ آفتاب
تھی نہرِ علقمہ بھی خجالت سے آب آب — روتا تھا پھوٹ پھوٹ کے دریا میں ہر حباب
پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

[illegible] میں سامانِ قتلِ شاہ — ہر سو بچھا رہا تھا صفیں شمرِ روسیاہ
[illegible] تھا یہ تھی کثرتِ سپاہ — ممکن نہ تھا کہ ہو گزرِ طائرِ نگاہ

سب مستعد تھے قتلِ شہِ کائنات پر
طوفان آپ تیغ اٹھاتا تھا فرات پر (پھولا شفق سے چرخ پہ۔۔۔)

فوجِ یزید کی سمت سے تیروں کی آمد

بیٹھے تھے جا نماز پہ شاہِ فلک سریر ناگہ قریب آ کے گرے تین چار تیر
دیکھا ہر اک نے مڑ کے سوئے لشکرِ شریر عباسؑ اٹھے تول کے شمشیرِ بے نظیر
پروانے تھے سراجِ امامت کے نور پر
روکی سپر حضورِ کرامت ظہور پر

اکبرؑ سے مڑ کے کہنے لگے سرورِ زماں باندھے ہے سرکشی پہ کمر لشکرِ گراں
تم جا کے کہہ دو خیمے میں یہ اے پدر کی جاں بچوں کو لے کے صحن سے ہٹ جائیں بیبیاں
غفلت میں تیر سے کوئی بچہ تلف نہ ہو
ڈر ہے مجھے کہ گردنِ اصغرؑ ہدف نہ ہو

کہتے تھے یہ پسر سے شہِ آسماں سریر فضہ پکاری ڈیوڑھی سے اے خلق کے امیر
ہے ہے علیؑ کی بیٹیاں کس جا ہوں گوشہ گیر اصغرؑ کے گاہوارے تک آ کر گرے ہیں تیر
گرمی میں ساری رات یہ گھٹ گھٹ کے روئے ہیں
بچے ابھی تو سرد ہوا پا کے سوئے ہیں

باقر کہیں پڑا ہے سکینہ کہیں ہے غش گرمی کی فصل اور یہ تب و تاب یہ عطش
رو رو کے سو گئے ہیں صغیرانِ ماہوش بچوں کو لے کے یاں سے کہاں جائیں فاقہ کش
یہ کس خطا پہ تیر پیا پے برستے ہیں
ٹھنڈی ہوا کے واسطے بچے ترستے ہیں

اُٹھے یہ شور سُن کے امامِ فلک وقار ڈیوڑھی تک آئے ڈھالوں کو رُخ کے رفیق دیا
فرمایا مُڑکے، چلتے ہیں اب بہرِ کارزار کر لیں کسو جہاد پہ منگواؤ راہوار
دیکھیں فضا بہشت کی دل باغ باغ ہو
اُمت کے کام سے کہیں جلدی فراغ ہو

فوجِ حسینؑ کا عزمِ جہاد

فرما کے یہ حرم میں گئے شاہِ بحر و بر ہونے لگیں صفوں میں کمر بندیاں ادھر
جوشن پہن کے حضرتِ عباسؑ نامور دروازے پہ ٹہلنے لگے مثلِ شیرِ نر
پرتو سے رُخ کے برق چمکتی تھی خاک پر
تلوار ہاتھ میں تھی سپر دوشِ پاک پر
شوکت میں رشکِ تاجِ سلیماں تھا خود سر کلغی پہ لاکھ بار تصدق ہما کے پر
دستانے دونوں فتح کا مسکن ظفر کا گھر وہ رعب الاماں وہ تہور کہ الحذر
جب ایسا بھائی ظلم کی تیغوں میں آڑ ہو
پھر کس طرح نہ بھائی کی چھاتی پہاڑ ہو
خیمے میں جا کے شہ نے یہ دیکھا حرم کا حال چہرے تو فق ہیں اور کھلے ہیں سروں کے بال
زینبؑ کی یہ دعا ہے کہ اے ربِّ ذوالجلال بچ جائے اس فساد سے خیرالنسا کا لال
بانوئے نیک نام کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے
آفت میں ہے مسافرِ صحرائے کربلا بیکس پہ یہ چڑھائی ہے سیّد پہ یہ جفا
غربت میں کٹ گئی جو لڑائی تو ہوگا کیا ان ننھے ننھے بچوں پہ کر رحم اے خدا

فاقوں سے جاں بلب ہیں عطش سے ہلاک ہیں
یارب ترے رسولؐ کی یہ آلِ پاک ہیں

سر پہ نہ اب علیؑ ہیں نہ رسولؐ فلک وقار   گھر لٹ گیا گذر گئیں خاتونِ روزگار
اماں کے بعد روتی حسنؑ کو ہیں سوگوار   دنیا میں اب حسینؑ ہے ان سب کا یادگار
تو داد دے مری کہ عدالت پناہ ہے
کچھ اس پہ بن گئی تو یہ مجمع تباہ ہے

بولے قریب جا کے شہِ آسماں جناب   مضطر نہ ہو دعائیں ہیں تم سب کی مستجاب
مغرور ہیں خطا پہ ہیں یہ خانماں خراب   خود جا کے میں دکھاتا ہوں ان کو رہِ ثواب
موقع نہیں بہن ابھی فریاد و آہ کا
لاؤ تبرکات رسالت پناہ کا

معراج میں رسولؐ نے پہنا تھا جو لباس   کشتی میں لائیں زینبؑ اُسے شاہِ دیں کے پاس
سر پہ رکھا عمامۂ سردارِ حق شناس   پہنی قبائے پاکِ رسولِ فلک اساس
بر میں درست و چست تھا جامہ رسولؐ کا
رومال فاطمہؑ کا عمامہ رسولؐ کا

شملے کے دو سرے جو پڑے تھے بصد وقار   ثابت یہ تھا کہ دوش پہ گیسو پڑے ہیں چار
بل کھا رہا تھا زلفِ سمن بو کا تار تار   جس کے ہر ایک مو پہ خطا و ختن نثار
مشک و عبیر و عود اگر ہیں تو ہیچ ہیں
سنبل کی اصل کیا ہے یہ گیسو کے پیچ ہیں

کپڑوں سے آرہی تھی رسولِ زمن کی بو   دولھا نے سونگھی ہوگی نہ ایسی دولھن کی بو
حیدرؑ کی فاطمہؑ کی حسینؑ و حسنؑ کی بو   پھیلی ہوئی تھی چار طرف پنجتن کی بو

لُنڈھا تھا عطر وادیٔ عنبر سرشت میں
گُل جھومتے تھے باغ میں رضواں بہشت میں

پوشاک سب پہن چکے جب دم شہِ زمن
لے کر بلائیں بھائی کی رونے لگی بہن
چلّائی ہائے آج نہیں حیدرؑ و حسنؑ
اماں کہاں سے لائے تھیں اب یہ بے وطن
رخصت ہے اب رسولؐ کے یوسف جمال کی
صدقے گئی بلائیں تو لو اپنے لال کی

صندوق اسلحہ کے جو کھلوائے شاہ نے
پیٹا منہ اپنا زینبِ عصمت پناہ نے
پہنی زرہ امامِ فلک بارگاہ نے
بازو پہ جوشنیں پڑھے عزّ و جاہ نے
جوہر بدن کے حُسن سے سارے چمک گئے
حلقے تھے جتنے اُتنے ستارے چمک گئے

یاد آگئے علیؑ نظر آئی جو ذوالفقار
قبضے کو چوم کر شہِ دیں روئے زار زار
تولی جو لے کے ہاتھ میں شمشیرِ آبدار
شوکت نے دی صدا کہ تری شان کے نثار
فتح و ظفر قریب ہو نصرت قریب ہو
زیبِ اِس کی تجھ کو ضربِ عدو کی نصیب ہو

تیاریٔ علم اور عون و محمدؑ کے ولولے

باندھی کمر سے تیغ جو زہرا کے لال نے
پھاڑا فلک پہ اپنا گریباں ہلال نے
دستانے پہنے سرورِ قدسی خصال نے
معراج پائی دوش پہ حمزہ کی ڈھال نے
رتبہ بلند تھا کہ سعادت نشان تھی
ساری سپر میں مُہرِ نبوّت کی شان تھی

ہتھیار ادھر لگا چکے آقائے خاص و عام — تیار اُدھر ہوا علم سیدالانام
کھولے سروں کو گرد تھیں سیدانیاں تمام — روتی تھی تھامے چوب علم خواہر امام
تیغیں کمر میں دوش پہ شملے پڑے ہوئے
زینب کے لال زیر علم آ کھڑے ہوئے

گردانے دامنوں کو قبا کے وہ گلعذار — مرفق تک آستینوں کو اُلٹے بصد وقار
جعفر کا رعب، دبدبۂ شیر کردگار — بوٹا سے اُن کے قد پہ نمودار و نامدار
آنکھیں ملیں علم سے پھریرے کو چوم کے
رایت کے گرد پھرنے لگے جھوم جھوم کے

گہ ماں کو دیکھتے تھے کبھی جانب علم — نعرہ کبھی یہ تھا کہ نثار شہ اُمم
کرتے تھے دونوں بھائی کبھی مشورے بہم — آہستہ پوچھتے کبھی ماں سے وہ ذی حشم
کیا قصد ہے علی ولی کے نشان کا
اماں کسے ملے گا علم نانا جان کا

کچھ مشورہ کریں جو شہنشاہ خوش خصال — ہم بھی محق ہیں آپ کو اس کا رہے خیال
پاس ادب سے عرض کی ہم کو نہیں مجال — اس کا بھی خوف ہے کہ نہ ہو آپ کو ملال
آقا کے ہم غلام ہیں اور جاں نثار ہیں
عزت طلب ہیں نام کے اُمیدوار ہیں

بے مثل تھے رسولؐ کے لشکر کے سب جواں — لیکن ہمارے جد کو نبیؐ نے دیا نشاں
خیبر میں دیکھتا رہا منہ لشکر گراں — پایا علم علیؑ نے مگر وقت امتحاں
طاقت میں کچھ کمی نہیں گو بھوکے پیاسے ہیں
پوتے انھیں کے ہم ہیں انھیں کے نواسے ہیں

جنابِ زینبؑ کی بیٹوں کو فہمائش

زینبؑ نے تب کہا کہ تمہیں اس سے کیا ہے کام
کیا دخل مجھ کو مالک و مختار ہیں امام
دیکھو نہ کیجو بے ادبانہ کوئی کلام
بگڑوں گی میں جو لوگے علم کا زباں سے نام
لو جاؤ بس کھڑے ہو الگ ہاتھ جوڑ کے
کیوں آئے ہو یہاں علی اکبر کو چھوڑ کے

سر کو ہٹو بڑھو نہ کھڑے ہو علم کے پاس
ایسا نہ ہو کہ دیکھ لیں شاہِ فلک اساس
کھوتے ہو اور آئے ہوئے تم مرے حواس
بس قابلِ قبول نہیں ہے یہ التماس
رونے لگو گے تم جو بُرا یا بھلا کہوں
اس ضد کو بچپنے کے سوا اور کیا کہوں

عمریں قلیل اور ہوس منصبِ جلیل
اچھا نکالو قد کے بھی بڑھنے کی کچھ سبیل
ماں صدقے جائے گرچہ یہ ہمت کی ہے دلیل
ہاں اپنے ہم سنوں میں تمہارا نہیں عدیل
لازم ہے سوچے غور کرے پیش و پس کرے
جو ہو سکے نہ کیوں بشر اس کی ہوس کرے

ان ننھے ہاتھوں سے اُٹھے گا یہ علم
چھوٹے قدوں میں سب سے سنوں میں سبھوں سے کم
نکلیں تنوں سے سبطِ نبیؐ کے قدم پہ دم
عمدہ یہی ہے بس یہی منصب یہی حشم
رخصت طلب اگر ہو تو یہ میرا کام ہے
ماں صدقے جائے آج تو مرنے میں نام ہے

پھر تم کو کیا بزرگ تھے گر فخرِ روزگار
زیبا نہیں ہے وصفِ اضافی پہ افتخار
جوہر وہ ہیں جو تیغ کرے آپ آشکار
دکھلادو آج حیدر و جعفر کی کارزار

تم کیوں کہو کہ لال خدا کے ولی کے ہیں
فوجیں پکاریں خود کہ نواسے علیؑ کے ہیں

کیا کچھ علم سے جعفرِ طیار کا تھا نام — یہ بھی تھی اک عطائے رسولِ فلک مقام
بگڑی لڑائیوں میں بن آئے انھیں سے کام — جب کھینچتے تھے تیغ تو ہلتا تھا روم و شام
بے جاں ہوئے تو نخلِ وغا نے ثمر دیئے
ہاتھوں کے بدلے حق نے جواہر کے پر دیئے

لشکر نے تین روز ہزیمت اٹھائی جب — بخشا علم رسولِ خدا نے علیؑ کو تب
مرحب کو قتل کرکے بڑھا جب وہ شیرِ رب — در بند کرکے قلعہ کا بھاگی سپاہ سب
اکھڑا وہ یوں گراں تھا جو در سنگِ سخت سے
جس طرح توڑلے کوئی پتا درخت سے

نرغے میں تین دن سے ہے مشکلکشا کا لال — اماں کا باغ ہوتا ہے جنگل میں پائمال
پوچھا نہ یہ کہ کھولے ہیں کیوں تم نے سر کے بال — میں لٹ رہی ہوں اور تمہیں منصب کا ہے خیال
غمخوار تم مرے ہو نہ عاشق امام کے
معلوم ہو گیا مجھے طالب ہو نام کے

ہاتھوں کو جوڑ جوڑ کے بولے وہ لالہ فام — غصے کو آپ تھام لیں اے خواہرِ امام
واللہ کیا مجال جو اب لیں علم کا نام — کھل جائے گا لڑیں گے جو یہ باوفا غلام
فوجیں بھگا کے گنجِ شہیداں میں سوئیں گے
تب قدر ہوگی آپ کو جب ہم نہ ہوئیں گے

بس کہہ کے یہ ہٹے جو سعادت نشاں پسر — چھاتی بھر آئی ماں نے کہا تھام کر جگر
دیتے ہو اپنے مرنے کی پیارو مجھے خبر — ٹھہرو ذرا بلائیں تو لے لے یہ نوحہ گر

کیا صدقے جاؤں ماں کی نصیحت بُری لگی
بچو یہ کیا کہا کہ جگر پر چھُری لگی

زینب کے پاس آکے یہ بولے شہِ زمن　　کیوں تم نے دونوں بیٹوں کی باتیں سُنیں بہن
شیروں کے شیر عاقل و جرار و صف شکن　　زینب وحیدِ عصر ہیں دونوں یہ گل بدن
یوں دیکھنے کو سب میں بزرگوں کے طور ہیں
تیور ہی اِن کے اور ارادے ہی اور ہیں

نو دس برس کے سن میں یہ جراُت یہ ولولے　　بچے کسی نے دیکھے ہیں ایسے بھی مَن چلے
اقبال کیوں کہ ان کے نہ قدموں سے مُنہ ملے　　کس گود میں بڑے ہوئے کس دودھ سے پلے
بے شک یہ ورثہ دارِ جنابِ امیرؑ ہیں
پر کیا کہوں کہ دونوں کی عمریں صغیر ہیں

بس جس کو تم کہو اُسے دیں فوج کا علَم　　کی عرض جو صلاح شہِ آسماں حشم
فرمایا جب سے اُٹھ گئیں زہرائے باکرم　　اُس دن سے تم کو ماں کی جگہ جانتے ہیں ہم
مالک ہو تم بزرگ کوئی ہو کہ خورد ہو
جس کو کہو اُسی کو یہ عہدہ سپرد ہو

حضرتِ عباسؑ کا منصبِ علمداری

بولیں بہن کہ آپ بھی تو لیں کسی کا نام　　ہے کس طرف توجہ سردارِ خاص و عام
گر مجھ سے پوچھتے ہیں شہِ آسماں مقام　　قرآں کے بعد ہے تو علیؑ ہی کا کچھ کلام
شوکت میں قد میں شان میں ہمسر کوئی نہیں
عباسؑ نامدار سے بہتر کوئی نہیں

عاشق، غلام، خادمِ دیرینہ، جاں نثار　　فرزند، بھائی، زینتِ پہلو، وفاشعار
جرّار، یادگارِ پدر، فخرِ روزگار　　راحت رساں، مطیع وفادار و نامدار
صفدر ہے، شیر دل ہے، بہادر ہے، نیک ہے
بے مثل سیکڑوں میں ہزاروں میں ایک ہے

آنکھوں میں اشک بھر کے یہ بولے شہِ زمن　　ہاں تھی یہی علیؑ کی وصیت بھی اے بہن
اچھا بلائیں آپ کدھر ہے وہ صف شکن　　اکبر چچا کے پاس گئے سن کے یہ سخن
کی عرض انتظار ہے شاہِ غیور کو
چلئے پھوپھی نے یاد کیا ہے حضور کو

عباس آئے ہاتھوں کو جوڑے حضورِ شاہ　　جاؤ بہن کے پاس یہ بولا وہ دیں پناہ
زینب وہیں علم لئے آئیں بہ عزّ و جاہ　　بولے نشاں کو لے کے شہِ عرش بارگاہ
ان کی خوشی وہ ہے جو رضا پنجتن کی ہے
لو بھائی لو علَم یہ عنایت بہن کی ہے

رکھ کر علَم پہ ہاتھ جھکا وہ فلک وقار　　ہمشیر کے قدم پہ ملا منہ بہ افتخار
زینب بلائیں لے کے یہ بولیں کریں نثار　　عباسؑ فاطمہؑ کی کمائی ہے ہوشیار
ہو جائے آج صلح کی صورت تو کل چلو
ان آفتوں سے بھائی کو لے کر نکل چلو

کی عرض میرے جسم پہ جب وقت تنگ ہے سر　　ممکن نہیں ہے یہ کہ بڑھے فوج بدگہر
تیغیں کھنچیں جو لاکھ تو سینہ کروں سپر　　دیکھیں اٹھا کے آنکھ یہ کیا تاب کیا جگر
ساونت ہیں پسر اسدِ ذوالجلال کے
گر شیر ہو تو پھینک دیں آنکھیں نکال کے

منہ کرکے سوئے قبرِ علیؑ پھر کیا خطاب — فدیہ کو آج کر دیا مولا نے آفتاب
یہ عرض خاکسار ہے بس یا ابوتراب — آقا کے آگے میں ہوں شہادت سے کامیاب
سر تن سے ایک دھڑ کے روبرو گرے
شبیر کے پسینے پہ میرا لہو گرے

یہ سن کے آئی زوجۂ عباسؑ نامور — شوہر کی سمت بیٹے انکھیوں سے کی نظر
لیں سبطِ مصطفےٰ کی بلائیں بچشمِ تر — زینب کے گرد پھر کے یہ بولی وہ نوحہ گر
فیض آپ کا ہے اور تصدق امامؑ کا
عزت بڑھی کنیز کی رتبہ غلام کا

سر کو لگا کے چھاتی سے زینبؑ نے یہ کہا — تو اپنی مانگ کوکھ سے ٹھنڈی رہے سدا
کی عرض مجھ سی لاکھ کنیزیں ہوں تو فدا — بانوئے نامور کو سہاگن رکھے خدا
بچے جئیں ترقیِ اقبال و جاہ ہو
سایہ میں آپ کے علی اکبرؑ کا بیاہ ہو

رخصت وطن میں خیر سے پھر شہ کو لے کے جائیے — یثرب میں شور ہو کہ سفر سے حسینؑ آئے
اُمّ البنین جاہ و حشم سے پسر کو پائے — جلدی شبِ عروسیِ اکبر خدا دکھائے
مہندی تمہارا لال ملے ہاتھ پاؤں میں
لاؤ دلہن کو بیاہ کے تاروں کی چھاؤں میں

ناگاہ آ کے بالی سکینہ نے یہ کہا — کیسا ہے یہ ہجوم کدھر ہیں مرے چچا
عہدہ علم کا ان کو مبارک کرے خدا — لوگو مجھے بلائیں تو لینے دو اک ذرا
شوکت خدا بڑھائے مرے عمو جان کی
میں بھی تو دیکھوں شان علیؑ کے نشان کی

عباس مسکرا کے پکارے کہ آؤ آؤ — عمو نثار پیاس سے کیا حال ہے بتاؤ
بولی لپٹ کے وہ کہ مری مشک لیتے جاؤ — اب تو علم ملا تمہیں پانی مجھے پلاؤ
تحفہ کوئی نہ دیجیے نہ انعام دیجیے
قربان جاؤں پانی کا اک جام دیجیے

باتوں پہ اُس کی روتی تھیں سیدانیاں تمام — کی عرض آ کے ابنِ حسنؑ نے کہ یا امام
انبوہ ہے بڑھی چلی آتی ہے فوجِ شام — فرمایا آپ نے کہ نہیں فکر کا مقام
عباس اب علم لئے باہر نکلتے ہیں
ٹھہرو بہن سے مل کے گلے ہم بھی چلتے ہیں

ڈیوڑھی پہ خادمانِ محل کی ہوئی پکار — آتے ہیں اب حضور خبردار ہوشیار
خلعت پہن رہے ہیں علمدارِ نامدار — نذریں خوشی کی دینے کو حاضر ہوں جاں نثار
بھائی بڑا ہے سر پہ تو سایہ ہے باپ کا
عمدہ جوان بیٹے نے پایا ہے باپ کا (حسبِ قطع کی مسافت ....)

یہ سن کے شاد ہو گئی فوجِ حسینؑ سب — آئے رفیق سب درِ دولت پہ باادب
بولے حبیب ابنِ مظاہر کہ شکرِ رب — ہاں سرفروشو جنگ و جدل کا مزا ہے اب
سر دے کے لے بہشت کی جس کو تلاش ہو
دیکھیں علم کے سائے میں کس کس کی لاش ہو

کون اور کائنات میں ہے دوسرا جواں — قابل اسی کے دوشِ مبارک کے تھا نشاں
بازوئے شاہِ دیں جگرِ مرتضےٰ کی جاں — پیروں کا سرپرست جوانوں کا قدرداں
باتیں پیمبروں کی خدا کے ولی میں تھیں
سب اس میں جمع ہیں صفتیں جو علیؑ میں تھیں

اُلفت وہی، حیا وہی، مہر و وفا وہی   طاعت وہی، وقار وہی، اِتقا وہی
بخشش وہی کرم وہی جود و سخا وہی   جرأت وہی جدال وہی دبدبا وہی
گیتی میں اور بھی کوئی ایسا دلیر ہے
خود تھا علیؑ کا قول کہ عباسؑ شیر ہے

بے مثل سب ہیں قبلۂ عالم کے رشتہ دار   لیکن خدا نے اِس کو دیا ہے عجیب وقار
جیسے نبیؐ کی فوج میں تھے شیرِ کردگار   ویسا ہی بے عدیل ہے یہ شہ کا جاں نثار
سب فوج سے بڑھا ہوا رتبہ اسی کا ہے
شیرِ خدا کے بعد یہ حصّہ اسی کا ہے   (جاتی ہے کس شکوہ سے...)

تا گر بڑھے علم لئے عباسؑ باوفا   دوڑے سب اہلبیت کھلے سر برہنہ پا
حضرت نے ہاتھ اُٹھا کے یہ ایک ایک سے کہا   لو الوداع اے حرمِ پاکِ مصطفےٰ
صبحِ شبِ فراق ہے پیاروں کو دیکھ لو
سب مل کے ڈوبتے ہوئے تاروں کو دیکھ لو

شہ کے قدم پہ زینبِ زار و حزیں گری   بانو پچھاڑیں کھا کے پسر کے قریں گری
کلثوم تھرتھرا کے بروئے زمیں گری   باقر کہیں گرا تو سکینہ کہیں گری
اُجڑا چمن ہر اک گُلِ تازہ نکل گیا
نکلا علم کہ گھر سے جنازہ نکل گیا

دیکھی جو شانِ حضرتِ عباسؑ عرش جاہ   آگے بڑھی عَلم کے پس از تہنیت سپاہ
نکلا حرم سرا سے دو عالم کا بادشاہ   نشتر بدل تھی بنتِ علیؑ کی فغان و آہ
رہ رہ کے اشک بہتے تھے رُخِ جناب سے
شبنم ٹپک رہی تھی گُلِ آفتاب سے   (جب قطع کی مسافتِ شب...)

دیکھا جو نورِ چہرۂ سردارِ خاص و عام
پڑھنے لگے درود جوانانِ تشنہ کام
سر کو جھکا جھکا کے جھکے جب پئے سلام
جو سر تھا سر جھکانے میں وہ پا گئے امام
یعنی غلام منکسر و خاکسار ہیں
اس پائے عرش قدر پہ یہ سرنثار ہیں

سب فوج کو سلام کا جب دے چکے جواب
پس جانبِ فرس متوجہ ہوئے جناب
روح الامیں نے دی یہ صدا تھام کر رکاب
بسم اللہ اے خدیوِ زماں مالک الرقاب
نورِ محمدیؐ رخِ انور کی ضو میں ہے
شوکت تری رکاب میں نصرت جلو میں ہے

فوجِ حسینؑ کی میدان میں آمد

اس شان سے فرس پہ شہِ انس و جن چڑھے
جس طرح نکلے ابر سے خورشید دن چڑھے
بہرِ جہادِ راہِ خدا مطمئن چڑھے
گھوڑوں پہ نوجوانوں سے پہلے مُسن چڑھے
سب جاں فشاں سوار تھے راہِ ثواب میں
پیدل مگر تھے ابنِ مظاہر رکاب میں

بڑھتا تھا خون جوشِ شجاعت سے دمبدم
گردن میں وہ کجی تھی نہ مطلق کمر میں خم
ہر نوجواں سے تھا یہ اشارہ بصد حشم
یعنی جہاں سے جائیں گے سیدھے جناں میں ہم
بر میں زرہ کمانِ کیانی تھی دوش پر
قبضے پہ ایک ہاتھ تھا اک زین پوش پر

ابرو جھکے جو پڑتے تھے پلکوں پہ بار بار
رومال پھاڑ کر انھیں باندھا تھا استوار
آنکھوں سے شیرِ نر کی جلالت تھی آشکار
گویا کہ تھی غلاف میں حیدر کی ذوالفقار

جلدی چلے جو چند قدم جھوم جھوم کے
رعشہ وداع ہو گیا ہاتھوں کو چوم کے

اک شور تھا کہ عود کیا پھر شباب نے — پائی دعا حبیب کے حق میں جناب نے
ریشِ سفید رُخ پہ سیہ کی خضاب نے — پائی یہ آب و تاب کہاں آفتاب نے
لبریز نور سینۂ بے کینہ ہو گیا
یوں جھرّیاں مٹیں کہ تن آئینہ ہو گیا

کہتے تھے باگ روکے ہوئے شاہِ نامدار — یہ کس لئے پیادہ روی اے نحیف و زار
میں بھی اُتر پڑوں گا نہ ہو گے جو تم سوار — کرتے تھے عرض یہ کہ توانا ہے جاں نثار
ہر چند پیر و خستہ دل و ناتواں شدم
ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

فرمایا تم کو دیتا ہوں اس سر کی میں قسم — جو بعد عصر تیغ سے ہو جائے گا قلم
میں بھی نکالتا ہوں رکابوں سے اب قدم — اچھا تمہارے ساتھ پیادہ چلیں گے ہم
پہنچیں جناں میں بحرِ مصیبت کو جھیل کے
ہم تم تو ایک گھر میں پلے ساتھ کھیل کے

وہ لوٹنا بھی خاک کا اب تک ہے یادگار — تم پر بھی گرد تھی مری زلفوں پہ بھی غبار
اُس روز تم پہ مجھ سے سوا تھا نبی کا پیار — فرماتے تھے یہ ہے مرے پیارے کا دوستدار
شبیرؑ کے حبیب کو پہچانتا ہوں میں
لوٹے گا یہ لہو میں یوں ہی جانتا ہوں میں

رو کر کہا حبیب نے آخر ہوا وہ دور — اب اُن کا عہد ہے کہ جو ہیں حاکمانِ جور
یہ وقت اور کچھ ہے وہ ہنگام تھا کچھ اور — مولا کبھی رہا نہیں دنیا کا ایک طور

گردش نئی فلک کی نئے انقلاب ہیں
کوثر ہے جن کا، آج وہ محتاجِ آب ہیں

یہ عرض کر کے روئے حبیبِ وفا شعار — جھک کر کہا یہ پیر غلام آپ پر نثار
جب تک سمند پہ وہ دلاور ہوا سوار — رو کے رہے لجامِ فرسِ شاہِ نامدار
ہر دوست پر پدر سے زیادہ شفیق تھے
کیا قدرداں وہ شاہ تھا اور کیا رفیق تھے (جاتی ہے کس شکوہ سے....)

تھم کر ہوا چلی فرسِ خوش قدم بڑھا — جوں جوں وہ سوئے دشت بڑھا اور دم بڑھا
گھوڑوں کی لیں سواروں نے باگیں علم بڑھا — رایت بڑھا کہ سروِ ریاضِ ارم بڑھا
پھولوں کو لے کے بادِ بہاری پہونچ گئی
بستانِ کربلا میں سواری پہونچ گئی

اللہ ری سپاہِ خدا کی شکوہ و شاں — جھکنے لگے جنودِ ضلالت کے بھی نشاں
کمریں کسے علم کے تلے ہاشمی جواں — دنیا کی زیب، دین کی عزت، جہاں کی جاں
ایک ایک دودمانِ علیؑ کا چراغ تھا
جس کو بہشت پر تھا تفوق وہ باغ تھا (جب قطع کی مسافتِ شب...)

بچوں میں سبزہ رنگ کوئی تھا کوئی صبیح — شیریں سخن، لبوں میں نمک، رنگتیں ملیح
چاہیں لبوں کو اُن کی جو باتیں سنیں فصیح — مُردوں کو دم میں زندہ کریں صورتِ مسیح
جدّ و پدر کی طرح جری ہیں دلیر ہیں
بچے ہیں یوں پہ غیظ جب آئے تو شیر ہیں

وہ نیمچے ہلال کے دم خم پہ جن کو فوق — جرأت کا جوش تیغ زنی کا دلوں کو شوق
ہنس ہنس کے زخم کھائیں زبانوں کو اس کا ذوق — گیسو رخوں پہ کانوں میں بُندے گلوں میں طوق

آنکھیں جو نرگسی ہیں تو رُخ بھولے بھالے ہیں
نازوں کے منّتوں کے مُرادوں کے پالے ہیں

ایک ایک خوش بیاں تو ہر اک نکتہ سنج ہے — کچھ پیاس کا نہ غم ہے نہ فاقوں کا رنج ہے
لشکر ہے وہ کہ حُسن کی دولت کا گنج ہے — چہرہ ہر اک کا ماہِ چہار و دُو پنج ہے
انگڑائیاں جو لیتے ہیں سینوں کو تان کے
کہتا ہے حُسن خود کہ نثار ان کی شان کے

کم گو کوئی متیں کوئی شیریں سخن کوئی — بچپن میں سرو قد کوئی رشکِ چمن کوئی
نازک مزاج کوئی تو گل پیرہن کوئی — تصویرِ جد کوئی تو شبیہِ حسنؑ کوئی
دولت یہی حسینؑ کے حصّے میں آئی تھی
مایہ یہ تھی فاطمہؑ کی علیؑ کی کمائی تھی

شیرانِ دشت کو جگر ایسے نہیں ملے — غوّاص کو کبھی گہر ایسے نہیں ملے
حمزہ کو جنگ کے ہنر ایسے نہیں ملے — جعفر نے پائے بال و پر ایسے نہیں ملے
جو تھا نبیؐ کے بعد خدا کے ولی کا تھا
حضرت کو وہ ملا کہ جو حصّہ علیؑ کا تھا

شرمندہ جس سے چاند ہو چہرے وہ تابناک — دل بلبلوں کے خوں تو گریباں گلوں کے چاک
خود وادی السّلام جو چھانے نجف کی خاک — ایسے کبھی ملیں نہ گہر ہائے صاف و پاک
تسبیح ہاتھ آئی یہ کس نیک نام کو
دُرِّ نجف تھے وہ جو ملے تھے امام کو

شیرِ خدا کے سات جگر بند نامدار — دونوں نواسے حضرتِ زینبؑ کے گلعذار
پوتے چھٹوں وحیدِ زماں فخرِ روزگار — یکتائے دہر پانچ بھتیجے فلک وقار

خود جس کی فرعِ واصلِ علیؑ و رسولؐ تھے
یہ سب اُسی درخت کی شاخوں کے پھول تھے

یوسف تھے ایک مصر میں اور مشتری ہزار   کیف و کم ثمن ہے کتابوں سے آشکار
یوسف سے کربلا میں تھے اٹھارہ گلعذار   عالم کی جان، فخرِ حسینانِ روزگار
یاں منزلت بھی قدر بھی قیمت بھی فوت تھی
زہرا کے یوسفوں کی خریدار موت تھی (جاتی ہے کس شکوہ سے ....)

غرفوں سے حوریں دیکھ کے کرتی تھیں یہ کلام   دنیا کا باغ بھی ہے عجب پُر فضا مقام
دیکھو درود پڑھ کے سوئے لشکرِ امام   ہمشکلِ مصطفٰے ہے یہی عرش احتشام
رایت لئے وہ لال خدا کے ولی کا ہے
اب تک جہاں میں ساتھ نبیؐ و علیؑ کا ہے (جب قطع کی مسافتِ ....)

شہرہ بہت تھا حُسن میں کنعاں کے ماہ کا   قصہ سُنا ہوا ہے زلیخا کی چاہ کا
یاں آفتاب کو نہیں یارا نگاہ کا   یوسف ہے ایک ایک جواں اس سپاہ کا
سُنتے تھے ہم کہ عالمِ ایجاد زشت ہے
ایسے چمن کھلے ہیں کہ دُنیا بہشت ہے (جب ان میں سربلند علیؑ ....)

لاریب فیہ حُسن میں یوسف تھے بے مثال   لیکن نہ تھی ملاحتِ محبوبِ ذوالجلال
مثلِ نبیؐ ملیح تھے یہ سب نکو خصال   گستاخیاں معاف ادب کا بھی ہے خیال
شور آج تک ہے خوبیٔ یوسف میں شک نہیں
پھیکا ہے پر وہ حُسن کہ جس میں نمک نہیں

تا گہ نشاں بڑھائے اُدھر کی سپاہ نے   کھولا اِدھر عَلم کو علمدار شاہ نے
چوما نشاں کو بڑھ کے ہر اک خیر خواہ نے   طوبیٰ لکم کہا شہِ عالم پناہ نے

رفعت بڑھی زمینِ سعادت سرشت کی
ٹھنڈی ہوا پھریرے سے آئی بہشت کی

رایت وہ سبز لشکرِ سادات کا نشاں	دامانِ پاک کشتیِ اُمّت کا بادباں
پنجہ مثالِ پنجۂ خورشید زرفشاں	پرچم تھا بال کھولے تھی یا حورِ جناں

مشک و عبیر و عود کا بازار سرد تھا
مٹّی کا عطر خاک کی خوشبو سے گرد تھا (جاتی ہے کس شکوہ سے...)

پنجہ اِدھر چمکتا تھا اور آفتاب اُدھر	اُس کی ضیا تھی خاک پہ ضَو اِس کی عرش پر
زرریزیِ عَلَم پہ ٹھہرتی نہ تھی نظر	دولھا کا رُخ تھا سونے کے سہرے میں جلوہ گر

بھٹے دو طرف جو دو عَلَم اِس ارتفاع کے
اُلجھے ہوئے تھے تار خطوطِ شعاع کے (جب قطع کی مسافت...)

نقارۂ وغا پہ لگی چوب ناگہاں	گردونِ دوں سے پار ہوئی طبل کی فغاں
شیپور کے غریو سے ہلتا تھا آسماں	وہ بوق کی مہیب صدا تھی کہ الاماں

نیزوں کو ہر سوار اُدھر تولنے لگا
گونجے اِدھر بھی شیر کہ رن بولنے لگا (جاتی ہے کس شکوہ سے...)

غصّے سے آفتاب ہوئے مومنوں کے رنگ	فوجوں پہ جا پڑیں یہ دلوں کو ہوئی اُمنگ
تن تن کے برچھیاں جو سنبھالیں برائے جنگ	بے چین ہو گئے فرسِ ابلق و سُرنگ

پاسِ ادب سے شاہ کے صف بڑھ کے تھم گئی
مِٹّی ہر اک سوار کی گھوڑے پہ جم گئی

تنتا ہوا بڑھا کوئی قبضے کو چوم کے	بھالا کسی نے رکھ لیا کاندھے پہ جھوم کے
بولا کوئی یہ غول ہیں کیا شام و روم کے	ٹکڑے اُڑائیں گے عمر و شمرِ شوم کے

نامرد جو ہیں آنکھ چُراتے ہیں مَرد سے
دونوں کو چار کرکے پھریں گے نبرد سے

دولا کھو سے نظر کسی غازی کی لڑ گئی
بل کھا کے رُخ پہ زلف کسی کی اکڑ گئی
چتون کسی کی شورِ دُہل سے بگڑ گئی
مُنہ سُرخ ہو گیا شکن ابرو پہ پڑ گئی
نکلا کوئی سمند کو زانو میں داب کے
غصے سے رہ گیا کوئی ہونٹوں کو چاب کے

بڑھ کر کسی نے تیر ملایا کمان سے
نیزہ کوئی ہلانے لگا آن بان سے
نعرہ کسی کا پار ہوا آسمان سے
تلوار کھینچ لی کسی صفدر نے میان سے
اک شور تھا کہ تلخ کیا ہے حیات کو
لاشوں سے چل کے پاٹ دو نہر فرات کو (جب رن میں سربلند علیؑ ....)

فوجِ یزید میں حُر کا اضطراب

یاں کا تو ہے یہ حال سُنو اُس طرف کا رنگ
فوجِ امیرِ شام ہے سب مستعدِ جنگ
چلّوں سے ہیں ملائے ہوئے اہلِ کیں خدنگ
غُل ہے کہ ہاں لڑائی میں اب کچھ نہیں درنگ
فوجیں لئے کمک کو رئیسانِ شام ہیں
پھل برچھیوں کے جانبِ فوجِ امام ہیں

حُر اک طرف کھڑا ہے مسلح مگر خموش
پیچھے ہیں دو ہزار جوانانِ درع پوش
بھائی کا ہے خیال نہ کچھ ہے پسر کا ہوش
آنکھوں میں اشک دل میں محبت کا شہ کی جوش
انجام کا خیال ہے ایماں کا درد ہے
رعشہ تمام جسم میں اور رنگ زرد ہے

ٹپکا کے اشک آنکھوں سے کہتا ہے آہ آہ　　کیوں مصطفےٰؐ کے لال کی رُکی تھی میں نے راہ
میرے سبب ہائے یہ سیّد ہوا تباہ　　نفرین فاطمہؑ سے بچا مجھ کو یا اللہ
محجوب ہوں خجل ہوں شہِ مشرقین سے
کیا جانتا تھا میں کہ لڑیں گے حسینؑ سے

بڑھ کر اگر کماں میں کوئی جوڑتا ہے تیر　　کہتا ہے شیر تول کے شمشیرِ بے نظیر
یہ کیا خطا ہے دور ہو او سرکش و شریر　　حیدر کا نورِ چشم ہے کونین کا امیر
کیا پاس کچھ نہیں دل و جانِ بتولؑ کا
بیدرد چھید نہ جائے کلیجہ رسولؐ کا

جب شمر نے سُنے سخنِ حُرِ حق شناس　　گھبرا کے وہ گیا عمرِ بے حیا کے پاس
کی عرض اے امیر نہایت ہوں بے حواس　　لشکر میں ہے فساد مجھے فتح سے ہے یاس
وہ فکر کر کہ فوج کا کچھ بندوبست ہو
آپس میں لڑ مرے تو غضب کی شکست ہو

حُر در پئے فساد ہے لشکر میں اے امیر　　کہتا ہے بے خطا ہے شہ آسماں سریر
ہیں اس کی سرکشی سے کماں دار گوشہ گیر　　چلّے ہیں جوڑنے نہیں دیتا کسی کو تیر
رُخ اُس کا پھر گیا ہے ہماری سپاہ سے
وہ جا ملے گا سبطِ رسالت پناہ سے

اُس کو نہ تیرا پاس نہ حاکم کا کچھ ہے ڈر　　بپھرا کھڑا ہوا ہے الگ مثلِ شیرِ نر
بیٹے سے دمبدم ہے اشارہ کہ اے پسر　　ہے جنّت النعیم اُدھر اور اِدھر سقر
اب یاں رہیں کہ سوئے شہِ بحر و بر چلیں
عاقل اگر ہے تُو تو بتا دے کدھر چلیں

سُنتے تھے سب جو بھائی سے اُس نے کئے کلام — کہتا تھا نورِ عینِ علیؑ ہے مرا امام
غیر از حسینؑ مجھ کو نہیں ہے کسی سے کام — سچ کہتے ہیں اسی لئے ہے نوکری حرام
پانی کیا ہے بند امامِ سعید پہ
دشمن ہے آلِ پاک کا لعنت یزید پہ

یہ سُن کے ابنِ سعدِ لعیں کو ہوا ہراس — بولا بُلا تو لائے کوئی حُر کو میرے پاس
آیا عجب شکوہ سے حُرِ خدا شناس — غصّے سے رنگ سُرخ مگر مجتمع حواس
یہ غیظ تھا عمر کی طلب سے دلیر کو
جس طرح ٹوک دے کوئی غصّہ میں شیر کو

قبضے پہ ہاتھ اور زباں پر علیؑ کا نام — فرزند ارجمند بھی تولے ہوئے حسام
نیزہ لئے برادرِ حُرِ خجستہ کام — گرزِ گراں اُٹھائے ہوئے باوفا غلام
دھڑکا کہ دیکھئے پسرِ سعد کیا کہے
ایسا نہ ہو حسینؑ کو ظالم بُرا کہے

خیمے سے دُور تھا ابھی کچھ حُرِ نامور — غل یک بیک ہوا کہ برآمد ہوا عمر
بالائے فرقِ نحس چمکتا تھا چترِ زر — تیغیں علم کئے تھے مصاحب اِدھر اُدھر
غرّہ تھا بے حیا کو ہجومِ سپاہ پہ
سایہ ہزار ڈھال کا تھا روسیاہ پہ

غل تھا ہٹو بڑھو کا پیادوں میں بار بار — پیدل تھے ساتھ گھوڑوں سے اُترے ہوئے سوار
آگے تھے اہتمام میں دس بیس چوبدار — تھے پہلواں سلام کو باندھے ہوئے قطار
ظالم کے حکم میں سپہِ شام و روم تھی
چاروں طرف سلامی کے باجوں کی دھوم تھی

کہتا تھا شمر سے یہ بہ نخوت وہ خودپرست   کھلوا نشاں لڑائی کا ہو جلد بندوبست
کہہ دے درست ہو جو زمیں ہے بلند و پست   دریا پہ جائیں اور جوانانِ تیز دست
آلِ نبیؐ کو تشنہ دہن ذبح کیجیو
گر پاسِ آبرو ہے تو پانی نہ دیجیو

حاکم کے حکم سے کوئی ہو منحرف اگر   قطعی یہ حکم ہے کہ جُدا کر بدن سے سر
مجرم ہے جائے گا جو اِدھر سے کوئی اُدھر   بچے اسیر ہوئیں گے تاراج ہو گا گھر
حاکم ہوں میں سزا کا مجھے اختیار ہے
دُرّہ ہے، بیڑیاں ہیں، اسیری ہے، دار ہے

تھرّا رہے تھے سُن کے یہ تاکید خاص و عام   چیں بر جبیں قریب گیا حرّ نیک نام
دیکھا کیا شقی، پہ نہ حُر نے کیا سلام   کافر سے کیا جھکے وہ خدا سے ہو جس کو کام
چیں بر جبیں قریب جو وہ شیرِ نر گیا
اللہ رے رعب حق پسرِ سعد ڈر گیا

ڈر کر کہا عمر نے کہ اے حُرّ نامور   رن میں سوار تیرے رسالے کے ہیں کدھر
کتنے جواں صفوں میں ہیں کتنے ہیں نہر پر   حُر نے کہا کہ اس کی مجھے کچھ نہیں خبر
دنیا میں نہ زور اپنا ہے اور اپنا ہاتھ ہے
میں ہوں کسی طرف نہ کوئی میرے ساتھ ہے

بولا وہ بے حیا کہ نہ برہم ہو اے جری   اچھی نہیں یہ تند مزاجی یہ خودسری
حُر نے کہا عزیز نہ سر ہے نہ افسری   میں وہ کروں گا جس میں ہو ایماں کی بہتری
کیا اُس کا ساتھ جس کی اطاعت گناہ ہو
حاکم ہو یا رئیس ہو یا بادشاہ ہو

کہنے لگا یہ حُر سے بہ نرمی وہ حیلہ ساز   مدت سے ہے یزید کو تیری وفا پہ ناز
سر بر نہ ہوں گے ہم سے کبھی سرورِ حجاز   اب بعدِ فتح اور بھی تو ہوگا سرفراز
دیر اس میں کیا جو امر قریب الوقوع ہو
تو مصلحت جو دے تو لڑائی شروع ہو

آمادہ قتلِ شاہ پہ ہیں سب جوان و پیر   گھٹتا ہے اب سرِ سپرِ شاہِ قلعہ گیر
کیوں برچھیاں حسینؑ پہ پہلے چلیں کہ تیر   حُر نے کہا کہ مجھ سے نہ یہ پوچھ اے امیر
انساں کو اختیار ہے خود اپنے کام میں
مجھ کو شریک کرتا ہے قتلِ امام میں

سوچے اگر تو عاقل و ہشیار ہے بشر   ہے دوزخی جو شر کا طلبگار ہے بشر
ہردم خدا کا یوں تو خطا وار ہے بشر   شر ہو کہ خیر فاعلِ مختار ہے بشر
ایماں کا فیض ربِّ علا کی طرف سے ہے
شر اس طرف سے خیر خدا کی طرف سے ہے

کتنے ہی تشنہ رہتے ہیں حُبِّ علیؑ سے مست   کتنوں نے دل سے محو کیا وعدۂ الست
کتنوں کی ہے جو فتح تو کتنوں کی ہے شکست   کتنے ہوا پرست ہیں کتنے خدا پرست
احوال مختلف ہے شقی و سعید کا
عاشق کوئی حسینؑ کا کوئی یزید کا

لے رائے نیک یہ ہے تجھے ہے اگر پسند   فرزندِ فاطمہؑ کو نہ پہنچا کوئی گزند
پانی مسافروں پہ بھی کرتا ہے کوئی بند   واللہ بے قصور ہے وہ شاہِ ارجمند
او سست عقل پاس بھی تجھ کو کسی کا ہے
مجرم بھی ہو اگر تو نواسہ نبیؑ کا ہے

حاکم ہے حُرمتِ شرفا چاہیے تجھے   روحِ رسولِ حق سے حیا چاہیے تجھے
پردیسیوں پہ مہر و وفا چاہیے تجھے   امدادِ بندگانِ خدا چاہیے تجھے
جو اپنے گھر میں آئے اُسے گھیرتے نہیں
مہمان کے گلے پہ چھری پھیرتے نہیں

مہماں بھی کون سا کہ رسولِ خدا کا لال   زہرا کی جان لختِ دلِ شیرِ ذوالجلال
نے ملک جس کے پاس نہ دولت نہ زر نہ مال   سید، عیال دار، مسافر شکستہ حال
کیا جانے یہ ستم تجھے کیونکر پسند ہے
سولہ پہر سے آبِ رواں اُس پہ بند ہے

لالچ نہ کر حکومتِ رے کا، خدا سے ڈر   کعبے کو ڈھا کے کوئی بناتا ہے اپنا گھر
اُس شے سے آدمی کو سدا چاہیے حذر   جس کی طلب میں دولتِ ایماں کو ہو ضرر
دنیا میں کیا خبر کہ رہے یا نہ تو رہے
وہ کام کر کے جا کہ سدا آبرو رہے

انساں کو پاسِ حُرمتِ اسلام چاہیے   عقبیٰ بخیر جس میں ہو وہ کام چاہیے
مُنعم کو مثلِ ابرِ کرم عام چاہیے   گو صاحبِ نگیں نہ ہو پر نام چاہیے
فیضِ محبتِ شہِ نامی نصیب ہو
گر ہو تو پنجتن کی غلامی نصیب ہو

کیا حاکمِ شقی کی محبت کا اعتبار   بدعہد و پُر دغا و شقی و شراب خوار
نامرد، بدترینِ جہاں، تنگِ روزگار   دنیا پرست، فاسق و بیدین و بدشعار
دن رات اُس کو شغل شراب و غنا کا ہے
شیطان کا مرید ہے عادی زنا کا ہے

یہ تشنہ لب حبیبِ الٰہی کا ہے حبیب   تو ساتھ اس امام کا دے تو نہ ہے نصیب
گر یہ نہ ہو سکے تو نجف یاں سے ہے قریب   مہلت بس اتنی دے کہ نکل جائے یہ غریب

لایا تھا گھیر کر میں سرِ مشرقین کو
پہونچا بھی آؤں قبرِ علیؑ پہ حسینؑ کو

ملتا ہے گر تو قبلۂ عالم سے جلد مل   ورنہ رہے گا احمدِؐ مرسل سے منفعل
میں بے تقیہ کہتا ہوں سن لے بگوشِ دل   جاتا ہوں دیکھ جاتا ہوں آقا سے متصل

چھوڑا کنشت صاحبِ مسجد کے ساتھ ہوں
تیرا شریک اب نہیں سیدؑ کے ساتھ ہوں

یہ سن کے ہو گیا پسرِ سعدِ شوم دنگ   غصے سے اور تیرہ ہوا تیرہ رو کا رنگ
بولا کدھر خیال ہے مجھ سے کریگا جنگ   ہوتا ہے حاکموں سے یہی گفتگو کا ڈھنگ

نامِ حسینؑ منہ سے نہ اب بار بار لے
کہہ دوں کہ کوئی تن سے ترا سر اتار لے

کیا جانتا نہیں کہ ہے اس نام سے عناد   دشمن سے کیسی دوستی اور کیسا اتحاد
حاکم سے دل پھرا ہوا اوروں سے اعتقاد   ایسی سزا ملے گی کہ برسوں کرے گا یاد

جانے دے جان جائے گی جانے میں کد نہ کر
اچھا یہی ہے گر تو کسی کی مدد نہ کر

لڑلیں گے ہم حسینؑ سے کیا تیری احتیاج   آلِ نبیؐ کے خون کے دریا بہیں گے آج
نعلینِ پائے شہ کو سمجھتا ہے سر کا تاج   محتاج ہیں وہ آپ کدھر ہے ترا مزاج

زحمت اٹھا کے زیور و زر لینے آئے ہیں
کوسوں سے یاں حسینؑ کا سر لینے آئے ہیں

بے قتلِ ابنِ فاطمہؑ آسودگی محال — لوٹیں گے گھر علیؑ کا ملے گا متاع و مال
دم میں کریں گے باغِ محمدؐ کو پائمال — پیاسا شہید ہوگا رسولِ خدا کا لال
ہوں گی علیؑ کی بیٹیاں بلوائے عام میں
بندی نبیؐ کی آل کی جائے گی شام میں

فرزندِ فاطمہؑ کی رفاقت سے کیا حصول — حُرؑ نے کہا کہ دولتِ خوشنودیٔ رسولؐ
جل جاؤں گا کریں گی اگر بد دعا بتولؑ — تیور بدل کے مجھ کو ڈراتا ہے اے جہول
گر نامِ نامیٔ اسدِ ذوالجلال لوں
انساں تو کیا ہے شیر کی آنکھیں نکال لوں

بھولا ہے اپنی فوج کی کثرت پہ تندخُو — نامرد میرے سر کو اتارے گا تن سے تو
کیا تیری اصل کیا ترا منہ او سیاہ رُو — جرار بادشاہوں سے کرتے ہیں گفتگو
کیا ڈر مجھے پسند ہو یا ناپسند ہو
میں حق پہ ہوں زباں مری کس طرح بند ہو

کہتا ہے بار بار نہ لے شاہِ دیں کا نام — میں حرزِ جاں سمجھتا ہوں نامِ شہِ انام
تو بندۂ یزید ہے میں خادمِ امام — ہوئے گا نزع میں بھی زباں کو اسی سے کام
نامِ حسینؑ دوست کو پیارا ہے جان سے
اِس نام کا مزا کوئی پوچھے زبان سے

لعنت ترے یزید پہ کرتا ہوں برملا — کہہ دے جو ہو کوئی ترے لشکر میں منچلا
اِتنوں میں مجھ پہ ہاتھ تو ڈالے کوئی بھلا — کردوں لہو سے لال بیابانِ کربلا
خالق مدد کرے گا مطیعِ امام ہوں
فوجیں بھگائیں جس نے میں اُس کا غلام ہوں

تو کیا لڑے گا لال سے حیدرؑ کے اے شریر — جب کچھ کڑی پڑی ہے تو بھاگے ہیں تیرے پیر
وہ شیر ہیں جنھوں نے پیا فاطمہؑ کا شیر — واں کا نہ اک جوان نہ تیرا لشکرِ کثیر
چھوڑا ہے سیّدوں نے کہیں آن بان کو
اُلٹیں جو آستیں تو اُلٹ دیں جہان کو

عقبیٰ خراب ہوتی ہے فوجِ ستم کے ساتھ — ہے سر مرا شہِ دو جہاں کے قدم کے ساتھ
حرمت ہے اب عیال کی اہلِ حرم کے ساتھ — میں حشر میں بھی ہوں گا امامِ اُمم کے ساتھ
چھوٹے گا روح سے بھی نہ مدفن حسینؑ کا
ڈھونڈھے گی میری خاک بھی دامن حسینؑ کا

ہو قطع یہ زباں تری او دشمنِ امام — لیتا ہے تو اسیریٔ بنتِ علیؑ کا نام
واجب ہے مثلِ کعبہ اسی گھر کا احترام — خاموش بے ادب کہ ادب کا ہے یہ مقام
بلوے میں قید دخترِ شیرِ الٰہ ہو
ویران شہرِ شام ہو کوفہ تباہ ہو

کیونکر نہ پاسِ خسروِ جن و ملک کروں — کافر ہوں گر حسینؑ کے رتبے میں شک کروں
کہلاؤں شور بخت جو پاسِ نمک کروں — بیکس کا ساتھ چھوڑ کے تیری کمک کروں
رہ جاؤں منہ کو قبلۂ عالم سے موڑ کر
مسکن بناؤں دہر میں کعبے کو چھوڑ کر

وہ عاشقِ حسینؑ یہ کہتے ہی بس چلا — لشکر دعائے فاطمہؑ کا پیش و پس چلا
روکا کیے بہت پہ کسی کا نہ بس چلا — صرصر بھی پیچھے رہ گئی کچھ یوں فرس چلا
دل ہل گیا دماغ میں وہ بو جو چھا گئی
ٹھنڈی ہوا بہشت کے گلشن کی آ گئی

فوجِ حسینؑ میں حُر کی آمد

پڑھ کر درود کہنے لگا حُرِ نیک خو
صلِّ علیٰ یہ ہے چمنِ فاطمہؑ کی بو
وہ راہ مل گئی مجھے تھی جس کی آرزو
گھوڑوں سے اب اُتر کے پاپوش کے روبرو
محسن ملا حسینؑ سا احساں خدا کا ہے
ہاتھوں کو باندھو سامنا مشکل کُشا کا ہے

یہ کہہ کے راہواروں سے اُترے وہ خوش سیر
گھوڑوں پہ سب رکھ دیئے ہتھیار کھول کر
باندھے جو ہاتھ کھُل گیا باغِ ارم کا در
بڑھ کر جری یہ پکارا بچشمِ تر
اے صاحبو غلام کو آنے کی راہ دو
صدقہ محمدِ عربی کا پناہ دو

امداد کا مقام ہے یارو مدد کرو
مضطر ہوں اے نماز گزارو مدد کرو
شیرِ خدا کے شیر کے پیارو مدد کرو
اے عرشِ کبریا کے ستارو مدد کرو
دیں پہ درو ثواب کا ہاتھوں سے کام لو
عاصی کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو تھام لو

میں یوں نہ جاؤں گا مجھے ہمراہ لے چلو
راضی ہوں خواہ قتل کرو خواہ لے چلو
مجرم کو پیشِ سیدِ ذی جاہ لے چلو
رسّی گلے میں باندھ کے للّٰہ لے چلو
ارماں ہے صدقے ہونے کا حسرت نکال دو
سر کاٹ کر حسینؑ کے قدموں پہ ڈال دو

روئی یہ استغاثۂ حُرسُن کے فوجِ شاہ
غل تھا عجیب صاحبِ ایماں ہے واہ واہ
اکبر نے دی صدا کوئی روکے نہ اس کی راہ
اُترے فرس سے جلد شہنشاہِ دیں پناہ

مشتاق ہو کے دلبرِ زہراؑ رواں ہوا
قطرے کی پیشوائی کو دریا رواں ہوا

پھیلا کے ہاتھ یاں سے بڑھے شاہِ سرفراز   قدموں پہ حُر نے دوڑ کے رکھا سرِ نیاز
سر لے کے دونوں ہاتھوں پہ بولے شہِ حجاز   بھائی ترے لئے درِ خلدِ بریں ہے باز
تو سہمگیں ہے کس لئے میں شرمسار ہوں
اُٹھ کر گلے تو مل کہ بہت بے قرار ہوں

دریافت کر لے دیر سے میں دیکھتا تھا راہ   میدان سے پھری نہیں اب تک مری نگاہ
ڈر تھا کہ گھیر لے نہ تجھے شام کی سپاہ   میری تجھی میں جان تھی اے میرے خیر خواہ
موجود رہبری کو خضرؑ وقت پاس تھے
گو دور تھا حسینؑ علیؑ تیرے پاس تھے

کیوں ہاتھ کس کے باندھے ہیں ہوتا ہوں میں خجل   اے بھائی دل کو کھول کے مجھ سے گلے تو مل
واللہ تجھ سے صاف ہے ابنِ علیؑ کا دل   جو کچھ ترے قصور تھے سب ہو گئے بحل
کیوں تجھ کو اتنی دہشتِ نارِ جحیم ہے
بھائی خدا کی ذات غفور و رحیم ہے

کیسا ہی پُر گناہ ہو عبدِ سیاہ رُو   توبہ کے بعد اُس کی بُرائی ہے آرزو
کافی بہانہ اشک کا ہے اے خجستہ خُو   ہے رحمتِ خدائے دو عالم بہانہ جُو
ناجی ہے اُس کی راہ میں جو خاک ہو گیا
دریا سے جو قریب ہوا پاک ہو گیا

یہ کہہ کے کھولے شاہ نے اُس باوفا کے ہاتھ   اور اُس کی مغفرت کی دُعا کی اُٹھا کے ہاتھ
حُرِ جری نے چوم لئے مقتدا کے ہاتھ   شہ بولے آبرو ہے تری اب خدا کے ہاتھ

جاری ہے فیضِ خانۂ ربِّ جلیل میں
حصہ ترا ہے خلد میں اور سلسبیل میں

جاں آئی تن میں حُر کے جو دیکھا یہ شہ کا پیار
رو کر کہا غلام اس الطاف کے نثار
ہو آبرو دو چند جو صدقے ہوں لاکھ بار
تو آفتابِ فیض ہے اے نورِ کردگار
قربان یاحسینؑ ترے حُسنِ پاک کے
پرتو سے مہر کر دیا ذرّے کو خاک کے

ہمراہ لے کے حُر کو چلے سیدِ اُمم
عباسِ باوفا نے کیا سایۂ علم
تھامے تھے حُر کے ہاتھ کو اکبر زہے کرم
قدسی درود پڑھ کے یہ کہتے تھے دمبدم
دیکھو رسولِؐ حق کے نواسے کی شان کو
لاتا ہے کس خوشی سے سخی میہمان کو

داخل ہوا جو لشکرِ دیں میں وہ باوفا
لپٹے گلے سے حُر کے جوانانِ مہ لقا
تھا ہر زباں پہ نعرۂ تحسین و مرحبا
غل تھا خوشا نصیب زہے طالعِ رسا
بھائی کرم سے حضرتِ شبیرؑ کہتے ہیں
بخت اس کو کہتے ہیں اسے تقدیر کہتے ہیں

حُر کی رخصتِ جنگ

ناگاہ تیر چلنے لگے اُس سپاہ سے
دشتِ نبرد ہل گیا زہرا کی آہ سے
مانگی رضائے حرب رفیقوں نے شاہ سے
کی حُر نے عرض قبلۂ عالم پناہ سے
مولا ابھی کسی کو نہ اذنِ وغا ملے
پہلے نئے غلام کو رن کی رضا ملے

شہ نے کہا کہ واہ یہ جلدی یہ شوقِ جنگ　　تیرا فراق شیشۂ دل کے لئے ہے سنگ
چلنے دے تیر کیوں متغیر ہے تیرا رنگ　　جانے میں عجلت اس قدر آنے میں وہ درنگ
دشوار ہے یہ زخم سے برچھی کی نوک کے
جانا یہاں سے سہل نہیں ہم کو روک کے

جی بھر کے تجھ کو دیکھ تو لیں اے وفا شعار　　دنیا میں زندگی کا بھلا کیا ہے اعتبار
آنے میں تیرا شوق تھا اے میرے دوستدار　　اب یاں سے جانے دینے میں ہے ہم کو اختیار
پہلے کا ذکر اب نہیں وہ بات اور تھی
یہ صحبت اور ہے وہ ملاقات اور تھی

ہنس ہنس کے آپ نے جو کہے حُر سے یہ کلام　　پھر جھک گیا قدم پہ وہ جرّار نیک نام
کی عرض جانے دیجئے مجھے سوئے فوجِ شام　　آقا اسی میں اب ہے سرافرازیِ غلام
دل کو یہ آرزو ہے کہ زخموں سے چور ہوں
عزت ہو گر ہراولِ فوجِ حضور ہوں

حوریں بہشت سے مجھے دیتی ہیں یہ صدا　　اے میہمانِ حسینؑ کے جنت میں جلد آ
دنیا میں غیرِ رنج و مصیبت ہے اور کیا　　دیکھ آن کر یہ باغ یہ انہار یہ فضا
پانی یہاں کا پی کے وہ لذت اٹھائے گا
دنیا کی نعمتوں کا مزا بھول جائے گا

دعوت کریں گے آج تری شیرِ کردگار　　جلد آ محمدِ عربی کو ہے انتظار
حاضر ہیں خوانِ نعمتِ فردوس بے شمار　　آراستہ ہے قصر ترا اے وفا شعار
ہم ہیں نثار کو طبقِ زر لئے ہوئے
زہرا کھڑی ہیں ساغرِ کوثر لئے ہوئے

فرمایا شاہ نے یہی مرضی ہے گر تو خیر
ہے تلخ زندگی کا مزا دوست کے بغیر
خالق تجھے نصیب کرے اُس چمن کی سیر
بھائی حسینؑ تجھ کو سمجھتا نہیں ہے غیر
تیری مفارقت میں نہایت ملال ہے
اللہ جانتا ہے جو کچھ دل کا حال ہے

یہ کہہ کے لپٹے حُر سے شہِ آسماں وقار
رونے پہ شہ کے روتے تھے سارے رفیق و یار
مہماں کے غم میں قاسم و اکبر تھے اشکبار
بیتاب تھے حبیب، علمدار بے قرار
باہر جو غل تھا رخصتِ مہمانِ شاہ کا
سیدانیوں میں شور تھا فریاد و آہ کا

ناگاہ نکلی خیمہ سے فضہ بہ اضطراب
چادر قدم تک اور رُخِ پاک پہ نقاب
کی عرض یا امامِ دو عالم فلک جناب
کہتی ہے میہماں کو دعا بنتِ بوتراب
اُن کا یہی ہے کام جو خوش اعتقاد ہیں
زہرا کی بہویں بیٹیاں سب اُن سے شاد ہیں

فرمایا ہے کہ اے مرے بھائی کے خیر خواہ
چڑھ آئی ہے حسینؑ پہ کیوں شام کی سپاہ
ہے کیا ارادۂ پسرِ سعدِ رُو سیاہ
اللہ جانتا ہے کہ سید ہے بے گناہ
بستی محمدِ عربی کی اُجڑ نہ جائے
پردیس میں حسینؑ سے زینب بچھڑ نہ جائے

حُر نے سُنے یہ حضرتِ فضہ کے جب کلام
ڈیوڑھی کی سمت جھک کے ادب سے کیا سلام
کی عرض اے کنیزِ بتولِ فلک مقام
پھر جا کے اس گروہ کو سمجھائے گا غلام
ہے یہ دعا کہ صلح سپاہِ عدو کرے
آلِ نبیؐ سے مجھ کو خدا سُرخرو کرے

یہ عرض کر کے شیر نے کھینچا فرس کا تنگ　　چڑھتے ہی مثلِ برق لگا کوندنے سمنگ
چہرہ ہوا وفورِ شجاعت سے لالہ رنگ　　سینے میں اُلفتِ شہِ دیں دل میں شوقِ جنگ
پرتو جو پڑ گیا تھا امامِ غیور کا
جلوہ تھا روئے پاک پہ ایماں کے نور کا

حُر کی میدان میں آمد، جنگ اور شہادت

رہوار کی وہ شان سواری کا وہ سماں　　سر پہ تو خود بر میں زرہ دوش پہ کماں
وہ تیغِ تیز دستِ جری میں کہ الاماں　　بدلے سپر کے ساتھ دعائے شہِ زماں
ہم پنجہ کون ہو کہ یداللہ ساتھ ہیں
دستانوں سے عیاں تھا کہ لوہے کے ہاتھ ہیں　(ہے شورِ آمد آمدِ حُر.....)
دیکھا سیاہ کاروں نے جب رُخِ حُر کا نور　　غل پڑ گیا یہ حور ہے یا روشنیٔ طور
حُر نے کہا کہ عقل کا تم سب کی ہے قصور　　حُر ہوں غلام شہ کا، فرشتہ ہوں میں نہ حور
ہے روشنی جو رُخ پہ فزوں مہر و ماہ سے
خلعت ملا ہے نور کا سرکارِ شاہ سے
وہ لُٹ رہا ہے خُلد جسے ہو طلب وہ جائے　　ممکن نہیں کہ وقت پھر ایسا جہاں میں پائے
لے جائے جانِ پاک کے جو جس کے ہاتھ آئے　　ایسا سخی نہیں جو کسی سے وہ منہ پھرائے
ہے دوست پر حلال عدو پر حرام ہے
سرکارِ ابنِ فاطمہ میں فیضِ عام ہے
بھولے ہو راہِ راست تو رہبر کے پاس جاؤ　　دنیا محل فریب کا ہے دام میں نہ آؤ
دوزخ کی راہ چھوڑ کے گھر خلد میں بناؤ　　بھوکے ہو نعمتوں کے تو پھل برچھیوں کے کھاؤ

زہرا کا نورِ عین تمہارا کفیل ہے
پیاسو چلو کہ چشمۂ کوثر سبیل ہے

کعبہ سے منہ پھرا کے نہ ہو ساکنِ کنشت
لازم ہے عاقلوں کے لئے ترکِ فعلِ زشت
سرسبز یاں نہ ہوگی کبھی عاقبت کی کشت
دوڑو کہ لٹ رہے ہیں اُدھر حلّۂ بہشت
دینِ نبیؐ میں آؤ نہ کافر کا ساتھ دو
دستِ خدا کے لال کے ہاتھوں میں ہاتھ دو

دیکھو مری طرف، میں وہی ہوں جو تھا اُدھر
یوں نور تھا کبھی مرے چہرے پہ جلوہ گر؟
یہ دبدبہ یہ اوج یہ حشمت یہ کرّ و فر
مولا کی اک نگاہِ عنایت کا ہے اثر
پڑھتے ہوئے درود ملک ساتھ آئے ہیں
یہ سب شرف حسینؑ کے صدقے میں پائے ہیں

اس گفتگو سے حُر کی ہوئے اہلِ کیں خجل
کانپے بدن، لرزنے لگے چھاتیوں میں دل
کتنے جواں تو رونے لگے ہو کے منفعل
چلّایا شمر آن کے ہر صف کے متّصل
مارو اِسے، کچھ اس کے نہ ہونے کا غم نہیں
دشمن کا ہو جو دوست، وہ دشمن سے کم نہیں

یہ سُن کے حُر پہ چلنے لگے تیر بے شمار
نیزہ ہلا ہلا کے صفوں سے بڑھے سوار
تیغیں ہوئیں بلند چلے برچھیوں کے وار
لشکر میں مثلِ شیرِ دَر آیا وہ نامدار
پہلے ہی جن کے وار چلے تھے سو چل گئے
دیکھی جو تیغ حُر کی چمک، دم نکل گئے

چہرے چھپائے پشت سے ڈھالوں کو کھول کے
پیچھے ہٹے بڑھے تھے جو تیغوں کو تول کے
بھاگے سوار پھر تو پیادوں کو رول کے
پہونچا وہ شیر بیچ میں اعدا کے غول کے

غل تھا کہ آج خاتمہ لشکر کا ہو گیا
اک اک قدم پہ ڈھیر تن و سر کا ہو گیا

ہر دم تھی جنگ میں برشِ تیغ حق دو چند   خوں گھٹ گئے تنوں کے بڑھا جس طرف سمند
دستِ اماں کٹے تھے اُدھر کے علم بلند   تھرا رہے تھے برچھیوں والوں کے بند بند
تیغوں کی کچھ خبر تھی نہ ڈھالوں کا ہوش تھا
نیزہ ہر اک سوار کو اک بارِ دوش تھا

دہشت سے سہم کر قدر انداز مر گئے   رُخ پھر گئے کمانوں کے چلّے اُتر گئے
ترکش سے تیر گر کے زمیں پہ بکھر گئے   ہرگز ملا نہ گوشۂ راحت جدھر گئے
دانستہ سرکشوں نے جو کارِ خطا کیا
تقدیر نے نشانۂ تیرِ قضا کیا

تن سیکڑوں زمین پہ بے سر دکھا دیئے   اجزائے جسم خاک پہ ابتر دکھا دیئے
چشمِ غضب نے شیر کے تیور دکھا دیئے   ہاتھوں نے زورِ تیغ نے جوہر دکھا دیئے
یوں جست کی سمند نے لاشوں کو روند کر
بجلی فلک سے گرتی ہے جس طرح کوند کر

دہنی طرف گیا تو رسالے قلم ہوئے   ترکش سے جس نے تیر نکالے قلم ہوئے
آیا اِدھر تو برچھیوں والے قلم ہوئے   حملہ کیا پلٹ کے تو بھالے قلم ہوئے
اعدا کے ہوش برقِ اجل نے اُڑا دیئے
ڈھالوں کے پھول تیغ کے پھل نے اُڑا دیئے

یوں تن سے سر گراتی تھی شمشیرِ آبدار   جیسے رگِ سحاب کبھی ہو تگرگ بار
دو ہو گیا وہ صاف، کیا جس پہ ایک وار   غلطاں لہو میں تھے کہیں پیدل کہیں سوار

ہر صف میں اُس جری کی لڑائی کا شور تھا
ہر غول میں نبیؐ کی دہائی کا شور تھا

چلائے تب حسینؑ کہ بس اے دلیر بس
مقتل میں ہر طرف ہوئے لاشوں کے ڈھیر بس
اعدا دہائی دیتے ہیں گھوڑے کو پھیر بس
اُمت ہے یہ نبیؐ کی بس اے میرے شیر بس

شاباش حقِ دوستیِ پنجتن ہے یہ
غربت بھی اب دکھا کہ ہمارا چلن ہے یہ

یہ سُن کے ہاتھ روک لیا اُس جری نے جب
بولا یہ شمر ٹوٹ پڑو اس پہ مل کے سب
یاں غم سے بے قرار ہوئے شاہِ تشنہ لب
تیغوں کے وار چلنے لگے حُرؑ پہ بے غضب

کاری جو زخم تن پہ لگے اُس دلیر کے
تکنے لگا حسینؑ کو منہ پھیر پھیر کے

سینہ سے جب کہ ہو گئی برچھی ستم کی پار
گھوڑے پہ ڈگمگانے لگا حُرِّ نامدار
رکھ کر جگر پہ ہاتھ پکارا وہ دلفگار
اے فاطمہ کے لال یہ خادم ہوا نثار

اب شفقتِ امامِ حجازی کا وقت ہے
آقا یہی غلام نوازی کا وقت ہے

جس دم سُنی امامِ اُمم نے صدائے حُر
چھاتی پہ ہاتھ مار کے بولے کہ ہائے حُر
رو کر کہا رفیقوں سے دیکھیں وفائے حُر
خیمہ میں پیٹنے لگی زینب برائے حُر

کھینچی جو شہ نے آہ دلِ بے قرار سے
نکلی تڑپ کے فاطمہؑ زہرا مزار سے

دوڑے ادھر سے رن کی طرف سیّدِ اُمم
آئے نجف سے حیدرِؑ صفدر بچشمِ نم
آواز دی نبیؐ نے کہ حُر کو لئے ہیں ہم
اُس وقت پہونچے شاہ کہ وہ توڑتا تھا دم

سر کاٹنے کی فکر میں جو تھے وہ ہٹ گئے
مہماں سے اپنے دوڑ کے حضرت لپٹ گئے

زانو پہ رکھ لیا سرِ حُرؑ اور یہ کہا   بھائی حسینؑ آیا ہے آ ہوش میں ذرا
آنکھیں قدم پہ مَل کے یہ بولا وہ باوفا   مولا ہزار جان سے میں آپ پر فدا
جن کے لئے زمیں پہ مَلک سر جھکائے ہیں
وہ لوگ خُلد سے مرے لینے کو آئے ہیں

زانو پہ سر ہے آپ کے یا شاہِ بحر و بر   محبوبِ کبریا ہیں اِدھر شیرِ حق اُدھر
یہ کون بی بی ہیں مرے پہلو میں نوحہ گر   شہ نے کہا کہ روتی ہیں اماں برہنہ سر
تو حشر تک امامِ دو عالم کے ساتھ ہے
ماتم ترا حسینؑ کے ماتم کے ساتھ ہے

یہ سنتے سنتے غیر ہوا اُس جری کا حال   زانوئے شاہِ دیں پہ کیا حُرؑ نے انتقال
خیمے کے در پہ لاش کو لایا علی کا لال   سب بیبیوں نے کھول دئیے اپنے سر کے بال
زینب یہ روئی شہ کے فدائی کے واسطے
جیسے بہن تڑپتی ہے بھائی کے واسطے (طے کر چکا جو منزلِ شب...)

انصار کا ایثار

نصف النہار تک تھا یہی شورِ کارزار   مرنے کو یہ چلا وہ تڑپ کر ہوا نثار
رخصت اسے کیا تو اُسے روئے زار زار   جاتے تھے آپ لاش اُٹھانے کو بار بار
ایک ایک نے سعادتِ عقبیٰ حصول کی
دم نکلے سب کے گود میں سبطِ رسولؑ کی (جب کربلا میں داخلۂ شاہِ دیں ہوا)

حُر و بُرَیر و وہب و عمیرِ فلک مقام
وہ مسلم ابنِ عوسجۂ عرش احتشام
سعد و زہیر قین و حبیبِ خجستہ کام
وہ شیر جس کا بوعمرِ نہشلی تھا نام
جس غول پر جھپٹ کے یہ آئے وہ ہٹ گیا
ایک ایک مرتے مرتے پروں کو اُلٹ گیا (جاتی ہے کس شکوہ سے ...)

جس غول پہ جھپٹ کے گئے صورتِ اسد
بھاگے وہ لوگ چھوڑ کے دشتِ ستم کی حد
لاکھوں میں اُن کا وار کوئی کر سکا نہ رد
نعرہ ہر ایک ضرب پہ تھا یاعلیؑ مدد
دُو دُو کرتے تھے وہ مجمعِ قومِ جہول میں
گھوڑوں کو عرض میں تو سواروں کو طول میں

کس کس دلاوری سے وہ خاصانِ رب لڑے
اس شان سے کبھی نہ عجم نہ عرب لڑے
دریا کی سمت رُخ نہ کیا تشنہ لب لڑے
پیاسے تھے تین روز کے لیکن غضب لڑے
بے دست ہو گئے تو یہ جوہر دکھا گئے
لوہے کو مثلِ شیرِ درندہ چبا گئے

الحق تھے شیرِ بیشۂ ہیجا وہ صف شکن
مرنے کی یہ خوشی تھی کہ خنداں تھے زخمِ تن
کھا کھا کے تیر کہتے تھے وہ غیرتِ چمن
قربان بندہ پروریِ سرورِ زمن
غازی ستمگروں سے دغا کر کے مر گئے
حقِ نمک تو تھا وہ ادا کر کے مر گئے (ملے کر چکے حسین ....)

امام حسینؑ کی نمازِ ظہر

آیا زوال دن میں جو مہرِ منیر پہ
غم کا فلک گرا شہِ گردوں سریر پہ
نرغہ تھا شامیوں کا جہاں کے امیر پہ
پڑتی تھی تیغ تیغ پہ اور تیر تیر پر

مرنے لگے رفیق شہِ کم سپاہ کے
دس بیس تارے رہ گئے ہمراہ ماہ کے

واں ہل رہی تھی نالۂ شہنا سے سب زمیں
فکرِ نمازِ ظہر میں تھے یاں امامِ دیں
تھے منحرف جو قبلۂ ایماں سے وہ لعیں
غلِ اُقتلوا الحسینؑ کا کرتے تھے اہلِ کیں
دشمن تھی سب سپاہ، شہِ سرفراز کی
ملتی نہ تھی امام کو مہلت نماز کی

بڑھ کر ابوثمامہ نے اُس دم کیا خطاب
اے ظالمو تہ خانۂ دیں کو کرو خراب
ہے کون سی خطا کہ جو ہو مانعِ ثواب
شہ کو نماز پڑھنے کی مہلت دو اب شتاب
مارو نہ تیر ربِّ دو عالم کے واسطے
تیغوں کو کر لو میاں میں اک دم کے واسطے

تیوری چڑھا کے ابنِ انس نے یہ تب کہا
کیسی نماز کہتے ہیں کیا شاہِ کربلا
مانیں گے ہم کبھی نہ یہ باتیں دمِ وغا
کچھ ہو مگر بچے گا نہ فرزندِ مرتضےٰ
پوچھو کہ بندگی سے تمھیں کیا حصول ہے
اس وقت کی نماز بھلا کب قبول ہے

تھرا گئے یہ سُن کے شہِ عرش بارگاہ
رو کر عجیب یاس سے گردوں پہ کی نگاہ
حق سے دعا یہ کی کہ الٰہی تو ہے گواہ
ایذا ترے حسینؑ کو دیتے ہیں رو سیاہ
ناحق ستاتے ہیں دلِ زہراؑ کے چین کو
ملتی نہیں نماز کی مہلت حسینؑ کو

مولا کی اس فغاں سے ہلا آسمانِ پیر
بولے یہ دست بستہ زہیرِ فلک سریر
حضرت پڑھیں نماز ستاتے ہیں گو شریر
روکوں گا اپنے تن پہ میں زخمِ سنان و تیر

ٹوکے، یہ کیا مجال کسی پر غرور کی
تیغوں میں اب غلام سپر ہے حضور کی

اُس باوفا کا جب یہ سخن آپ نے سُنا		فرمایا اے زہیر خوش انجام مرحبا
اِس امر خیر کی تجھے اللہ دے جزا		تجھ کو لکھے نماز گزاروں میں کبریا
جنت سے فاطمہ ترے لاشے پہ آئیں گی
حوریں تجھے شراب طہورا پلائیں گی

یہ کہہ کے شاہ محوِ عبادت ہوئے ادھر		وہ دونوں شیر سامنے آکر بنے سپر
جب تک نماز پڑھتے رہے شاہِ بحر و بر		سر کے تا اُن کے پاؤں خوشا دل، زہے جگر
کچھ پہلے زخم کھائے تھے کچھ تیر پھر پڑے
شہ پڑھ چکے نماز تو وہ شیر گر پڑے		(آیا زوال دن میں ....)

جب داخلِ جناں ہوئے وہ خاصگانِ حق		برہم ہوئے نبی کے مرقع کے بھی ورق
فرزندِ فاطمہ کو نہایت ہوا قلق		صدمے سے ہو گیا رُخِ انور کا رنگ، فق
چمکی جو اُن کی تیغ تو بجلی چمک گئی
شیروں کی آنکھ خوف کے مارے جھپک گئی		(ملے کر چکے حسین ....)

فرزندانِ مُسلم کا جہاد اور شہادت

نکلے وغا کو حضرتِ مسلم کے سر فروش		نعرے کئے کہ ہو گئے پیر و جواں خموش
تھے بچپنے میں عقل کے پُتلے وہ اہلِ ہوش		صف کوفیوں کی دیکھ کے کھایا لہو نے جوش
دعوے کئے ولائے امام جلیل کے
عاقل سمجھ گئے کہ ہیں پوتے عقیل کے

نعرے کئے غضب میں کہ اے قومِ بے شعور   کوفے کے نامدار قریب آئیں کیوں ہیں دور
نکلے بخدا اپنے دلوں کا تو ہو سرور   لیں گے پدر کے خوں کا عوض آج ہم ضرور
مٹ جائیں رنگ کفر پرستی کے تو سہی
گُل ہوں چراغ شام کی بستی کے تو سہی

یہ کہہ کے جا پڑے وہ نمودار فوج میں   ہر سمت غدر ہو گیا غدّار فوج میں
چاروں طرف جو چلنے لگے وار فوج میں   دریائے خوں رواں ہوا خونخوار فوج میں
اس رنگ سے دغا کا عوض بر ملا لیا
بابا کے خون کا بیٹوں نے یوں خوں بہا لیا

وہ بانکے بچپنے وہ لڑکپن کے طنطنے   پلکوں کے تیر وہ کہ ہزاروں کے دل چھنے
آنکھیں لڑیں تو دشت میں ضیغم ہرن بنے   حلقے کئے کبھی، کبھی جھومے، کبھی تنے
کوفے کے یل جو پست دمِ جنگ ہو گئے
بالیدگی سے رخت بدن تنگ ہو گئے

آئے جو دشت سے لبِ دریا دمِ جدال   دو بھائیوں کے قتل کا صاف آگیا خیال
روئے لہو کے اشک کے دونوں وہ خورد سال   قاتل نہ ہاتھ آیا تو برہم ہوئے کمال
نکلیں نہ حسرتیں دلِ ناشاد کام کی
تلواریں ماریں گھاٹ پہ حارث کے نام کی   (اے خوشی کلک رزم کا ...)

جب نونہالِ گلشنِ مسلم قلم ہوئے   غل تھا یتیم کشتۂ تیغِ ستم ہوئے
بیوہ کے لال فدیۂ شاہِ امم ہوئے   دو شیر اور فوجِ حسینی میں کم ہوئے
خیمے میں ہائے ہائے کی اک دھوم پڑ گئی
روتے تھے سب کہ رانڈ کی بستی اُجڑ گئی

پسرانِ زینبؑ کا جہاد اور شہادت

اُس دم سوائے لختِ دلِ شیرِ ذوالجلال باقی تھے بس یہ پانچ غضنفر بہ صد جلال
عباسؑ سا جری علی اکبر سا نونہال زینب کے دو صغیر پسر اک حسنؑ کا لال
پانچوں یہ شیر رن کا ارادہ کئے ہوئے
شہ کی سپر تھے ہاتھوں میں تیغیں لئے ہوئے

عباسؑ چاہتے تھے کہ جائیں وغا کو ہم اکبرؑ کھڑے تھے مرنے کی کھائے ہوئے قسم
قاسمؑ یہ کہہ رہے تھے کہ اب زندگی ہے ستم زینب کے لال ماموں کو تکتے تھے دمبدم
حضرت کسی کے باب میں کچھ کہہ نہ سکتے تھے
واں شوقِ جنگ تھا ادھر آنسو ٹپکتے تھے

حسرت سے دیکھتے تھے اُنھیں شاہِ تشنہ لب فوجِ امیرِ شام اُدھر تھی وغا طلب
اکبرؑ سے بڑھ کے ابنِ حسنؑ نے کہا یہ تب ہو آپ کی صلاح تو ہم مرنے جائیں اب
رخصت کی شاہِ دیں سے گزارش ضرور ہے
ہاں بھائی جان آج سفارش ضرور ہے

یاد آگئی ہے ہم کو وصیت پدر کی آج کچھ خود بخود شگفتہ ہے گُل کی طرح مزاج
مرنا قدم پہ شاہِ اُمم کے ہے تخت و تاج رخصت میں سعی کی بھی نہیں ہم کو احتیاج
کوئی بڑھے گا آج جو تلوار تول کے
بندہ سند دکھائے گا بازو سے کھول کے

نزدیک تھے زینب کے لالہ فام گھبرائے جب یہ ابنِ حسنؑ نے کئے کلام
سوچے کہ ہم سے پہلے جو قاسم ہوئے تمام دیکھیں گی منہ ہمارے نہ پھر خواہرِ امام

جو حکم ہے بجا اُسے لائیں تو خوب ہے
ہم اُن سے پہلے مرنے کو جائیں تو خوب ہے

یہ سوچ کر بڑھے وہ گلِ باغِ بوتراب
رو کر یہ نونہالِ حسنؑ سے کیا خطاب
بہرِ اذنِ جنگ نہ مانگیں ابھی جناب
آئے گا ہم پہ بنتِ یداللہ کا عتاب

وہ دن ہے آج روتے تھے جس دن کے واسطے
سمجھا یہ خانہ زاد ہیں کس دن کے واسطے

یہ کہہ کے واں سے آئے قریبِ شہِ اُمم
ہاتھوں کو جوڑ جوڑ کے بولے بچشمِ نم
کیوں ماموں جان آپ سے یہ پوچھتے ہیں ہم
اب کس کو بھیجئے گا سوئے لشکرِ ستم

شہ نے کہا قلق ہے دلِ نامراد کو
یہ قصد ہے کہ اب ہمیں جائیں جہاد کو

یہ سن کے ماں کے پاس گئے دونوں مہ لقا
ڈر ڈر کے کانپ کانپ کے چپکے سے یہ کہا
ہم مانگتے ہیں دیر سے میدان کی رضا
دیتے نہیں مگر شہِ دیں رخصتِ وغا

بے وجہ خادموں سے مکدّر حضور ہیں
اماں خدا گواہ ہے ہم بے قصور ہیں

بولی یہ رو کے خواہرِ سلطانِ بحر و بر
اب دھیان آیا مر گئے مسلم کے جب پسر
لاشے پہ لاشے آنے میں گذری ہے دوپہر
کیا کر رہے تھے صبح سے حیراں ہوں تھے کدھر

اس دم بھی میرے پاس نہ آتے تو خوب تھا
اکبر کے بعد مرنے کو جاتے تو خوب تھا

کیا ہو گئیں وہ رات کی شیریں زبانیاں
سمجھی تھی میں خلاف ہیں یہ خوش بیانیاں
بچپن کی ناصبیوں سے ہیں پیدا نشانیاں
نو دس برس کے خود ہیں کہاں نوجوانیاں

لڑکوں میں کھیلنے کی بھی خو تک گئی نہیں
دونوں کے مُنہ سے دودھ کی بُو تک گئی نہیں

کس نے کہا تھا چاہے گا گر ربِّ بے نیاز
کل ہوں گے ہم نثارِ شہنشاہِ سرفراز
عاقل ہے کب، جسے نہ سخن میں ہو امتیاز
کرتے ہیں ہوشمند تعلّی سے احتراز
جو نکلے منہ سے بات بشر اُس کی جانچ کرے
ماں سے جو کچھ کہا تھا خدا اس کو سچ کرے

سمجھی تھی میں کہ پہلے فدا ہو گے شہ پہ آج
کوتاہیاں جو بخت کی ہوں اُن کا کیا علاج
دنیا سے اُٹھ گیا ہے محبت کا اب رواج
نصرت کی کچھ نہیں مرے بھائی کو احتیاج
صدقے ہوئے نہ شہ پہ تو ماں سے جُدا رہو
غیرت ہو گر تو قبرِ پیمبر پہ جا رہو

کمروں کو کھولو، باندھا ہے کیوں نیمچوں کو اب
بیکار شے جو ہو اُسے رکھنے کا کیا سبب
دو دن کی بھوک پیاس سے چہروں پہ ہے تعب
دونوں کے ہیں ہراس سے منہ زرد خشک لب
حضرت پہ جو فدا ہیں وہ پیارے نبیؐ کے ہیں
اس پر نہ بھولنا کہ نواسے علیؑ کے ہیں

اِن تہمتوں پہ تھی طلبِ رایتِ رسول
دانا نکالتے نہیں منہ سے سخن فضول
تم کو تو ضد تھی میں نے کیا اُس کو نا قبول
اِس وقت تک نشاں کے نہ ملنے سے ہو ملول
ہاتھوں کے جوڑنے کو تو میں مانتی نہیں
ماں کیا تمہارے غصّوں کو پہچانتی نہیں

میرے تو رنج و غم میں ہیں ہوش و حواس گم
ہے ذکر صبح کا ابھی بھولے نہ ہو گے تم
بھائی کو دے چکے جو نشاں قبلۂ اُمم
بگڑے تھے تم علم کے لئے زادشانکم

تا دیر ابروؤں سے نہ غصے میں بل گئے
برہم ہوئی جو میں تو سمجھ کر سنبھل گئے

میں چاہتی اگر کہ ملے تم کو یہ علَم　　ایسا بھی تھا کہ دیتے نہ سلطانِ ذی حشم
کچھ سوچ کر خموش رہی میں اسیرِ غم　　گو ہمتیں زیادہ ہیں لیکن ہو سن میں کم
میراثِ مصطفیٰ کا کوئی مستحق نہیں
بیٹوں کے ہوتے کوئی نواسوں کا حق نہیں

کس کام کے ہو تم جو نہ ماموں کے کام آئے　　دونوں نے کیوں نہ اُن کے عوض اپنے سر کٹائے
مقتل سے ہٹ کھڑے ہوئے مرنے سے جی چرائے　　جی جاؤں گر یہ بات مجھے کبریا سنائے
غل ہو کہ چھوڑا دونوں نے دنیائے زشت کو
زینب کے لاڈلوں نے بسایا بہشت کو

ماموں بھی وہ کہ سمجھیں تمھیں اپنے تن کی جاں　　جانیں ہوئیں عزیز کہے گا یہ سب جہاں
روکی نہیں کسی نے کبھی خلق کی زباں　　بتلاؤ اس ملال سے جیتی رہے گی ماں
یہ ذکرِ بد جو بات بزرگوں کی کھوئے گا
کیا حال مجھ سی پالنے والی کا ہوئے گا

ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولے وہ لالہ فام　　غصہ نہ کیجیے تو کریں عرض یہ غلام
رخصت میں ہم تو صبح سے کرتے تھے اہتمام　　فرمایا یہ کہو گے کہ مانع رہے امام
پالا ہے تم کو فاطمہ کے نورِ عین نے
پھر کیا ہوا اگر تمھیں روکا حسینؑ نے

لو اب کھلا انھوں نے نہ جانے دیا تمھیں　　رخصت کا حرف لب پہ نہ لانے دیا تمھیں
حضرت نے میرے پاس نہ آنے دیا تمھیں　　آئے جواب یہ ہوش خدا نے دیا تمھیں

بچے ہیں گو یہ فہم و فراست میں دُور ہیں
مطلب یہ بات کا ہے کہ ہم بے قصُور ہیں

یہ سُن کے گر پڑے وہ جری ماں کے پاؤں پر — غربت پہ دونوں بچوں کی ٹکڑے ہوا جگر
بولی یہ بھر کے آنکھوں میں آنسو وہ نوحہ گر — مختار ہیں امامِ زماں شاہِ بحر و بر
بوسے قدم پہ شاہ کے ہاں دے کے جائیو
اب جائیو تو اُن سے رضا لے کے جائیو

میں کون ہوں جو دوں گی تمہیں رخصتِ جدال — حضرت سے اپنے مرنے کا جا کر کرو سوال
وہ دیں رضا تو جاؤ سوئے عرصۂ قتال — مجھ کو نہیں تمہارے بچھڑنے کا کچھ ملال
ہاں شاد ہوں گی نام اگر کر کے آؤ گے
رو لوں گی میں بھی لاشوں پہ جب مر کے آؤ گے

جا کر گرو حضور کے قدموں پہ میں نثار — لیتے ہیں ہاتھ جوڑ کے رخصت وفا شعار
میرا کریں جو ذکر شہنشاہِ تاجدار — کہنا کہ دے چکیں وہ ہمیں اذنِ کارزار
ذی قدر ہے جو وقت پہ مرنے میں کد کرے
ہمت جو تم کرو تو خدا بھی مدد کرے

نکلے یہ سن کے خیمے سے باہر وہ گلبدن — دیکھا کہ رو رہے ہیں شہنشاہِ بے وطن
مجرے کے بعد لائے زبانوں پہ یہ سخن — قائم رہیں غلاموں کے سر پر شہِ زمن
آقا کا رحم و لطف زیادہ ہے باپ سے
ہم دونوں بھائی طالبِ رخصت ہیں آپ سے

بچوں کے منہ کو دیکھ کے بولے شہِ اُمم — کیا دے چکی رضا تمہیں مادر اسیرِ غم
کی عرض اُن سے اذنِ وغا پا چکے ہیں ہم — کہتی ہیں ہم غلاموں سے رو کر یہ دمبدم

ماموں پہ صدقے ہونے کو گر رن میں جاؤ گے
بخشوں گی پھر نہ دودھ جو مر کر نہ آؤ گے

یہ سُن کے اُن کو لے گئے گھر میں امامِ دیں ‎ ‎ ‎ ‎ چپ کی کھڑی تھیں در کے قریں زینبِ حزیں
بھائی کی بڑھ کے سر سے قدم تک بلائیں لیں ‎ ‎ ‎ ‎ شہ نے کہا بچھڑتے ہیں دونوں یہ مہ جبیں
فصل آئی خاندانِ علیؑ کے زوال کی
تم نے بھی ان کو دیدی اجازت جدال کی

دونوں یہ لاڈلے مجھے بیٹوں سے ہیں سوا ‎ ‎ ‎ ‎ ماموں سے ایک دم نہ ہوئے تھے کبھی جُدا
ہیں جعفرؑ و علیؑ کی نشانی یہ دلربا ‎ ‎ ‎ ‎ کیونکر جیوں گا چھوٹ گئے گر یہ مہ لقا
زینب یہ رن میں جا کے سلامت نہ آئیں گے
دو داغ ایک دل پہ اُٹھائے نہ جائیں گے

زینب نے عرض کی کہ بجا ہیں یہ سب کلام ‎ ‎ ‎ ‎ کیونکر نہ ہو حضور کے ادنیٰ ہیں یہ غلام
اِن کو نثار ہونے میں ہے فخر کا مقام ‎ ‎ ‎ ‎ گر آج مر گئے تو رہا تا بہ حشر نام
یہ بھی تو وارثِ شہِ دو سرا کے ہیں
حضرت کے بھانجے ہیں نواسے علیؑ کے ہیں

کس کی مجال ہے کہ جو دے ان کو رخصتیں ‎ ‎ ‎ ‎ حضرت سے ہاتھ جوڑ کے لے لیں اجازتیں
آقا پہ صدقہ ہوں گے خوشا ان کی قسمتیں ‎ ‎ ‎ ‎ دیکھیں تو آپ دونوں کے رُخ کی بشاشتیں
ثابت نہیں ہے کچھ کہ یہ دو دن کے پیاسے ہیں
پوتے ہیں کس دلیر کے کس کے نواسے ہیں

جرأت تو اس گھرانے کی عالم پہ ہے عیاں ‎ ‎ ‎ ‎ مردانگی میں ایک ہیں بچے ہوں یا جواں
دونوں نے مجھ سے کی ہیں جو کچھ ہمتیں بیاں ‎ ‎ ‎ ‎ ذکر ان کا گر کروں تو ہنسیں گے شہِ زماں

غصّے میں ایک دونوں کے چہروں کا رنگ تھا
چھوٹے میں سب علیؑ کی جلالت کا ڈھنگ تھا

کہتے تھے مجھ سے رات کو دونوں یہ گلعذار
اماں سحر کو ہوگی لڑائی جو آشکار
آقا سے لے کے رن کی اجازت بہ انکسار
پہلے ہمیں کو بھیجیے گا صبر کا مدار
پہونچیں گے دو دلیر جو اس عز و شان سے
ماریں گے ابنِ سعدِ ستمگر کو جان سے

گو جمع اُس طرف ہیں بد آئین و بد مآل
کوئی علیؑ کے لال تک آئے یہ کیا مجال
حاضر ہیں بندگانِ شہنشاہِ خوش خصال
مقتل کے مرز بوم کو کر دیں لہو سے لال
آفت ہو کچھ نہ سعد کے بیٹے سے بن پڑے
گھوڑوں کے تنگ خون میں ڈوبیں وہ رن پڑے

میں نے کہا تمہاری تو عمریں بہت ہیں کم
پانی ہوا نہیں تمہیں دو روز سے بہم
غصّے میں کانپ کے بولے رفیعِ حشم
کیا مرتضیٰ علیؑ کے نواسے نہیں ہیں ہم
قوت میں ہم ہیں نائبِ خیر البشر کی طرح
کوفے کے در کو توڑیں گے خیبر کے در کی طرح

دیکھیں گی اب حضور ہماری لڑائیاں
ہوں گی صفوں پہ ہاتھوں کی اپنے صفائیاں
سن لیں گی آپ فوجِ ستم کی دہائیاں
لاشوں سے پاٹ آئیں گے مقتل کی کھائیاں
جھپٹیں گے ہم جو گھوڑوں کی باگوں کو پھیر کے
لشکر کے پہلوانوں کو ماریں گے گھیر کے

گو سن میں کم ہیں، قد بھی کچھ ایسے نہیں طویل
ہمت میں بے نظیر ہیں، جرأت میں بے عدیل
اللہ بھوک پیاس میں بچوں کا ہے کفیل
چہرے جو سرخ ہیں یہ شجاعت کی ہے دلیل

پہلے پہل یہ جاتے ہیں تیغ آزمائی کو
حضرت بھی دیکھیں دُور سے ان کی لڑائی کو

طالب ہیں یہ تو رن کی رضا ان کو دیجیے
ہیں یہ تو خانہ زاد نہ غم ان کا کیجیے
نہ روئیے نہ خونِ جگر آپ پیجیے
میرا جو دھیان گر تو قسم مجھ سے لیجیے
حضرت کو ہے یہ رنج کہ برباد ہونگی میں
یہ مر کے آئیں گے تو بہت شاد ہونگی میں

باتیں یہ سُن کے رونے لگے شاہِ تشنہ لب
زینب نے دونوں بیٹوں سے بڑھ کر کہا یہ تب
واری سدھارو دیر مناسب نہیں ہے اب
تسلیم آخری کرو اس دم بصد ادب
آقا سے کہہ لو جو تمہیں کہنا ضرور ہو
سمجھاؤں اب میں کیا تمہیں، خود ذی شعور ہو

شہ کے قدم پہ جھک گئے زینب کے دلربا
کی عرض منتوں سے کہ اب دیجیے رضا
رونے لگے وہ جب تو بصد شفقت و عطا
فرمایا، خیر جاؤ سوئے گلشنِ بقا
غازی مرے نہیں ہیں کہیں نیک راہ میں
سونپا تمہیں امانِ رسالت پناہ میں

ماں نے کیا یہ مڑ کے اشارہ کہ میں نثار
کیا عزتیں حضور نے دیں اور کیا وقار
کیوں، تم نے دیکھی بخششِ سلطانِ نامدار
ماں واری جائے گرد پھرو شہ کے سات بار
رخصت کے مرتبے جو تمہیں ہاتھ آئے ہیں
یہ سب شرف امام کے صدقے میں پائے ہیں

ماں صدقے آکے اب مرے سینے سے سر لگاؤ
میری طرف سے دھیان کسی بات کا نہ لاؤ
پہلے خفا تھی اب نہیں کچھ رنج آؤ آؤ
اُلجھی ہوئی سنوار دوں زلفیں تو رن میں جاؤ

وہ رسم اب کرو جو ہوتی ہے بیاہ میں
دولہا بنا کے بھیجوں گی میں قتل گاہ میں

ہاں وقتِ جنگ بھائی سے بھائی جدا نہ ہو   کوئی لبوں پہ ذکرِ خدا کے سوا نہ ہو
ناقوں کا تشنگی کا زباں پر گلا نہ ہو   دریا پہ بھی تو حسبِ خاطر ذرا نہ ہو
دو دن سے تشنہ کام تمہارا امام ہے
دریا سے دور لڑکے مرو اس میں نام ہے

تم ہو غلامِ خاص شہِ کائنات کے   کیوں جاؤ کام کیا ہے کنارے فرات کے
پیچھو نہ تشنہ ہوں جام گرآبِ حیات کے   جو مرد ہیں وہ رہتے ہیں طالب ممات کے
تیغ و سپر سے وقتِ وغا کام چاہیے
جائیں رہیں و نہ رہیں نام چاہیے

تاثیر ماں کے دودھ کی بچو دکھائیو   مثلِ اسد جھپٹ کے ہر اک صف پہ جائیو
سینوں پہ زخمِ نیزہ و شمشیر کھائیو   ڈھالوں کو وقتِ حرب زخموں پہ نہ لائیو
یوں کیجیو وغا جو شجاعوں کا ڈھنگ ہے
منہ کو چھپانا جنگ میں مردوں کا ننگ ہے

تم تو خدا کے فضل سے شیروں کے شیر ہو   قوت دکھاؤ وہ کہ زبردست زیر ہو
دنیا سے جلد جانے میں پیارو نہ دیر ہو   میں خود سمجھ گئی ہوں کہ جینے سے سیر ہو
مردانگی ہے ہاشمیوں کی سرشت میں
خوں میں نہا کے جائیو سیدھے بہشت میں

ہاتھوں کو جوڑ جوڑ کے بولے وہ تشنہ کام   فرما دیا ہے جو وہی ہوئے گا لاکلام
ہے پاس آبرو ہمیں اے خواہرِ امام   دریا کو آنکھ اٹھا کے نہ دیکھیں گے یہ غلام

غل ہو گا چھوٹے سن میں بڑے نام کر گئے
سن لیجیے گا آپ کہ پیاسے گذر گئے

خوش ہو کے لائیں کشتیوں میں فاخرہ لباس — پہلے سنواریں دونوں کی زلفیں بہ دردو یاس
کپڑے پہنا کے کہنے لگیں وہ فلک اساس — واری چلو سلام کو شاہِ امم کے پاس
شادی بڑی ہے ماں کے دلِ نامراد کو
حضرت کے گرد پھر کے سدھارو جہاد کو

حضرت کے گرد پھر کے چلے جب وہ مہ لقا — دونوں سے رو کے شاہ کی ہمشیر نے کہا
دیکھو کھڑے ہیں سب حرم سبطِ مصطفیٰ — مجرے کرو جھکا کے سروں کو یہ ماں فدا!
لاکھوں سے بہرِ حرب جو مقتل میں جاؤ گے
دل ماں کا بولتا ہے کہ پھر کر نہ آؤ گے

تسلیم کر کے بس ہوئے رخصت وہ لالہ فام — بچوں کے ساتھ ساتھ تھیں سیدانیاں تمام
اٹھا حرم کے خیمے کا پردہ بہ احترام — نکلے عجیب شان سے دو آسماں مقام
چہروں سے آفتاب کی ضو گرد ہو گئی
مقتل کی دھوپ گرم جو تھی سرد ہو گئی (جب کربلا میں نورِ سحر…)

تسلیم کر کے گھوڑوں پہ وہ نازنیں چڑھے — غل پڑ گیا جہاد پہ دو مہ جبیں چڑھے
یوں اشہبوں پہ دلبرِ ضرغامِ دیں چڑھے — نظروں سے سب اتر گئے گھوڑے زمیں چڑھے
پریاں نکل کے قاف کی راہوں سے چھپ گئیں
دو بجلیاں چمک کے نگاہوں سے چھپ گئیں

پہونچے جو رن میں برجِ شرف کے وہ آفتاب — نیزے زمیں پہ گاڑ دیئے مثلِ بوتراب
نعرہ کیا کہ او پسرِ سعدِ بے حجاب — ہمراہ لے کے شمر کو آ سامنے شتاب

گو سینکڑوں سوار ہزاروں پیادے ہیں
تلوار پہلے تجھ سے چلے یہ ارادے ہیں

ہم نے سنا ہے کہ قریشی نسب ہے تو — نیکوں میں بد ہوئے ہیں بدوں میں خجستہ خو
ہم ٹوکتے ہیں او سگِ ناپاک کینہ جو — شیروں سے آ دغا کو جو ہے پاس آبرو
فاقوں میں زور دیکھ جدال و قتال دیکھ
دعویٰ ہے کچھ تو ہاشمیوں کا جلال دیکھ

ماں بنتِ فاطمہؑ ہیں بنی فاطمہؑ ہیں ہم — دادا ہیں ابنِ عمِ رسولِؐ فلک حشم
ہیں اس طرح نسب میں نبیؐ و علیؑ بہم — دو نام گو ہیں ایک ہے پر کعبہ و حرم
بھائی جدا ہے خویش جدا ہے وصی جُدا
اُن سے علیؑ جُدا نہ خدا سے نبیؐ جدا

چھوٹے نے کی یہ عرض کہ بڑھیے بس اب حضورؑ — مخفی ہوا ہے خیمے میں ڈر کر وہ بے شعور
ہوتا ہے اور دھوپ اب پیاس کا وفور — مرنا ہے ہر طرح یہ تأمل ہے کیا ضرور
دو ہاتھ میں بھگا کے سواروں کو گھاٹ کے
خیمہ گرا دیں اِس پہ طنابوں کو کاٹ کے

کھینچے پکڑ کے تیغے دونوں نے یک بیک — پہونچی زمیں سے آئینۂ مہر تک چمک
گاؤ زمیں اِدھر تھی ہراساں اُدھر سمک — دب کر پروں پہ نادِ علیؑ پڑھتے تھے ملک
غل تھا چمک دمک وہی سب آشکار ہے
اِک جا ہیں دو یہ تیغے یا ذوالفقار ہے

دو بجلیاں سپاہ میں کوندیں فرس بڑھے — جس طرح قافلے سے صدائے جرس بڑھے
اب کون روکے شیر بڑھے جب تو بس بڑھے — مقتل میں پس ہو کے گرے وہ جو دس بڑھے

بچوں نے زورِ حق کے ولی کا دکھا دیا
سب رنگ ڈھنگ ضربِ علی کا دکھا دیا
آئے جدھر خدا کا غضب آ گیا اُدھر ۔ پلٹے جدھر یہ رعبِ علیؑ چھا گیا اُدھر
جھپٹے جدھر شکست عدو پا گیا اُدھر ۔ ٹھہرے جہاں کسی سے نہ دیکھا گیا اُدھر
انساں تو کیا ہے شیروں کے زہرے بھی آب ہیں
آنکھیں ملائے کون کہ دو آفتاب ہیں
کیا دونوں تازیوں کی سبک تازیاں لکھوں ۔ کیونکر رواروی میں خوش اندازیاں لکھوں
کس طرح نیمچوں کی سر افرازیاں لکھوں ۔ کیا دونوں شاہزادوں کی جانبازیاں لکھوں
پوتے ہیں کس جری کے خلف کس ولی کے ہیں
اعلیٰ یہ مدح ہے کہ نواسے علیؑ کے ہیں
جو شیرِ حق میں تھی وہ شجاعت انھیں میں ہے ۔ جعفرؑ کی شان و شوکت و صولت انھیں میں ہے
شبیرؑ سے کریم کی ہمت انھیں میں ہے ۔ کونین بخش دیں یہ سخاوت انھیں میں ہے
گو ان کے مدح خوانوں کے لب بے سوال ہیں
منہ بھر دیں موتیوں سے یہ زینب کے لال ہیں
وہ چھوٹے چھوٹے خود وہ پیشانیوں کی شاں ۔ وہ دبدبہ وہ رعب وہ عمرانیوں کی شاں
دینداریوں کا نور خدا دانیوں کی شاں ۔ وہ دونوں نیمچوں کی سر افشانیوں کی شاں
بھیم چھلے پہ زور گھٹا کچھ نہ کس گیا
جب چمکے مینہ سروں کا سراسر برس گیا
وہ گورے گورے ہاتھ وہ نازک کلائیاں ۔ وہ بازوؤں کا زور وہ تیغ آزمائیاں
وہ نیمچوں میں سیفِ علی کی صفائیاں ۔ وہ دولے وہ پیلے پیل کی لڑائیاں

جس غول پر وہ صاحبِ شمشیر آپڑے
ثابت ہوا کہ فوج پہ دو شیر آپڑے

جس پہلواں پہ عون کی تلوار پڑ گئی — چہرہ تو کیا ہے زیست کی صورت بگڑ گئی
چھوٹے کی آنکھ جس سے لڑائی میں لڑ گئی — سر تیز اک سناں تھی کہ پتلی میں گڑ گئی
آنکھوں کو روکے صف سے وہ مردک نکل گیا
گویا قضا کو توڑ کے ناوک نکل گیا

اک شور تھا کہ چشم نمائی غضب کی ہے — آفت کا معرکہ ہے لڑائی غضب کی ہے
یہ گھات قہر کا یہ ترائی غضب کی ہے — چھوٹے سے نیمچوں کی صفائی غضب کی ہے
دونوں ہیں نورِ عین علیؑ سے غیور کے
آنکھیں نکال لیں جو کوئی دیکھے تو گھور کے

اللہ کا غضب اُدھر آیا جدھر بڑھے — پہونچا سروں پہ تیغ کا سایہ جدھر بڑھے
جلوہ عروسِ فتح نے پایا جدھر بڑھے — گھونگھٹ سپاہِ شام نے کھایا جدھر بڑھے
گرتی تھی برق لشکرِ ابنِ زیاد پر
گویا چڑھے تھے دونوں دولھا جہاد پر

ماتھے وہ اور وہ پیچ عماموں کے لٹ پٹے — گیسو وہ بنتِ فاطمہؑ کے ہاتھ کے بٹے
وہ ابروؤں کے خم کہ ہلالِ فلک کٹے — آنکھیں وہ نرگسی کہ جن سے نظر ہٹے
چہرے کسی نے دیکھے ہیں اس آب و تاب کے
رخسار چار پھول کھلے ہیں گلاب کے

وہ برگِ گل سے لب وہ دہن ان کے تنگ تنگ — نہ بھینی بھینی بو کسی غنچے میں وہ نہ رنگ
لعل و گہر ہیں اُن لب و دنداں کے آگے دنگ — اک منجمد یہ قطرۂ نیساں ہے اور وہ سنگ

تشبیہ بھی جو اُن سے نہ دی نا اُمید ہیں
اِس غم سے موتیوں کے کلیجوں پہ چھید ہیں

گورے گلے کہ جن سے نمایاں ہے نورِ حق — سُرخی نہیں یہ مہرِ منور پہ ہے شفق
وہ دیکھیے وہ ہاتھ دلِ کُفر جس سے شق — سینے ہیں ایک مصحفِ ناطق کے دو ورق
خالی ہیں گو شکم پہ یہ جرّار سیر ہیں
قدرِ وراثت ہے کہ یہ شیروں کے شیر ہیں

اُن دونوں اشہبوں کی وہ تعجیل وہ ترنگ ہائے — جو اُن کی چال دیکھنے آئے وہ دنگ جائے
صورت کو نہ بناؤ نہ رفتن کا ڈھنگ جائے — اُڑتے تھے یوں کہ جیسے ہوا پر خدنگ جائے
پریاں تھیں دو وہ اسپِ سعادت اثر نہ تھے
سب تھی ہُما کی تیز پری اور پرند تھے

اسوار آفتاب تو گھوڑے تھے ماہرو — سرعت یہ تھی کہ دوڑتا تھا جسم میں لہو
جاندار و خوش رکاب و سعید و خجستہ خو — صاف آتی تھی پسینے سے جرأت و وفا کی بو
ڈھالا تھا جوڑ بند کو سانچے میں نور کے
نازک کلائیاں تھیں کہ پہنچے تھے حور کے

دونوں کنوتیاں کہ دو پیکانِ تیر ہیں — چاروں سُم اُن کے غیرتِ بدرِ منیر ہیں
آنکھوں پہ کیجیے جو نظر بے نظیر ہیں — بال ایسے جس کے پیچ میں پریاں اسیر ہیں
سرعت میں اُن سے طیر کو نسبت نہ تیر کو
نرمی یہ جلد میں کہ خجالت حریر کو

آئے اُدھر سے گر تو اِدھر سے نکل گئے — پہنچے کنارِ بحر تو بر سے نکل گئے
مانندِ برق لشکرِ شر سے نکل گئے — دو تیر آگے تیرِ نظر سے نکل گئے

یوں بھر رہے تھے بیچ میں فوجِ غنیم کے
جیسے سحر کو چلتے ہیں جھونکے نسیم کے

غنچے تھے دو ملے ہوئے اک جا کہ اُن کے گوش برگستواں میں جسم کہ رستم تھا دِرع پوش
سُرعت کو دیکھ لیں تو اُڑیں طائروں کے ہوش گرتا تھا مُنہ سے کف تو شجاعت کا تھا یہ جوش
پریاں اُڑا سکیں نہ روش اُن کی چال کی
بالکل مزاج شیر کا آنکھیں غزال کی

وہ سُم، وہ نعل اور وہ سینے، وہ ترکتاز بدر و ہلال و آئینہ و کبک و شاہباز
زیور تھا ایک شب کی دلہن کا کہ اُن کے ساز وہ کلغیاں کہ طرۂ لیلیٰ سے سرفراز
بن کر گہر پسینے کے قطرے ٹپکتے تھے
ہیکل کی تختیاں کہ ستارے چمکتے تھے

گو چھوٹے چھوٹے پاؤں نہ جاتے تھے تا رکاب پر پٹریاں جمی ہوئی تھیں مثلِ بوتراب
یوں مرکبوں کے باندھے تھے سر وہ فلک جناب بیجا قدم رکھیں یہ سمندوں کو تھی نہ تاب
غل تھا ہٹے رہو کہ مزاج اِن کا آگ ہے
حیدر سے شہسوار کی یہ ران باگ ہے

گھوڑوں نے کس پرے میں قیامت بپا نہ کی فاقہ تھا پر کمی تگ و دو میں ذرا نہ کی
وہ کونسی گرہ تھی کہ تیغوں نے وا نہ کی کن سرکشوں کے جسم سے گردن جدا نہ کی
نیزوں کے بند قطع کمانوں کے ساتھ تھے
حلّالِ مشکلات کے بچوں کے ہاتھ تھے

پیاسوں کے نیچے بھی غضب آبدار تھے سیلِ فنا تھے صاعقۂ شعلہ بار تھے
دونوں بہم جو ہو کے اُٹھے ذوالفقار تھے سائے کو بھی شریک جو کیجے تو چار تھے

دو کرتے تھے یہ راکب و مرکب کو زین کو
دو ہاتھ کاٹ دیتا تھا سایہ زمین کو

قبضے وہ تکیہ گاہِ ظفر جن کا نام ہے — پھل وہ کہ جن کو کھاتے ہی قصّہ تمام ہے
پانی وہ جس کو کہیے کہ زہرالسّیام ہے — کاٹ ایسا سنگِ سخت جہاں موم خام ہے
جوہر وہ دم نکلتے ہیں جن کی مثال پر
افشاں چنی ہوئی ہے جبینِ ہلال پر

جن کے جمے تھے رنگ وہ بے رنگ ہو گئے — لڑنے کا حوصلہ نہ رہا تنگ ہو گئے
چار آئینے جو پہنے تھے چورنگ ہو گئے — بچوں نے وہ کیا کہ جواں دنگ ہو گئے
مہلت نہ سر اٹھانے کی تھی فوجِ شام کو
دونا بلند کر گئے جعفرؔ کے نام کو

کوئی بچے نہ رومی و رازی جدھر پھرے — جھک جھک گئیں صفیں وہ نمازی جدھر پھرے
غازہ لگایا فتح نے غازی جدھر پھرے — پسپا تھے یکہ تاز وہ تازی جدھر پھرے
دھومیں وغا کی قاف سے تا قاف ہو گئیں
اللہ رے مصاف صفیں صاف ہو گئیں

جا پہنچے تھے خیامِ بنِ سعد کے قریں — ہاں ہاں کا شور کر کے بڑھے سب عدوئے دیں
کتنی طنابیں کاٹ چکے تھے یہ مہ جبیں — بھاگا عقب سے چیر کے خیمے کو وہ لعیں
بھاگا اُدھر تو جوش میں وہ اضطراب کے
یہ دونوں بھائی رہ گئے ہونٹوں کو چاب کے

چھوٹے نے عرض کی یہ سراپا ہیں مکر و کید — دیکھا حضور جھپٹ گیا پنجے میں آ کے صید
چھپنے کی شرم ہے نہ انھیں بھاگنے کی قید — فرمایا عون نے یہ ہیں اُستادِ زرق و شید

بھاگا طنابیں کٹتے ہی کیا حیلہ ساز ہے
سچ ہے حرام زادے کی رسی دراز ہے
بڑھ کر پکارے حضرتِ عباسِ عرش جاہ — کس سمت ابنِ سعد ہے او شمرِ روسیاہ
ذلت اُٹھا کے بھاگ گیا افسرِ سپاہ — روکے گئے نہ ایک سے دو طفل واہ واہ
سرسبز ہوتے ہیں ہمیں جب کھیت پڑتے ہیں
یوں لشکروں سے شیر کے فرزند لڑتے ہیں
ہاں مرد اگر ہے سامنے بچوں کے آتو جائے — بھاگے گا پھر تو خیر کو زخم کھا تو جائے
ملعون کدھر ہے شیروں کو صورت دکھا تو جائے — بگڑی ہوئی لڑائی کو ظالم بنا تو جائے
بپھرے ہیں شیر ہاتھ میں تیغ و سپر تو لے
گرتا ہے وہ جھکا ہوا خیمہ خبر تو لے
بھاگا رئیس خود یہ خبر چار سو گئی — عزت سبھوں کی آج گئی آبرو گئی
آخر شغال تھا نہ دبکنے کی خو گئی — خلعت پہن کے بھی نہ رذالت کی بو گئی
جب کچھ کڑی پڑی تو جھٹا جو نکل گیا
ضیغم جلال میں ہیں کہ آہو نکل گیا
مرتا ہے بے حیا زر و جاگیر و مال پر — اک نیمچے کا وار بھی روکا نہ ڈھال پر
آنکھیں چرائیں شیر جب آئے جلال پر — سردار ہو کے چھپ گیا لعنت اس جدال پر
پائے نہ گر شکار تو جاں باز کیا کرے
کنجشک جب نشاں ہو تو شہباز کیا کرے
باتوں میں اتنا تھم جو گئے وہ فلک پناہ — خیمے کو لے کے پشت پہ سب جم گئی سپاہ
دریا کی فوج اُدھر سے ہوئی بڑھ کے سدِ راہ — چاروں طرف سے گھر گئے زینب کے رشکِ ماہ

پتھر بھی تیرِ ظلم بھی نیزے بھی چل گئے
سینوں کو توڑ توڑ کے ناوک نکل گئے

یوں تیر کھا کے فوج پہ جاتے تھے وہ دلیر
غصّہ میں زخم کھا کے جھپٹتا ہے جیسے شیر
لشکر کو کر دیا تھا زبردستیوں سے زیر
انبار اِدھر سروں کے اُدھر زخمیوں کے ڈھیر

دیکھا غضب سے جس کی طرف زرد ہو گیا
تلوار جس پہ سن سے چلی سرد ہو گیا

زینب کھڑی تھیں پردے کے پیچھے جو بیقرار
فضّہ خبر یہ دیتی تھی جا جا کے بار بار
کیا لڑ رہے ہیں جعفرؑ و حیدرؑ کے یادگار
حضرت سے مدح کرتے ہیں عباسِؑ نامدار

جس وقت ذکرِ معرکہ آرائی ہوتے ہیں
رومال رکھ کے آنکھوں پہ حضرت بھی روتے ہیں

رو کر کہا کہ روتے ہیں کس واسطے امام
میں اک کنیز اُن کی وہ دونوں پسر غلام
مجھ کو دکھا تو دے کہ کدھر ہیں وہ لالہ فام
اُس نے کہا کہ چھائی ہے جنگل میں فوجِ شام

لاکھوں سے معرکہ ہے مگر باحواس ہیں
بی بی وہ ابن سعد کے خیمہ کے پاس ہیں

تلوار چل رہی ہے کہ اللہ کی پناہ
ڈھالوں کی بدلیوں میں چھپے ہیں وہ رشکِ ماہ
کثرت ہے اس قدر کہ پہنچتی نہیں نگاہ
وہ بھاگتی ہے اور پلٹتی ہے سب سپاہ

آوازِ دار و گیر کی گردوں پہ جاتی ہے
دونوں کے نیمچوں کی چمک یاں تک آتی ہے

طبلِ ظفر پہ چوب لگی یک بیک اُدھر
ڈیوڑھی سے آئیں خیمے میں زینب جھکائے سر
عباس نے کہا شہِ والا سے دوڑ کر
چلئے حضور لٹ گیا بنتِ علیؑ کا گھر

گھبرا کے کشمکش میں دم اُن کے نکل نہ جائیں
لاکھوں سوار ہیں کہیں بچے کچل نہ جائیں

تلوار لے کے قاسمِ شیریں سخن بڑھے — عباس کیا بڑھے شہِ خیبر شکن بڑھے
مانندِ شیر اکبرِ گل پیرہن بڑھے — فرزند سے یہ کہہ کے امامِ زمن بڑھے
پردے میں اہلبیتِ نبیؐ کے خلل نہ آئے
ڈیوڑھی پہ تم رہو کہیں زینب نکل نہ آئے

پہنچے یہ تین شیر جو مقتل میں ایک بار — کیا پیدلوں کا ذکر فراری ہوئے سوار
ریتی پہ شہ کو یوں نظر آئے وہ گلعذار — بند آنکھیں، منہ کھلے ہوئے، ہونٹوں پہ جانِ زار
دنیا سے وقتِ کوچ بھی دونوں کا ساتھ ہے
گردن میں ایک بھائی کی بھائی کا ہاتھ ہے

بچوں کو جاں کنی میں جو پایا حسینؑ نے — بوسے لئے گلے سے لگایا حسینؑ نے
آنکھوں سے خوں جگر کا بہایا حسینؑ نے — ہاتھوں سے نیمچوں کو چھڑایا حسینؑ نے
آغوش میں بڑے کو شہنشاہ لے چلے
چھوٹے کی لاش قاسمِ ذی جاہ لے چلے

پہونچے قریبِ خیمہ جو شاہِ فلک سریر — تھا غیر حال مر گئے رستے میں وہ صغیر
پردہ اُلٹ کے خیمہ کا باحالتِ تغیر — فضہ پکاری اے حرمِ شاہِ قلعہ گیر
دوڑو حسینؑ خیمے میں لاشوں کو لاتے ہیں
دولہا بنے ہوئے مرے شہزادے آتے ہیں

دوڑے اُدھر سے چھاتیوں کو پیٹتے حرم — ڈیوڑھی سے پہلے آیا چمکتا ہوا علم
رایت کے نیچے بچوں کی نعشیں تھیں بہم — آپہونچے لڑکھڑاتے ہوئے سرورِ اُمم

لاشوں کے آگے اکبرِ یوسف جمال تھے
کپڑے ہر اک کے خون سے بچوں کے لال تھے

ماتم کی صف سے اُٹھ گئیں زینب یہ کہہ کے بات — لوگو کہو یہ کون سے دولھا کی ہے برات
لاشوں کو رکھ کے غش ہوئے سلطانِ کائنات — دوڑیں لٹا کے بچے کو بانوئے خوش صفات
لڑکے بھی چھاتیوں کو بہم پیٹنے لگے
لاشوں کے گرد آ کے حرم پیٹنے لگے

بیٹھی تھیں ایک گوشے میں زینبؑ جو ننگے سر — واں جا کے بولیں بانوئے ناشاد و نوحہ گر
پُرسے کو لوگ جمع ہیں چلیے ذرا اُدھر — فرمایا میں نہ جاؤں گی بچوں کی لاش پر
آنچ آ تا کی دل کو جلائے تو کیا کروں
گر فرق میرے صبر میں آئے تو کیا کروں

بس سُن چکی کہ نام کیا خوب لڑ چکے — لاشوں پہ لاشیں لوٹ چکیں کھیت پڑ چکے
کنبہ تمام ہو چکا دو گھر اُجڑ چکے — گودی میں جو پلے تھے وہ بچے بچھڑ چکے
اب اُن کا غم نہ فکر مرے گھر کی چاہیے
بی بی سلامتی علی اکبر کی چاہیے

بھائی کے آگے لاشوں پہ جا کر کروں میں بین — بے صبر ہے یہ دل میں کہیں گے مجھے حسینؑ
گر مر گئے تو مر گئے وہ دونوں نورِ عین — کیونکر چلوں کھڑے ہیں شہنشاہِ مشرقین
روؤں گی میں تو پھر علی اکبر بھی روئیں گے
صدمہ یہ مجھ کو ہے کہ برادر بھی روئیں گے

بھائی کا حق ادا ہوا احسانِ کردگار — رونا ہے واں بھی میں بھی رلوں گی زار زار
لاشوں کو دیکھ کر مرا دل ہوگا بے قرار — کی عرض آپ صاحبِ ماتم ہیں میں نثار

چلنے نہ ضبط کیجئے فریاد و آہ کو
لاشوں پہ بھانجوں کی غش آیا ہے شاہ کو

لاشوں پہ لائیں بیبیاں زینب کو تھام کر — ماتم کی صف پہ گر پڑیں وہ سوختہ جگر
بولیں بڑھا کے دستِ مبارک اِدھر اُدھر — بچے کدھر ہیں مجھ کو کچھ آتا نہیں نظر
کیسی دھڑا دھڑی ہے یہ کیوں بین ہوتے ہیں
لوگو نہ غل مچاؤ مرے لال سوتے ہیں

ماں صدقے جائے لو مرے زانو پہ سر رکھو — اس بیکسی میں ماں کی بھی جانب نظر رکھو
لازم نہیں کہ ہاتھ سے تیغ و سپر رکھو — آفت میں ماموں جان کی اپنے خبر رکھو
دیکھو نہ آنچ آئے شہِ خوش خصال پر
فوجوں کی بھیڑ چڑھائی ہے زہرا کے لال پر

کیسی یہ نیند آج ہے پیارو اُٹھو اُٹھو — ماموں کے ساتھ رن میں سدھارو اُٹھو اُٹھو
کپڑے لہو بھرے یہ اُتارو اُٹھو اُٹھو — گیسو اُلجھ گئے ہیں سنوارو اُٹھو اُٹھو
اِن پیاری پیاری آنکھوں پہ اماں نثار ہو
انگڑائیاں تو لو کہ جگر کو قرار ہو

سینوں سے تو زمیں پہ رکھو ہاتھ اُتار کے — باندھو کھُلے ہوئے یہ عمامے سنوار کے
اماں نثار گیسوؤں کے تار تار کے — چونکو اُٹھو کلام کرو ماں سے پیار کے
نخلِ مراد میں نہ ثمر ہے نہ برگ ہے
اب سمجھی میں یہ نیند نہیں خوابِ مرگ ہے

لاکھوں سے معرکے میں وغا کر کے آئے ہو — بچپن کی غفلتیں یہ نہیں مر کے آئے ہو
دولہا بنے ہو خون میں سب بھر کے آئے ہو — صدقے گئی رُلانے کو مادر کے آئے ہو

مجھ سے بچھڑ کے تم اسی منزل میں رہ گئے
ارمان شادیوں کے مرے دل میں رہ گئے
کیوں کر ملے گا ماں کو تمہارا سراغ ہائے　　لوٹا اجل نے حیدر و جعفر کا باغ ہائے
یوں بجھ گئے ہماری لحد کے چراغ ہائے　　میرا بڑھاپا اور یہ بچوں کے داغ ہائے
ہے ہے یہ گھر بھرا ہوا ویران کر گئے
اماں کی قبر بننے نہ پائی کہ مر گئے

کس طرح دیکھوں خاک میں چہرے اٹے ہوئے　　الجھے ہیں میرے ہاتھ کے گیسو بٹے ہوئے
سینے فگار چاند سے بازو کٹے ہوئے　　ہے ہے کفن بنے ہیں کپڑے پھٹے ہوئے
نہ کچھ تزک نہ تخت شہیدوں کو چاہیے
مرنا یونہیں جہاں میں سعیدوں کو چاہیے

شب کو خوشامدیں مری کرتے تھے بار بار　　تا دودھ ہم کو بخش دے مادر جگر فگار
ان بھولی بھولی باتوں کے ماں ہو گئی نثار　　باتیں نہ رات کی مجھے بھولیں گی وہ نہ پیار
ف واری سفید رُو رہو تم رب کے سامنے
لو میں نے دودھ بخش دیا سب کے سامنے

یہ بین کر کے لاشوں سے لپٹی وہ نوحہ گر　　غش آیا سانس الٹ گئی ٹکڑے ہوا جگر
اک حشر تھا کسی کو کسی کی نہ تھی خبر　　بانو پکاری سوئے علمدار دیکھ کر
بچوں کے ساتھ ماں بھی جہاں سے گزر نہ جائے
لاشے اٹھاؤ شاہ کی ہمشیر مر نہ جائے　　(جاتی ہے کس شکوہ سے ...)

ف اب واری سرخ رُو ہوئے تم رب کے سامنے۔

حضرت قاسم کی رخصت، جنگ اور شہادت

باہر امام لے گئے لاشے اُٹھا کے جب — غیرت کا جوش آگیا قاسم کی ماں کو تب
مل مل کے ہاتھ کہتی تھی دل سے کہ ہے غضب — ہمشکلِ مصطفےٰ کہیں مرنے نہ جائے اب
اولاد اپنی آج کے دن گر بچاؤں گی
میں فاطمہ کو حشر میں کیا منہ دکھاؤں گی

دل میں یہ سوچتی ہوئی اُٹھی وہ خوش خصال — قاسم کو اپنے پاس بلایا بصد ملال
رو کر کہا کہ اے حسنِ مجتبیٰؑ کے لال — کچھ اس ضعیف ماں کی بھی عزت کا ہے خیال
جاری ہیں اشکِ خوں مری چشمِ پر آب سے
زینب کے آگے جا نہیں سکتی حجاب سے

گھر لُٹ رہا ہے فاطمہ زہرا کا ہائے ہائے — دشمن وہ دوست ہے، جو نہ اس گھر میں کام آئے
غیروں نے یاں حسینؑ کے قدموں پہ سر کٹائے — کیا قہر ہے کہ بھائی کا جایا نہ مرنے جائے
گھیرا ہے بے وطن کو عدو کی سپاہ نے
منہ دیکھنے کو کیا تمہیں پالا ہے شاہ نے

سب مر چکے امامِ دو عالم کے اقربا — باقی ہے کون اکبر و عباس کے سوا
حضرت کے تن کی جان ہیں وہ دونوں مہ لقا — سر اُن کے کٹ گئے تو قیامت ہوئی بپا
تم بھی خجل رہو گے سدا جدؑ کے سامنے
شرمائیں گے حسنؑ بھی محمدؐ کے سامنے

جو مرد ہیں وہ دیتے ہیں مردانگی کی داد — کچھ اپنے باپ کی بھی وصیت ہے تم کو یاد
جلدی دلہن سے مل کے سدھارو پئے جہاد — قربان ہو چچا پہ یہی ماں کی ہے مراد

بیاہا تمہیں بر آئی ہر اک آرزو مری
اب وہ کرو کہ جس میں رہے آبرو مری

مادر کے منہ کو دیکھ کے بولا وہ گلعذار
ہم ایسے ہیں کہ بیٹھ رہیں وقت کارزار
جانیں ہزار ہوں تو چچا پر کریں نثار
رخصت ہی وہ نہ دیں تو ہے کیا اپنا اختیار
رن میں چلے تھے مرنے کو پہلے ہی سب سے ہم
روکا چچا نے کہہ نہ سکے کچھ ادب سے ہم

اب بھی اگر نہ دیں گے رضا سرورِ امم
رکھ لیں گے تیغ کھینچ کے اپنے گلے پہ ہم
اماں مزارِ کشتۂ ستم کی ہمیں قسم
زیرِ قدم ہے اب کوئی دم میں رہِ عدم
کیا دخل ہم سے آگے جو وہ شہسوار ہوں
عباس ہوں کہ اکبرِ عالی وقار ہوں

یہ کہہ کے آئے سر کو جھکائے دلہن کے پاس
آنکھوں میں اشک درد کلیجے میں دل اداس
فرمایا ہم کو ہائے یہ شادی نہ آئی راس
سب مر گئے عزیزِ شہنشاہِ حق شناس
بستی تمام لٹ گئی ویرانہ ہو گیا
شادی کا گھر جو تھا وہ عزاخانہ ہو گیا

کس سے کہیں جو حالِ دلِ دردناک ہے
تلوار چل رہی ہے جگر چاک چاک ہے
اس زندگی پہ حیف ہے دنیا پہ خاک ہے
اب کوئی دم میں دلبرِ زہرا ہلاک ہے
آئی تباہی آلِ نبی کے جہاز پر
نرغہ ہے شامیوں کا امامِ حجاز پر

تم بھی کچھ اپنے باپ کی اس دم کرو مدد
آفت میں آج ہے پسرِ قسیمِ صمد
دشمن کو بھی خدا نہ دکھائے یہ روزِ بد
صدقے کرو ہمیں کہ بلا ان کی ہووے رد

راضی رضائے حق پہ بصد آرزو رہو
حیدرؑ سے ہم بتولؑ سے تم سرخرو رہو

واللہ قتل ہوں گے جو عباسؑ نامور — صدمے سے ٹوٹ جائے گی شبیرؑ کی کمر
اکبر خدانخواستہ مارے گئے اگر — مر جائیں گے تڑپ کے شہنشاہِ بحر و بر
وہ مستعد ہیں حلق کٹانے کے واسطے
ہم کیا چلے ہیں لاش اٹھانے کے واسطے

گھونگھٹ ہٹا کے ہم کو دکھاؤ تو رُخ کا نُور — پاس اب نہ آسکیں گے کہ ہوتے ہیں تم سے دُور
آنکھوں پہ ہیں ہتھیلیاں رقت کا ہے وفور — نرگس کے پھول ہاتھوں سے ملنا یہ کیا ضرور
جینے کی اس چمن میں خوشی دل سے فوت ہے
بلبل جو گل کی شکل نہ دیکھے تو موت ہے

صاحب بھلا عدم کے مسافر سے یہ حجاب — ہم یوں ہیں جس طرح کہ سرِ آب ہو حباب
ایسی روا روی میں ٹھہرنے کی کب ہے تاب — کہتی ہے موت گور کی جانب چلو شتاب
رستہ ہے پُرخطر کہیں وقفہ ذرا نہ ہو
منزل بہت کڑی ہے یہ جلدی روانہ ہو

اک دم کی بھی ہیں تو جدائی ہے تم سے شاق — کیا کیجئے نصیب میں تھا صدمۂ فراق
لائی اجل پکڑ کے گریباں سوئے عراق — بولو زباں سے کچھ کہ نہ رہ جائے اشتیاق
چپکی یونہی رہو گی تنِ پاش پاش پر
کیا بین بھی کرو گی نہ دولہا کی لاش پر

جب یہ سُنے کلام تو جی سنسنا گیا — دل پہ چھری چلی کہ جگر تھرتھرا گیا
منہ پر دلہن کے صاف رنڈاپا سا چھا گیا — جوشِ بکا میں کچھ نہ زباں سے کہا گیا

دولہا کو اتنی بات سُنا کر اک آہ کی
صورت بتاتے جاؤ ہمارے نباہ کی

سمجھی کہ جیتے اب نہیں پھرنے کے رن سے تم
پیاسا گلا کٹا کے ملوگے حسنؑ سے تم
سوؤ گے منہ چھپا کے لحد میں کفن سے تم
اچھا سلوک کرتے ہو صاحب دلہن سے تم
اک رات کی بنی پہ جفا یونہی چاہیے
اے شمع بزم مہر و وفا یونہی چاہیے

فرماؤ کیا کریں جو نہ روئیں بہ درد و یاس
نہ باپ کی نہ بھائیوں کی نہ چچا کی آس
مہماں ہیں کوئی دم کے جہاں میں وہ حق شناس
سونا تھا آپ کو سو رہے آپ بھی نہ پاس
وارث ہے کون پھر جو گلے سب کے کٹ گئے
تم کیا کرو نصیب ہمارے اُلٹ گئے

میں کون ہوں بھلا جو کہوں گی کہ تم نہ جاؤ
راضی ہیں ماں تمہاری تو جاؤ گلا کٹاؤ
گھر تو اُجاڑ ہو چکا جنگل کو اب بساؤ
نبھ جائے گا ہمارے رنڈاپے کا غم نہ کھاؤ
مسکن کریں گے رن میں تن پاش پاش پہ
ہم بھی فقیر ہوئیں گے صاحب کی لاش پہ

باتیں یہ سُن کے روتے تھے قاسم بحالِ زار
ھل من مبارزؑ کی صدا آئی ایک بار
ماں نے کیا اشارہ کہ اے میرے گلعذار
موقع نہیں ہے دیر کا اُٹھو یہ ماں نثار
کیا جانے ہوگا قبر میں کیا حال باپ کا
جی لگ گیا عروس کی باتوں میں آپ کا

فرما کے الوداع اُٹھا دلبر حسنؑ
برہم ہوئی وہ بزم وہ صحبت وہ انجمن
غل ہو گیا کہ لٹتی ہے کہ اک رات کی دلہن
اُس وقت سب سے دولہا کی ماں کا تھا یہ سخن

جاتی ہے اب برات مرے نونہال کی
رخصت ہے بیوہ زنِ بیوہ کے لال کی

جاتا ہے سر کٹانے کو رن میں یہ رشکِ ماہ
دنیا میں یادگار رہا حشر تک یہ بیاہ
دیں نے دودھ بخش دیا سب رہیں گواہ
دو رانڈیں ایک جا ہوں یہ تھی مرضیٔ الٰہ
سمجھے نہ اب کوئی کہ دلہن کی عزیز ہوں
کل تک تھی ساس آج سے اس کی کنیز ہوں

جب خیمۂ حسینؑ سے نکلا حسنؑ کا لال
بس گر پڑا قدم پہ یہ کہہ کر وہ خوش خصال
دیکھا کہ در پہ روتے ہیں سرور بصد ملال
دیجے رضائے حرب مجھے بہر ذوالجلال
چلائی ماں کہ سبطِ پیمبر نہ روکیو
شبرؑ نے دی صدا کہ برادر نہ روکیو

لپٹا کے اس کو چھاتی سے بولے شہِ اُمم
یہ پیش و پس ہے منزلِ ہستی میں کوئی دم
پیارے تمہارا داغ بھی دل پر سہیں گے ہم
تم آگے چند گام تو ہم پیچھے دو قدم
کچھ غم نہیں جو راہ ہے خنجر کی دھار پر
ہر دم خدا کا فضل ہے اس خاکسار پر

یہ کہہ کے دل قلق سے بھر آیا جو ایک بار
تر آنسوؤں سے ہو گئی ریشِ خضاب دار
رونے مثالِ ابر شہِ آسماں وقار
تسلیم کر کے قاسمِ گلگوں ہوا سوار
دولھا کے نورِ رخ کی ضیا چرخ تک گئی
جولاں کیا فرس کو تو بجلی چمک گئی

پہونچا جو رزم گاہ میں وہ غیرتِ قمر
بولے عدو یہ کوئی فرشتہ ہے یا بشر
نیزہ پکڑ کے گھوڑے کو پھیرا ادھر اُدھر
خورشید خاوری کی بھی خیرہ ہے یاں نظر

اللہ ری چمک رُخِ پُر آب و تاب کی
سہرا بنا ہوا ہے کرن آفتاب کی

ناگہ رجز یہ پڑھنے لگے قاسم جری — عالم میں کون ہے جو کرے ہم سے ہمسری
ہم حیدری ہیں ہم میں ہے زورِ غضنفری — ہم سے ہے اوج پایۂ اورنگ صفدری
شہرہ ہے حرب و ضربِ شہ خاص و عام کا
سکہ ہے شش جہت میں ہمارے ہی نام کا

جد ہے مرا امیرِ عرب شحنۂ نجف — ضرغامِ دیں معینِ رسولانِ ماسلف
دادی جناب فاطمہ زہرا سی ذی شرف — عمو حسینؑ صاحبِ لولاک کا خلف
میں پارۂ دلِ حسنؑ خوش خصال ہوں
ہیرے سے جو شہید ہوا اُس کا لال ہوں

اُس کا پسر ہوں اے سپہِ مصر و روم و شام — گلزارِ فاطمہ کا ہے جو سروِ سبز فام
واللہ اُس کا لختِ جگر ہوں میں تشنہ کام — تابوت جس کا تیروں سے چھلنی ہوا تمام
جاں اُس کی ہوں میں جس کو نہ جاگیرِ جد ملی
پہلو میں مصطفٰے کے نہ جس کو لحد ملی

ناگاہ فوجِ شام سے تیرِ ستم چلے — تیر و سنان و نیزہ و خنجر بہم چلے
قاسم بھی یاں سے کھینچ کے تیغِ دودم چلے — اعدا پہ چھیڑ کر فرسِ خوش قدم چلے
پیدل تو اُس قطار کے تھے کس قطار میں
دو دو سوار کٹ گئے ایک ایک وار میں

ڈھالیں اُٹھیں کہ دن شبِ دیجور ہو گیا — لامع جو برقِ تیغ ہوئی نور ہو گیا
حیراں ہر ایک ظالمِ مقہور ہو گیا — چہروں کا رنگ خوف سے کافور ہو گیا

آئی ہنسی اجل کو بھی اس طرح مر گئے
گھوڑوں پہ تن چڑھے رہے اور سر اُتر گئے (بھولا شفق سے چرخ پہ .....)

دکھلا رہی تھی سب کو نئی چال ڈھال تیغ — جاتی تھی شرق و غرب و جنوب و شمال تیغ
چڑھتی تھی گاہ چرخ پہ مثلِ ہلال تیغ — لامع زمیں پہ تھی کبھی وہ خوش جمال تیغ
گر کوفیوں کے دل پہ گئے فوجِ شام پہ
تھی ایک برق جلوہ نما ہر مقام پہ

بڑھ کر دغا پہ لیس ہوا گر کوئی شریر — آپہونچی سر پہ تیغ لپک کر لسانِ تیر
جلدی نکل کے تن سے ہوئی روح گوشہ گیر — حلقے میں خود اجل کے وہ کج رُو ہوا اسیر
سرکش کو بے رُخی کی سزا ناگہاں ملی
نہ تیر کو مفر نہ کماں کو اماں ملی

یکتا تھے جتنے فوج میں ناوک فگن جواں — رُخ پھیرتے تھے سہم کے خاطر نہ تھی نشاں
چلّے پہ بھاگ گئے پر نہیں زہ جاں — لے آئی موت تیغ کے منہ پر کشاں کشاں
نخوت کماں کشوں کے سروں سے ہوا ہوئی
چلّاتے تھے کہ اب نہ لڑیں گے خطا ہوئی

کاٹی اِدھر کی صف تو ہوئے حملہ ور اُدھر — پلٹے اِدھر تو ہل گئے سب کے جگر اُدھر
تن اِس طرف تڑپتے تھے اعدا کے سر اُدھر — ہر دم اجل بھی دوڑ رہی تھی اِدھر اُدھر
عاجز سوار ہی نہ فقط وقتِ جنگ تھے
توسن کی جست و خیز سے گھوڑے تنگ تھے (سب جدا روش ہے .....)

تھا ابن سعد شوم کو اس دم بہت ہراس — غرقِ سلاح ازرقِ شامی کھڑا تھا پاس
اُس سے کہا کہ فوج نہایت ہے بے حواس — تو جا کے لڑ تو قتل ہو شاید یہ حق شناس

رُکتا ہے برچھیوں سے نہ دامِ کمند سے
جلدی سناں پہ اس کو اُٹھا لے سمند سے

کہنے لگا بگڑ کے وہ با صد غرور و لاف — تو آپ بے حواس ہے تقصیر ہو معاف
یہ امر اے امیر شجاعت کے ہے خلاف — ہاں تب لڑوں علیؑ اگر آئیں پئے مصاف
فرق آئے گا نہ میری کبھی آن بان میں
لڑکے سے لڑ کے نام مٹا دوں جہان میں

ڈرتے ہیں سب جری تری جنگ و جدال سے — رستم کا زور آگے مرے کم ہے زال سے
رُکتی نہیں یہ تیغ تہمتن کی ڈھال سے — ناداں ہوں کیا، لڑوں میں جو اس خورد سال سے
بیٹوں کو میرے بھیج کہ چاروں دلیر ہیں
جنگ آزما ہیں شور ہیں صفدر ہیں شیر ہیں

لکھا ہے چار تھے پسرِ ازرقِ پلید — دشمن تو آلِ پاک کے شیطان کے مُرید
بولا یہ اُن کو دیکھ کے وہ پیروِ یزید — ہاں جا کے اِس یتیم کو جلدی کرو شہید
رُلواؤ قبر میں حسنؑ دل ملول کو
بیوہ بنا دو دخترِ سبطِ رسول کو

نکلا یہ بات سُنتے ہی اُن میں سے ایک یل — پیچھے چلی شریر کے ہنستی ہوئی اجل
نعرہ کیا یہ غیظ سے موذی نے کھا کے بل — ہاں اے حسنؑ کے لال خبردار ہو سنبھل
کام آئے کچھ تو نامِ شہِ ذوالفقار لے
پشتی پہ ہو کوئی تو مدد کو پکار لے

قاسم یہ نعرہ زن ہوئے چمکا کے راہوار — امداد وقتِ جنگ ہے شیروں کو ناگوار
کافی ہے بس ہمیں سپرِ حفظِ کردگار — او خیرہ سر اجل تری گردن پہ ہے سوار

دشمن کو اپنی ضرب طمانچہ قضا کا ہے
آ کوئی وار کر جو ارادہ وغا کا ہے

یہ سنتے ہی کماں کو اٹھا کر بڑھا شریر — چلّے میں تین بھال کا جوڑا شقی نے تیر
تھا بس کہ تیز دست حسنؑ کا مہ منیر — بجلی سی آئی کوند کے شمشیر بے نظیر
یوں قطع انگلیاں ہوئیں اُس تیرہ بخت کی
جیسے کوئی قلم کرے شاخیں درخت کی

اک ہاتھ میں جو کٹ کے گرے دستِ نابکار — بولے کمر میں رکھ کے یہ شمشیر آبدار
اب دیکھ میرے تیر کا توڑا و خطا شعار — پکڑا کماں کے قبضے کو یہ کہہ کے استوار
چلّہ جو کھینچنے لگے ترکش کو تاک کے
رستم کی روح چھپ گئی تودے میں خاک کے

چٹکی سے چھوٹ کر جو چلا تیر بے اماں — قربان تیرے ہاتھ کے چلائی یہ کماں
بچتی ہے کب خدنگِ اجل سے کسی کی جاں — نکلا وہ تیر توڑ کے سینے کے استخواں
اک دم میں دی شکست خطا کو ثواب نے
قُل تھا قفس کی تیلیاں توڑیں عقاب نے

مرکب سے گر کے مر گیا جب وہ عدوئے دیں — نکلا اُدھر سے تب پسرِ ثانی لعیں
نیزے کو تولتا ہوا مغرور و خشمگیں — ابرو پہ بل نگاہ میں قہر اور جبیں پہ چیں
ہمراہ اُس کے تیغ بکف تیس سوار تھے
اور اس طرف مدد کو شہ ذوالفقار تھے

نیزے کا وار کرنے لگا جب وہ خود پسند — بجلی سا کوندنے لگا دولھا کا بھی سمند
نیزہ اُڑا کے نیزے سے، کی یہ صدا بلند — کیوں تو نے دیکھے نیزہ مشکلکشا کے بند

یہ سُن کے اُس نے ڈھال کو چہرے پہ کر لیا
پُتلی کو بے حیا کی سناں میں پرو لیا

بیکار کور ہو کے ہوا جب وہ خیرہ سر   پھلکے میں ہاتھ ڈال کے پٹکا زمین پر
آواز دی زمیں نے کہ فی النّار والسّقر   جا تو بھی ہے برادرِ عینی ترا جدھر
جُز موت کچھ شقی کو نہ اُس دم نظر پڑا
آنکھیں کھُلیں تو قعرِ جہنّم نظر پڑا

جھپٹا برادرِ سوم اُس کا بہ کرّ و فر   تانے ہوئے وہ گرزِ گراں سر کا الحذر
یاں بہرِ حفظ دستِ یداللہ تھے سپر   تیغِ دو دم کو شیر نے تولا بچا کے سر
یوں دو کیا عمودِ سرِ نابکار کو
جس طرح تیغِ تیز اُڑا دے خیار کو

مرتے ہی اُس کے فوج سے چوتھا پسر بڑھا   قاسم پکارے اویلِ خود سر کدھر بڑھا
سُنتے ہی یہ وہ تیغِ دودم کھینچ کر بڑھا   جھنجھلا کے مجتبیٰ کا بھی لختِ جگر بڑھا
لڑتا وہ کیا کہ تیرِ اجل کا نشانہ تھا
اک ہاتھ میں نہ سر تھا نہ بازو نہ شانہ تھا

بے جاں ہوئے نبرد میں بیٹے جو اُس کے چار   ازرق کا دل ہوا صفتِ لالہ داغدار
جوشِ غضب سے سُرخ ہوئیں چشمِ نابکار   مثلِ تنور منہ سے نکلنے لگا بخار
جیبِ قبا کو مثلِ کفن پھاڑتا ہوا
نکلا پرے سے دیو سا چنگھاڑتا ہوا

شانے پہ تھی شقی کے وہ ڈونانک کی کماں   ارجن بھی جس سے سہم کے گوشے میں ہو نہاں
چار آئینہ وہ پہنے تھا بر میں کہ الاماں   دب جائیں جس کے بوجھ سے رستم کے استخواں

کہتی تھی یہ زرہ بدنِ بدخصال میں
جکڑا ہے پیلِ مست کو لوہے کے جال میں

آمد شقی کی دیکھ کے گھبرا گئے امام — عباسؑ نامور سے یہ رو کر کیا کلام
لو بھائی جنگ ہو چکی قصہ ہوا تمام — آیا سوئے یتیم حسنؑ موت کا پیام
ہمشکلِ مجتبےٰ کو بلا لو پکار کے
مانگو دعا سروں سے عمامے اتار کے

یہ کہہ کے قبلہ رو ہوئے سلطانِ کائنات — درگاہِ کبریا میں دعا کی اٹھا کے ہات
اے خالقِ زمین و زماں ربِّ پاک ذات — ازرق کے ہاتھ سے مرے قاسم کو دے نجات
تو حافظِ جہاں ہے کریم و رحیم ہے
یارب بچا اسے کہ یہ لڑکا یتیم ہے

فضہ پکاری خیمہ میں آ کر بچشمِ تر — لوگو تمہیں یتیم حسنؑ کی بھی ہے خبر
آیا ہے لڑنے ازرقِ ملعونِ خیرہ سر — کھولو سروں کو اے حرمِ شاہِ بحر و بر
عباسؑ روتے ہیں علی اکبرؑ اداس ہیں
ایسا ہے کچھ کہ سبطِ نبیؐ بے حواس ہیں

نکلا یہ سب کے منہ سے کہ ہے ہے حسنؑ کا لال — زینبؑ نے اٹھ کے کھول دیے اپنے سر کے بال
سینے میں جل گیا دلِ بانوئے خوش خصال — چلائی ماں گزر گیا کیا میرا نونہال
عابد کا تپ میں گرم بدن سرد ہو گیا
قاسم کے چھوٹے بھائی کا منہ زرد ہو گیا

چلائی رو کے زوجۂ عباسؑ نوجواں — یارب ہے تو یتیم حسنؑ کا نگاہباں
سن کر یہ غل دلہن کے بھی آنسو ہوئے رواں — لے کر بلائیں ساس پکاری کہ میری جاں

خالق کرے گا رحم نہ آہ و بکا کرو
دولہا پہ آ بنی ہے میں صدقے دعا کرو

اس اضطراب میں جو سُنا ساس کا سخن — زانو سے سر اُٹھا کے ہوئی قبلہ رُو دلہن
آہستہ کی یہ عرض کہ اے ربِ ذوالمنن — دشمن پہ فتحیاب ہو لختِ دلِ حسنؑ
لڑنے گئے ہیں تشنہ دہن تیری راہ میں
رکھ میرے ابنِ عم کو تو اپنی پناہ میں

یارب دلہن بنے مجھے گزری ہے ایک شب — دولہا جو مر گیا تو مجھے کیا کہیں گے سب
اب تک تو شرم سے نہ ہلائے تھے میں نے لب — پر کیا کروں کہ اب ہے مری روح پر تعب
شبر کے آفتاب کا وقتِ غروب ہے
دولہا سے پہلے مجھ کو اُٹھا لے تو خوب ہے

سہرے کے پھول بھی ابھی سوکھے نہیں ہیں آہ — جو آ گیا پیام رنڈاپے کا یا الٰہ
یہ عقد تھا کہ موت تھی ماتم تھا یا بیاہ — بعد ان کے ہوگا خلق میں کیونکر مرا نباہ
اُٹھوں جہاں سے دلبرِ شبر کے سامنے
عورت کی موت خوب ہے شوہر کے سامنے

فوجیں اِدھر دُعا کی چلیں سوئے آسماں — بل کھا کے اُس طرف یہ پکارا وہ بدزباں
رستم بھی ہو تو کھنچ نہیں سکتی مری کماں — جوشن کو توڑتا ہے مرا تیرِ بے اماں
ہے اُس کی فتح ساتھ ہوں میں جس رئیس کے
سُرمہ کیا ہے دیو کو چٹکی میں پیس کے

قاسم نے دی صدا کہ بس اب کر زباں کو بند — اللہ کو غرور و تکبر ہے ناپسند
حق نے فروتنی سے کیا ہم کو سربلند — نیزے کا بند باندھ کوئی چھیڑ کر سمند

دیکھیں بلند کون ہے اور پست کون ہے
کھل جائے گا ابھی کہ زبردست کون ہے

کیا زور تیرا اور تری ضرب او ذلیل — تعریف اپنی خود یہ سفاہت کی ہے دلیل
جوہر خود اُس کے کھلتے ہیں جو تیغ ہے اصیل — کاٹے ہماری تیغ نے بازوئے جبرئیل
جرأت میں ہم کسی کو بھلا کیا سمجھتے ہیں
مضبوط جو ہیں وہ تجھے بودا سمجھتے ہیں

بیٹوں کے غم نے کر دیئے مختل ترے حواس — گھبرا نہ کھینچتے ہیں تجھے بھی انھیں کے پاس
فاقہ ہے ہم پہ اور ہے سوزِ جگر کی پیاس — آنکھیں ملا کے دیکھ بھلا ہے کہیں ہراس
گم ہیں جو نورِ عین تو آنکھیں چرائے ہے
ثابت ہوا خجل سے کہ منہ کو چھپائے ہے

آگے ہمارے دعوئے جُرأت خدا کی شاں — گدی سے کھینچ لوں ابھی بڑھ کر تری زباں
مغرور اس پہ ہے کہ میں لڑکا ہوں نوجواں — لے میاں سے کہ اس کا بھی ہو جائے امتحاں
ہیں شیر شیر خوار جنابِ امیر کے
جھُولے سے پھینک دیتے ہیں اژدر کو چیر کے

بارہ برس کے سن میں لڑے شاہِ ذوالفقار — مرحب سا پہلواں نہ بچا وقتِ کارزار
ہے دیکھنے کا یہ تن و توش او زبوں شعار — گینڈے کی ڈھال کاٹتی ہے تیغِ آبدار
لڑکوں سے فوجیں بھاگی ہیں منہ پھیر پھیر کے
ہاتھی کو مار ڈالا ہے بچوں نے شیر کے

قائل کیا جو مصحفِ ناطق کے لال نے — تر کر دیا اُسے عرقِ انفعال نے
برچھا اُٹھایا ہاتھ میں اُس بدخصال نے — چھیڑا فرس کو قاسمِ یوسف جمال نے

تکنے لگے صفوں سے جواں سب لڑے ہوئے
عباسؑ نامدار قریب آ کھڑے ہوئے

قاسم نے عرض کی کہ بہت دھوپ ہے حضور　　رہیے چچا کے پاس یہ تکلیف کیا ضرور
فرمایا صدقے میں تری ہمت کے اے غیور　　دشمن کو پاس آنے نہ دو ہم کھڑے ہیں دور
ہشیار جانِ عم کہ دمِ کارزار ہے
جاتا ہے اب کہاں یہ تمہارا شکار ہے

کیوں تیغ تول تول کے بڑھتے ہو بار بار　　بیٹا سپر تو ہاتھ میں لے لو چچا نثار
صدقے ترے حواس کے اے میرے شہسوار　　ہاں دونوں پاؤں رکھیو رکابوں میں استوار
آنے دو اس کو تیغ ابھی دم بھر تھمی رہے
گھوڑا نہ بدمزاج ہو پٹری جمی رہے

فارس ہے تم سا کون تہِ چرخِ چنبری　　دکھلا رہے ہو صاحبِ دلدل کی گدھری
صدقے میں اے نہنگِ محیطِ دلاوری　　دکھلا دے ضربِ تیغِ جہانگیرِ حیدری
ابرو پہ بل ہو آنکھوں سے آنکھیں لڑی رہیں
بھاری زرہ وہ پہنے ہے چوٹیں کڑی رہیں

بیٹا تمہیں خدا نے دیا ہے علیؑ کا زور　　گو پیل ہے پہ ہم تو سمجھتے ہیں اس کو مور
بہرام کی طرح سے چلا اب میانِ گور　　دیکھو گے دیکھنے کو نہ ہوگا یہ زور شور
چلتے ہیں جتنے سانپ وہ ڈستے نہیں کبھی
گرجے ہیں جو بہت وہ برستے نہیں کبھی

سن کر صدائے شیر پکارا وہ بزدلا　　کیا ان کے ساتھ آپ بھی ہیں عازمِ وغا
تیوری چڑھا کے حضرتِ عباسؑ نے کہا　　بس ہے تجھے یہ طفل مری احتیاج کیا

کچھ تجھ سے کم نبیرۂ خیبر شکن نہیں
دو ایک سے لڑیں یہ ہمارا چلن نہیں

نیزہ ہلا کے جانبِ قاسم بڑھا وہ یَل — دولھا نے مسکرا کے صدا دی سنبھل سنبھل
گھوڑا نہ گر پڑے ترے لنگر سے منہ کے بھل — تو ہے فرس پہ اور تری گردن پہ ہے اجل
ضیغم ہیں بیشۂ اسدِ ذوالجلال کے
بچو سناں کے وار ذرا دیکھ بھال کے

یہ کہہ کے اپنے چھوٹے سے نیزے کو دی تکاں — چمکی انی تو برق پکاری کہ الاماں
اک بند باندھ کر جو فرس سے کہا کہ ہاں — ڈانڈ آئی ڈانڈ پر تو ثعباں سے لڑی سناں
بل کیا کرے کہ زور ہی موذی کا گھٹ گیا
غل تھا کہ اژدہے سے وہ افعی لپٹ گیا

قاسم نے زور سے جو انی پر رکھی انی — بھاگا شقی کے جسم سے زورِ تہمتنی
بگڑا جو ڈھنگ جان پہ ظالم کی آ بنی — تھی اس سناں کی نوک کہ ہیرے کی تھی کنی
اڑ کر گری زمیں پہ سناں اس تکان سے
گرتا ہے جیسے تیرِ شہاب آسمان سے

جھنجھلا کے چوب نیزہ کو لایا وہ فرق پر — قاسم نے ڈانڈ ڈانڈ پہ ماری بچا کے سر
دو انگلیوں میں نیزۂ دشمن کو تھام کر — جھٹکا دیا کہ جھک گئی گھوڑے کی بھی کمر
نیزہ بھی دب کے ٹوٹ گیا نابکار کا
دو انگلیوں سے کام لیا ذوالفقار کا

سنبھلا وہ بے شعور یہ جھٹکا اٹھا کے جب — قبضے میں لی کمانِ کیانی بصد غضب
چلے میں تیر جوڑ چکا جب وہ بے ادب — تیوری چڑھائی قاسمِ نوشاہ نے بھی تب

تیرِ نگاہ سے وہ خطا کار ڈر گیا
کانپے یہ دونوں ہاتھ کہ چلّہ اُتر گیا

بولا یہ مسکرا کے جگر گوشۂ حسنؑ   رُخ پھیر یونہ او ستم ایجاد و پیل تن
چلّائے بڑھ کے حضرتِ عباسِ صف شکن   کیا خوب تجھ کو یاد ہیں تیر افگنی کے فن
دیکھا ہمارے شیر کی چتون کی شان کو
دعویٰ ہے کچھ ابھی تو چڑھالے کمان کو

دو سمت سے چلے جو ملامت کے اُس پہ تیر   چلّایا تیغِ تیز علم کر کے وہ شریر
ہاں اے حسنؑ کے لعلِ بدخشاں بدہ بگیر   نکلی چمک کے یاں سے بھی تیغِ قضا نظیر
چمکا کے تیغِ تیز جو قاسم سنبھل گئے
سمجھا جو کچھ فرس کے بھی تیور بدل گئے

مانندِ شیر غیظ میں آیا وہ پیل تن   آنکھیں اُبل پڑیں صفتِ آہوئے ختن
ماری زمیں پہ ٹاپ کہ لرزا تمام بن   چلّائے سب کہ گھوڑے پہ بھی لو چڑھا ہے رن
میخیں زمیں کی اُس کی تگاپو سے ہل گئیں
دونوں کنوتیاں بھی کھڑی ہو کے مل گئیں

فرفرِ نفس کی آتی تھی نتھنوں سے جب صدا   کہتے تھے لوگ سب کہ ہے رفرف یہ بادپا
دشمن کو گھورتا ہے دہانا چبا چبا   غل تھا کہ بس فرس ہو تو ایسا ہو باوفا
دشمن کو کیا نبرد میں بچنے کی آس ہو
لڑلے کٹاریاں یہ فرس جس کے پاس ہو

چھل بل دکھائی فوج کو دوڑا اُچھل اُڑا   صورت بنائی جست کی سمٹا جما اُڑا
دیکھی زمیں کبھی کبھی سوئے سما اُڑا   مثلِ سمندِ بادِ شہِ اِنّما اُڑا

جن تھا پری تھا سحر تھا آہو شکار تھا
گویا ہوا کے گھوڑے پہ گھوڑا سوار تھا

دونوں طرف سے چلنے لگے وار بیک بیاک — دو بجلیاں دکھانے لگیں ایک جا چمک
تکنے لگے فلک کے دریچوں سے سب ملک — اک زلزلہ تھا اوج ثریا سے تا سمک
چہرے پہ آفتاب کے مقتل کی گرد تھی
یہ خوف تھا کہ دھوپ کی رنگت بھی زرد تھی

ہر بار جانبین سے ہوتے تھے وار رد — تھا حرب و ضرب میں وہ شقی بھی بلائے بد
جب بڑھ کے وار کرتا تھا وہ بانیٔ حسد — کہتا تھا بازوئے شہ دیں یا علیؑ مدد
یوں روکتے تھے ڈھال پہ تیغ جہول کو
جس طرح روک لے کوئی شہ زور پھول کو

لایا جو حرف سخت زباں پر وہ بد خصال — جھپٹا مثال شیر درندہ حسنؑ کا لال
گھوڑے سے بس ملا دیا گھوڑا بصد جلال — اتنے بڑھے کہ لڑ گئی اس کی سپر سے ڈھال
ادھیڑ لگی کہ ہوش اڑے خود پسند کے
گھوڑے نے پاؤں رکھ دیئے سر پر سمند کے

عباسؑ نامدار نے پہلو سے دی صدا — ہاں اب نہ جانے دیجیو احسنت مرحبا
دشمن کے مار ڈالنے کی بس یہی ہے جا — سنتے ہی یہ فرس سے فرس کو کیا جدا
گھوڑا بھی اس طرف کو ادھر ہو کے پھر پڑا
مارا کمر کا ہاتھ کہ دو ہو کے گر پڑا

غازی نے دی صدا کہ وہ مارا ذلیل کو — بچے نے آج پست کیا مست پیل کو
کیا منہدم کیا رہ عصیاں کے میل کو — لو کو فیو گرا دیا حرف ثقیل کو

دُو ہو گئی کمر نہیں تسمہ لگا ہوا
دیکھو تو آکے لاش کے ٹکڑے یہ کیا ہوا

قاسم سے پھر کہا کہ مبارک تمہیں ظفر — تسلیم کی ادب سے چچا کو جھکا کے سر
اور عرض کی یہ دُور سے ہاتھوں کو جوڑ کر — اقبال آپ کا کہ مجسم ہو گئی یہ سر
کُشتی پہ آپ جب ہوں تو پھر کیا ہراس ہو
کام آئے کیوں نہ راس جو اُستاد پاس ہو

فرمایا جانِ عم یہ بشر تھا کہ دیو زاد — ڈھایا ہے تم نے کفر کا گھر خانۂ عناد
آؤ کہ تم پہ پھونک دیں پڑھ کر وانِ یکاد — چلائی دَر سے ماں کہ بر آئی مری مراد
بیوہ کا لال بچ گیا صدقے حسینؑ پر
اسپند کوئی کر دے مرے نورِ عین پر

عباسؑ نامدار تو ہنستے چلے اُدھر — یعنی خوشی کی جا کے شہِ دیں کو دوں خبر
اس غم کدے میں دہر کے شادی کہاں مگر — یاں اُس بنے پہ ٹوٹ پڑے لاکھ اہلِ شر
لاکھوں سے لڑ کے پیاس میں مجبور ہو گئے
حربے ہزارہا جو چلے چُور ہو گئے

کیونکر تمام فوج سے اک تشنہ لب لڑے — اک اک لڑا نہ آدمی ہو کے سب لڑے
کھا کھا کے زخم مثلِ امیرِ عرب لڑے — جاں بازیاں ستم کی دکھائیں غضب لڑے
جلوہ میانِ تشنہ دہانی دکھا دیا
بچپن میں لڑ کے زورِ جوانی دکھا دیا

للکارا جس نے بس وہیں گھوڑا ڈپٹ کے آئے — یوں آئے جیسے شیرِ درندہ جھپٹ کے آئے
بجلی اُدھر گری یہ جدھر کو پلٹ کے آئے — صف کو بچھا کے آئے پرے کو اُلٹ کے آئے

منہ سُرخ تھا کھلے ہوئے تھے زخم سینے کے
جن کر لہو ٹپکتے تھے قطرے پسینے کے

کاٹے رسالے تیغ نے کارِ قلم لیا — دستِ یمیں نے جنگ میں آرام کم لیا
پھر دستِ چپ میں تیغ و سپر کو بہم لیا — تیورائے سنبھلے منہ سے لہو ڈالا دم لیا
یاں بند ہو کے آنکھ کھلی جتنی دیر میں
سو تیر دل کو توڑ گئے اِتنی دیر میں

آخر گھرا سپاہ میں وہ چودھویں کا ماہ — روکے تھی فوج تیروں سے اور برچھیوں سے راہ
لشکر کے ساتھ تھا پسرِ سعدِ روسیاہ — تلوار چل رہی تھی کہ اللہ کی پناہ
غل تھا کہ روند ڈالا ہے لشکر کے باغ کو
ہاں نازیو بجھا دو حسنؑ کے چراغ کو

تیغیں چڑھائی تھیں جو لعینوں نے سان پہ — پڑتی تھیں وہ قریب سے اُس ناتواں پہ
تیروں پہ تیر تھے تو کمانیں کمان پہ — حملہ تمام فوج کا تھا ایک جان پہ
یوں برچھیاں تھیں چار طرف اُس جناب کے
جیسے کرن نکلتی ہے گردِ آفتاب کے

غش میں جھکا فرس پہ جو وہ غیرتِ قمر — مارا کسی نے فرق پہ اک گرزِ گاؤ سر
برچھی لگی جو سینے پہ ٹکڑے ہوا جگر — گرنے لگے تھے اسپ سے کہ کمر پہ لگا تبر
طارق کی تیغ کھا کے پکارے امام کو
فریاد یا حسینؑ بچاؤ غلام کو

سنتے ہی استغاثۂ داماد کی صدا — دوڑے حسینؑ جانبِ مقتل برہنہ پا
گھبرا کے بولے حضرتِ عباسؑ باوفا — تلوار کس پہ چل گئی ہے ہے ہوا یہ کیا

چلّائی ماں ارے مری بستی اُجڑ گئی
اے بھائی دوڑو بن کے لڑائی بگڑ گئی

جھپٹے جو شاہ فوج پہ چمکا کے ذوالفقار — بجلی گری یزید کے لشکر پہ ایک بار
اُس غیظ میں یہیں سے جو آئے سُوئے سپاہ — بھاگے پھرا کے گھوڑوں کی باگوں کو سب سوار
بھاگڑ میں خوں سے رن کی زمیں لال ہو گئی
دولہا کی لاش گھوڑوں سے پامال ہو گئی

دیکھا امام نے کہ رگڑتے ہیں ایڑیاں — سوکھے ہوئے لبوں پہ ہے اینٹھی ہوئی زباں
داماد سے لپٹ گئے حضرت بصد فغاں — بے جاں ہوا حسینؑ کے آگے وہ نیم جاں
جب لاش اُٹھائی شہ نے تو چُور استخواں ملے
سب چاند سے بدن پہ سموں کے نشاں ملے (جیسے لالہ شفق سے چرخ پہ ....)

مقتل سے لاش لانے کی صورت کہوں میں کیا — چادر لپیٹ دی تھی کہ اعضا نہ ہوں جدا
قطرے لہو کے خاک پہ گرتے تھے جا بجا — منکا ڈھلا ہوا تھا لٹکتے تھے دست و پا
عباس روتے آتے تھے اور سر پہ ہاتھ تھا
زخمی فرس بھی دولہا کے لاشے کے ساتھ تھا

نزدیک رہ گیا جو درِ خیمۂ حرم — اکبر وہاں سے بڑھ گئے آگے بچشمِ نم
یاں شہ کی راہ تکتی تھیں زینبؑ اسیرِ غم — پوچھا کہ روتے آتے ہو کیوں کیا ہوا ستم
کی عرض سوئے خُلد حسنؑ کا پسر گیا
دولہا جسے بنایا تھا شب کو وہ مر گیا

بے بے نے وہ کہہ کے لگیں پیٹنے جو سر — ماں کوکھ پکڑے ہاتھوں سے دوڑی بچشمِ تر
آ پہنچے لاش لے کے اُدھر شاہِ بحر و بر — پردہ اُٹھایا در کا خواصوں نے دوڑ کر

زینبؑ حرم سرا سے کھلے سر نکل پڑیں
رانڈیں دلہن کو چھوڑ کے باہر نکل پڑیں

برپا ہوا جب یہ حشر تو پھر آئے کس کو چین
ماتم کا شور پڑ گیا لاشے کے جانبین
تھے آگے آگے دولھا کی میت لئے حسینؑ
پیچھے یہ کہتی آتی تھی ماں ہائے نور عین
پیارے شہید ہو کے پھرے فوج شام سے
واری برات لائے بڑی دھوم دھام سے (دست جدا روش .....)

اتنے میں لاش صحن تک آئی لہو میں تر
پہنچے جو سب عروس کو بھی ہو گئی خبر
تھا سامنا تو لاش پہ بھی جا پڑی نظر
گھبرا کے تب سکینہ سے بولی وہ نوحہ گر
دولھا کی لاش آتی ہے سہرے کو توڑ دو
سندا کھٹ دو حجرے کے پردے کو چھوڑ دو

یہ کہہ کے نوچنے لگی سہرا وہ سوگوار
افشاں چھڑا کے خاک ملی منہ پہ چند بار
کہنے لگی لپٹ کے سکینہ جگر فگار
ہے ہے بہن بڑھاؤ نہ سہرے کو میں نثار
وہ کہتی تھی کہ جاگ کے تقدیر سو گئی
بی بی نہ پکڑو ہاتھ کہ میں رانڈ ہو گئی

یہ کہہ کے غش ہوئی جو تسلی سے وہ نوحہ گر
حجرے سے دوڑی بالی سکینہ برہنہ سر
آ کر قریب صحن پکاری بہ چشم تر
اے بیبیو کسی کو دلہن کی بھی ہے خبر
کیسی دھڑا دھڑی ہے یہ اماں کدھر گئیں
دوڑو پھوپی جان سے گھبرا گزر گئیں

رو کر بہن سے کہنے لگے شاہ بحر و بر
اس بے نصیب رانڈ کو لے آؤ لاش پر
بیٹی لٹے گی یوں ہمیں اس کی خبر نہ تھی
اب شرم کیا ہے دیکھ لے دولھا کو اک نظر

زخمی بھی ہے شہید بھی ہے بے پدر بھی ہے
دولھا بھی نام کو ہے جیجا کا پسر بھی ہے

حضرت یہ کہہ کے ہٹ گئے با چشم اشکبار
پیٹی یہ سر کہ غش ہوئی بانوئے دل فگار
چادر سپید اُٹھا کے دلہن کو بہ حال زار
گودی میں لائی زینب غمگین و سوگوار
چلائی ماں یہ گر کے تن پاش پاش پہ
قاسم بنے اُٹھو دلہن آئی ہے لاش پہ

صدقے گئی پھپھی کو نہ ہوئے کہیں ملال
دیکھو دلہن کی پیٹھ پہ ہاتھ اے حسنؑ کے لال
واری بس اب اُٹھو کہ پریشاں ہے میرا حال
کیا یہ خواب ہے کہ دلہن کا نہیں خیال
کروٹ تو لو کہ ماں کے جگر کو قرار ہو
اس بچپنے کی نیند پہ اماں نثار ہو

جس دم دلہن نے لاش کے ٹکڑوں پہ کی نگاہ
نکلی لہو میں ڈوبی ہوئی اک جگر سے آہ
قدموں پہ سر جھکا کے پکاری وہ رشک ماہ
میرا قصور عفو ہو اے میرے بادشاہ
بولی نہ تھی حجاب سے تقصیر وار ہوں
اب حکم ہو تو لاش پہ اٹھ کر نثار ہوں

اے پارۂ دل حسنؑ اے فدیہ حسینؑ
کل وہ خوشی تھی آج یہ برپا ہے شور و شین
کیا کہہ کے روؤں اٹھ گیا اب تو جہاں سے چین
بیوہ کوئی سکھائے تو صاحب کروں میں بین
چھوڑا دلہن کو لاش پہ رونے کے واسطے
دولھا بنے تھے قبر میں سونے کے واسطے

صاحب بتا تو دو تمہیں رونے میں کیا کہوں
بیکس کہوں کہ فدیۂ راہ خدا کہوں
پیاسا کہوں، شہید کہوں یا بنا کہوں
دولھا کہوں کہ قاسم گلگوں قبا کہوں

ماتم بھی یوں تو ہوتا ہے شادی بھی ہوتی ہے
اک شب کی رانڈ دولھا کو کیا کہہ کے روتی ہے (دیکھو لا شفق سے چرخ ....)

جنابِ عباسؑ کی رخصت، جہاد اور شہادت

جس دم حسینؑ دلبرِ شبرؑ کو رو چکے — غربت میں یادگارِ برادر کو رو چکے
پالا تھا جس کو اُس مہِ انور کو رو چکے — صفدر کو تشنہ لب کو دلاور کو رو چکے
دل پر ہجومِ حسرت و اندوہ و یاس تھا
اک بھائی اور ایک پسر شہ کے پاس تھا

رعشہ تنِ ضعیف میں لب خشک رنگ زرد — سینے میں گاہ ہوک اُٹھی گاہ دل میں درد
چھینٹیں قبا پہ خون کی تھیں گیسوؤں پہ گرد — خالی پروں کو دیکھ کے بھرتے تھے آہ سرد
غم تھا کہ ابنِ فاطمہ آفت میں کیا کرے
اب ہم سے دیکھئے کسے قسمت جدا کرے

عباس چاہتے تھے کہ پہلے ہوں میں نثار — بیٹے کے غم میں روئیں نہ آقائے نامدار
اکبر کا عزم تھا کہ بس اب سر ہے تن پہ بار — عمو سے پہلے جائیں ہمیں سیرِ کارزار
جاتا ہے وقت ہاتھ سے گر اب فدا نہ ہوں
حضرت یہ چاہتے ہیں کہ دونوں جدا نہ ہوں (جس دم حسینؑ دلبرِ شبر......)

گردن جھکائے چپ تھے شہنشاہِ بحر و بر — لب برگِ گل سے خشک تھے رخ آنسوؤں سے تر
صدمے سے ہاتھ ملتے تھے عباسِ نامور — پانی تھا غم سے اکبرِ ذی جاہ کا جگر
تلخ اُن کو زیست تھی یہ انھیں سر بارِ دوش تھا
دونوں دلاوروں کو شجاعت کا جوش تھا

بڑھ کر چچا سے کہتے تھے اکبر یہ دم بدم
رخصت کو عرض کرتے ہیں اب شاہِ دیں سے ہم
فرماتے تھے اشارے میں عباسِ ذی حشم
کہیو نہ کچھ تمہیں سرِ شبیرؑ کی قسم
بیٹے فدا وہ ہو گا جو خدمت گزار ہے
مرنے پہ جاں نثار تو پھر اختیار ہے

یہ کہہ کے رکھ دیا قدم شاہِ دیں پہ سر
حضرت سمجھ گئے کہ اب ان کا بھی ہے سفر
صدمے سے قلب ہل گیا تھرا گیا جگر
طاقت نے تن سے کوچ کیا جھک گئی کمر
کیا سنبھلے جس پہ ظلم کا یوں آسماں گرے
دل تھام کر زمیں پہ امامِ زماں گرے (جب کربلا میں داخلہ.....)

بولے بہا کے اشک علمدارِ نامدار
ھل من مبارز کی ہے اُس فوج میں پکار
یاں ایک شاہزادہ ہے اور ایک جاں نثار
آخر حضور دیں گے کسے اذنِ کارزار
دیکھیں تو آپ اُن کے نشانوں کے اوج کو
اتنا تو کوئی ہو کہ نہ بڑھنے دے فوج کو

فرمایا شہ نے ان کو بھی ہے شوقِ جنگ کا
اچھا جہاد کو علی اکبر کو دی رضا
غازی نے کی یہ عرض کہ یا شاہِ کربلا
انصاف کیجئے مجھے خلقت کہے گی کیا
کس منہ سے پاس جاؤں گا خیر الانام کے
جب شاہزادہ قتل ہو آگے غلام کے

بانو کی روح جسمِ شہِ بے وطن کی جاں
دنیا کی زیب آلِ رسولِ زمن کی جاں
چھوٹے بڑوں کی آنکھ کا تارا بہن کی جاں
پامال ہو وہ گل جو ہے سارے چمن کی جاں
اس زندگی پہ خاک اگر ایک دم جئیں
ہمشکلِ مصطفےٰ تو نہ ہو اور ہم جئیں

شہ نے کہا کہ پھر مجھے کھانے دو تیغ و تیر | تم سے جواں تو قتل ہوں جیتا رہے یہ پیر
تم یادگار شیرِ خدا شاہِ قلعہ گیر | ہم صورتِ رسولِ خدا یہ مہِ منیر
سمجھے ہو سہل تم، مجھے مشکل ہے کیا کروں
دو داغ اور ایک مرا دل ہے کیا کروں

کھویا تمہیں تو پھر نہ ملے گا مجھے سراغ | یارب علیؑ کی قبر کا روشن رہے چراغ
میرا چمن لٹے نہ خزاں ہو علیؑ کا باغ | ان کا فراق سہل ہے مشکل تمہارا داغ
ماں باپ کو امید پسر ہے پسر کے بعد
بھائی چھٹا تو پھر نہیں ملتا پدر کے بعد

تم ہو گئے تو تباہ نہ ہوگا ہمارا گھر | عابد کو بیڑیاں نہ پنہائیں گے اہلِ شر
عریاں نہ ہوں گے بلوے میں بیبیوں کے سر | زینب کو شام میں نہ پھرائیں گے دربدر
بچ جائیں گے سبھوں کے گلے ریسمان سے
بُندے چھنیں گے پھر نہ سکینہ کے کان سے

کہنے لگے یہ رو کے علمدارِ ذی حشم | میرا ہے افتخار، نگہبانیٔ حرم
کرتے ہیں گر سپرد یہ عہدہ شہِ امم | بہتر ہے پھر کسی کو عنایت ہو یہ علم
نام و نشاں سے کام نہ دنیا سے کام ہے
مجھ کو رضائے سیدِ والا سے کام ہے

سمعاً و طاعتاً ہمیں کیا آبرو سے کام | کچھ عرض کی مجال نہ تکرار کا مقام
بہتر ہے بیڑیاں بھی پہن لے گا یہ غلام | کھولوں سلاحِ جنگ اجازت جو دیں امام
آقا کریں عتاب نہ گر جاں نثار پہ
جا بیٹھوں منہ چھپا کے علیؑ کے مزار پہ

رونے لگے یہ سن کے شہنشاہِ بحر و بر — عباسؑ آئے خیمہ کے اندر جھکائے سر
سیدانیاں یہ کہنے لگیں تھام کر جگر — کیا ہے جو روتے آئے ہیں عباسؑ نامور
اکبر کی خیر ہو شہِ والا کی خیر ہو
یارب وطن میں فاطمہ صغرا کی خیر ہو

سب بیبیاں تھیں گردِ علمدارِ نامدار — جو پوچھتا تھا اور یہ روتے تھے زار زار
کہتی تھی رو کے زوجۂ عباسؑ بار بار — صاحب کہو تو کچھ کہ مرا دل ہے بے قرار
آنکھوں سے اشک بہتے ہیں چہرہ بھی لال ہے
مقتل میں کیا ہوا جو تمہارا یہ حال ہے

لے کر بلائیں کہتی تھی بانوئے شاہِ دیں — اتنا بتاؤ خیر سے ہیں اکبرِ حزیں
کہتے تھے ہاتھ جوڑ کے عباسؑ مہ جبیں — ہے خیریت حضورؑ نہ گھبرائیں کچھ نہیں
کرتا نہیں مدد کوئی لاکھ التجا کریں
جو بدنصیب ہوں وہ نہ روئیں تو کیا کریں

بنتِ علی کے پاس جو پہونچا وہ سیمبر — ماتم کی صف پہ رکھ دیئے ہتھیار کھول کر
گھبرا کے بولیں زینبِ ناشاد و نوحہ گر — عباسؑ کیا ہے کھولتے ہو کس لئے کمر
اب تو کوئی لڑے گا نہ بے کس امام سے
کیوں بھائی صلح ہو گئی کیا فوجِ شام سے

رونے کی وجہ کیا ہے الجھتا ہے میرا دم — قاسم کے غم میں کیا ہوا کچھ اور تازہ غم
بہتے ہیں اشک نرگسی آنکھوں سے دمبدم — بولو تو کچھ حسینؑ کے سر کی تمہیں قسم
آخر کھلے گی سب پہ کوئی واردات ہو
مجھ سے الگ کہو جو چھپانے کی بات ہو

قدموں پہ سر جھکا کے یہ عباسؑ نے کہا ۔۔۔ میرا کفیل کوئی نہیں آپ کے سوا
کیونکر نہ روؤں قتل ہوئے خویش و اقربا ۔۔۔ مجھ کو امام مرنے کی دیتے نہیں رضا
میرا نہیں خیال شہِ خاص و عام کو
دیجے نجف میں جانے کی رخصت غلام کو

فرماتے ہیں کہ اکبرِ مہ رُو دغا کو جائیں ۔۔۔ اُس لال کو گنوائیں یہ دل ہم کہاں سے لائیں
بچّے ہوں کامیاب شہادت ہمیں نہ پائیں ۔۔۔ پردہ اِسی میں اب ہے کہ عالم سے منہ چھپائیں
کب اُٹھ گئے جہاں سے کسی کو خبر نہ ہو
اُس بن میں خاک ہوں کہ بشر کا گزر نہ ہو

زینبؑ نے تب کہا کہ یہ آزردگی ہے ۔ لو ۔۔۔ معلوم اب ہوا مجھے مطلب ہے اِن کا جو
کیونکر کہوں کہ بھائی کو مرنے کا اِذن دو ۔۔۔ اچھا ۔ بُلا کے کہتی ہوں آگے جو ہو سو ہو
رونا اِدھر، اُدھر یہ غریبی و یاس ہے
اِن کا بھی درد ہے مجھے اُن کا بھی پاس ہے

زاری اِدھر تھی اور پریشان تھا سب کا حال ۔۔۔ آیا اُدھر حسینؑ کو عباسؑ کا خیال
ہمشکلِ مصطفےٰ سے یہ بولا علیؑ کا لال ۔۔۔ آزردہ ہو گئے ہیں علمدارِ خوش خصال
بیتاب دل ہے چھاتی سے لپٹا میں بھائی کو
آؤ حرم میں چل کے منا لائیں بھائی کو

اکبر کا ہاتھ تھام کے گھر میں حسینؑ آئے ۔۔۔ دیکھا کھڑے ہیں حضرتِ عباسؑ سر جھکائے
پھیلا کے ہاتھ لب پہ شہِ دیں سخن یہ لائے ۔۔۔ آؤ گلے لگو کہ دلِ زار چین پائے
تم تو عزیز تر ہو مجھے نورِ عین سے
کس بات پر خفا ہوئے بیکس حسینؑ سے

عباسؑ ہاتھ جوڑ کے بولے کہ کیا مجال — کیا ذکر ہے ملال کا اے فاطمہؑ کے لال
ہیں شیرِ کبریا کی جگہ شاہِ خوش خصال — عاجز ہوں شکر میں جو زباں سب ہوں تن کے بال
حضرت غلام کہہ کے پکاریں تو شاد ہوں
مادر مری کنیز ہے میں خانہ زاد ہوں

حضرت کے منہ کو دیکھ کے زینب نے یہ کہا — صدقے بہن نہ کیجیے بھائی انھیں خفا
آپ اِن پہ شیفتہ ہیں یہ ہیں آپ پر فدا — دنیا میں اور بھی کوئی ایسا ہے باوفا
مثلِ علیؑ جہاں کے شجاعوں کے تاج ہیں
ظاہر ہے آپ پر بھی کہ نازک مزاج ہیں

واں ہے دغا طلب سپہِ خانماں خراب — اِن کو کسی کی بات کے سننے کی کب ہے تاب
حضرت کے ڈر سے دے نہیں سکتے ہیں کچھ جواب — غصہ یہی ہے اور یہی اِن کو پیچ و تاب
بگڑیں تو پھر بپا ہو قیامت جہان میں
رونا یہ ہے کہ آتا ہے فرق آن بان میں

نیت سفر پہ باندھی ہے ہتھیار کھول کر — بہنوں کی بیکسی پہ بھی اب تو نہیں نظر
کیا آپ نے کہا تھا کہ اکبر کٹائیں سر — مجھ کو کبھی یقیں نہیں، یا شاہِ بحر و بر
میرے حواس اِن کے تڑپنے نے کھوئے ہیں
روئی ہوں میں بھی ساتھ یہ اس طرح روئے ہیں

کیونکر زباں سے اپنی کہوں میں جگر فگار — حضرت پہ ان کے دل کا تو مطلب ہے آشکار
ضد ہے یہی کہ جلد ملے اذنِ کارزار — خیر اب خوشی انھیں کی کریں شاہِ نامدار
صفدر ہیں جان دینے کو کچھ جانتے نہیں
غصے میں یہ تو بات کوئی مانتے نہیں

شہ نے کہا کہ بس ہے اسی بات پر ملال — لیں اذنِ جنگ خیر سے دھاریں پئے جدال
قسمت میں ہے کہ یہ بھی نہ ہوں وقتِ انتقال — تنہا مسافرت میں مرے فاطمہ کا لال
قاتل ہو، زخمی سینہ ہو خنجر ہو یاس ہو
کٹنے لگے جو حلق تو کوئی نہ پاس ہو

ہم چاہتے تھے ساتھ جئیں ساتھ ہی مریں — تلواریں کھا کے ایک جگہ خون میں بھریں
مرنے لگیں جو ہم تو یہ زانو پہ سر دھریں — خیران کی جو خوشی نہیں پہلے سفر کریں
مشتاق ہیں بہشت کے حوروں کے قصر کے
یہ قبلِ ظہر پہونچیں گے ہم بعد عصر کے

سب اہلِ بیت رونے لگے سن کے یہ کلام — قدموں پہ شہ کے جھک کے یہ بولا وہ نیک نام
تقصیر بخشئے مری یا شاہِ تشنہ کام — چھاتی سے سر لگا کے یہ کہنے لگے امام
بھائی سے دل بُرا کہیں ہوتا ہے بھائی کا
یہ روٹھنا فقط تھا بہانہ جدائی کا

لائیں سلاح سامنے زینب بچشمِ تر — پٹکا اُٹھا کے شہ نے کہا باندھئے کمر
تسلیم کی جری نے ادب سے جھکا کے سر — ہتھیار سج کے خیمے سے نکلا وہ نامور
غم چھا گیا، اُمید چلی یاس رہ گئی
بس تھرتھرا کے زوجۂ عباس رہ گئی

لے کر علم ادھر سے بڑھا وہ فلک جناب — خادم اُدھر سے لائے فرس کو بصد شتاب
گھوڑے پہ جلوہ گر جو ہوئے مثلِ آفتاب — نورِ قدم سے چاند بنے حلقۂ رکاب
اسوار سرفراز فرس سربلند تھا
ہر نعل کا نشاں مہِ نو سے دوچند تھا (جس دم حسین دلبرِ شبیر....)

مرکب قدم زمیں پہ نہ رکھتا تھا ناز سے — بجلی کو خوف کیا ہے نشیب و فراز سے
چالاکیاں دکھاتا تھا کس امتیاز سے — اڑتا تھا پر صدا نہ نکلتی تھی ساز سے
راکب وہ ہیں جو فرقِ دو عالم کے تاج ہیں
گھوڑا بھی جانتا ہے کہ نازک مزاج ہیں

وہ تھوتنی وہ اُبلی ہوئی انکھڑیاں وہ یال — گویا کھلے تھے حور کے گیسو پری کے بال
وہ جلد وہ دماغ وہ سینہ وہ سُم وہ چال — دم میں کبھی ہما کبھی ضیغم کبھی غزال
وہ قصرِ آسماں پہ بھی جانے میں طاق تھا
دَوڑ پڑا اگر خدا سے دیتا بُراق تھا

گھوڑے کی یہ شکوہ وہ شوکت سوار کی — تصویر تھی ہوا پہ شبہ ذوالفقار کی
وہ نور وہ چمک علم زرنگار کی — خوشبو مہک رہی تھی نسیم بہار کی
پنجہ نہ تھا نشانِ ثریا مآب کا
تھا فرقِ جبرئیل پہ تاج آفتاب کا (حیب کربلا میں اخلہ...)

وہ دبدبہ وہ سطوتِ شاہانہ وہ شباب — تھرا رہا تھا جس کی جلالت سے آفتاب
وہ رعبِ حق کہ شیر کا زہرہ ہو آب آب — صولت میں فرد و فخرِ جراُت میں انتخاب
صورت میں سارے طورِ خدا کے ولی کے ہیں
شوکت پکارتی ہے کہ بیٹے علیؑ کے ہیں (حیدن میں سربلند...)

آمد علیؑ کے شیر کی ہے رزم گاہ میں — دہشت سے تہلکہ ہے عدو کی سپاہ میں
ہر چند ابھی سواریٔ صفدر ہے راہ میں — بجلی چمک رہی ہے ہر اک کی نگاہ میں
غل ہے وہ شیر قصد کئے ہے ترائی کا
پھر آج معرکہ ہے علیؑ کی لڑائی کا

اللہ رے رعبِ آمدِ عباسِ عرش قدر   سینوں میں دل چھپے ہوئے ہیں جوشنوں میں صدر
غل ہے قریب تر ہے سپہرِ وغا کا بدر   زہرے ہیں آب گھاٹ سے بھاگے ہیں اہلِ غدر
آتا ہے ابنِ ضیغمِ یزداں لڑائی کو
شیروں نے ڈر کے چھوڑ دیا ہے ترائی کو   (جاتا ہے شیرِ بیشۂ حیدر...)

تھا فوجِ قاہرہ میں تلاطم کہ الحذر   تھیں موج کی طرح سب اِدھر کی صفیں اُدھر
چکر میں تھی سپاہ کہ گردش میں تھا بھنور   پانی میں تھے نہنگ اُبھرتے نہ تھے مگر
فوجیں فقط نہ بھاگی تھیں منہ موڑ موڑ کے
دریا بھی ہٹ گیا تھا کنارے کو چھوڑ کے   (آمد ہے کربلا کے نیستاں...)

تھا شش جہت میں غل کہ یہ ہے روزِ انقلاب   اُلٹے گا اِس زمیں کا ورق ابنِ بوتراب
اِس شیر پر نہ ہوگی کوئی فوج فتحیاب   بس اب بنائے عالمِ اِمکاں ہوئی خراب
حملہ غضب ہے بازوئے شاہِ حجاز کا
لنگر نہ ٹوٹ جائے زمیں کے جہاز کا   (جب رن میں سربلند....)

ہلچل یہ تھی کہ گردِ سواری عیاں ہوئی   گویا چمن میں بادِ بہاری عیاں ہوئی
آمد خدا کے شیر کی ساری عیاں ہوئی   آپ آئے کیا کہ قدرتِ باری عیاں ہوئی
روشن تھا شمعِ طور سے پرتو حضور کا
خلعت ملا زمینِ مقدس کو نور کا   (آمد ہے کربلا کے نیستاں....)

وہ ضو علم کی وہ رُخِ عباسِ نامور   رکھے تھا ہاتھ چہرے پہ خورشیدِ خیرہ سر
پنجہ اُدھر علم کا رُخ پر ضیا اِدھر   دو نورِ سرمدی تہ و بالا تھے جلوہ گر
یکتا وہ زرق برق میں یہ آب و تاب میں
تھا فرق ایک نیزے کا دو آفتاب میں   (جاتا ہے شیرِ بیشۂ حیدر...)

نورِ جبیں نے جلوۂ قدرت دکھا دیا　　چہرے نے حسنِ صبحِ صباحت دکھا دیا
ابرو نے رنگِ تیغِ شجاعت دکھا دیا　　قامت نے سب کو طورِ قیامت دکھا دیا
جنگل کو بوئے کوچۂ گیسو بسا گئی
کپڑوں سے نکہتِ گلِ فردوس آ گئی (آمد ہے کربلا کے نیستاں...)

شوکت کا قول تھا کہ مطیعِ جناب ہوں　　کہتی تھی فتح خاکِ درِ بوتراب ہوں
نصرت کا ادعا تھا کہ میں کامیاب ہوں　　دعویٰ تھا قہر کو کہ علی کا عتاب ہوں
فاقے سے تھے پہ صبر بھی منہ موڑتا نہ تھا
ہر گام پر ثبات قدم چھوڑتا نہ تھا

تلوار وہ، ہلال کٹے جس کو دیکھ کر　　تھی کہکشاں، کمندِ عدو بندِ شیرِ نر
مہتاب آسمانِ ظفر آہنی سپر　　خود آفتاب تھا تو جبینِ مبیں قمر
رخ کے عرق سے نور کے قطرے ٹپکتے تھے
حلقے نہ تھے زرہ میں ستارے چمکتے تھے

نیزے کی نوک سے جگرِ آفتاب خوں　　سینہ ہے آسماں کا اُسی دن سے نیلگوں
ابروئے حورِ فتح و ظفر تھا کماں کا نوں　　تھا ماہِ نو بھی جس کے چم و خم سے سرنگوں
دہشت سے گوشہ گیر رئیسانِ شام تھے
ترکش کے سارے تیر اجل کے پیام تھے (جاتا ہے شیرِ بیشۂ حیدر...)

بڑھ کر صدا یہ دیتا تھا اقبال دم بدم　　افزوں ترا جلال دوبالا ترا حشم
نصرت پکارتی تھی جِلو میں قدم قدم　　جب تک ہے آفتاب درخشاں رہے علم
مطلب منافقوں کے جو ہیں ملتوی رہیں
یارب ترے حسینؑ کے بازو قوی رہیں

اللہ رے جلالت و شوکت حضور کی — دہشت سے اُٹھ نہ سکتی تھی گردن غرور کی
ہر جا فرس شکوہ دکھاتا تھا طور کی — بجلی قدم قدم پہ چمکتی تھی نور کی
ذرّوں کی ضَو سے مہرِ جہاں تاب زرد تھا
مٹی میں یہ دمک تھی کہ کُندن بھی گرد تھا (جب کربلا میں داخلہ...)

نیزہ زمیں میں گاڑ کے گونجا جو شیرِ نر — چہروں سے رنگ اُڑ گئے تھرّا گئے جگر
نکلے رجز میں خشک زباں سے وہ شعرِ تر — جس کے جواب میں فصحا نے جھکائے سر
غُل تھا زباںِ ناطقہ الکن ہے لال ہے
لاریب فیہ مصحفِ ناطق کا لال ہے

نعرہ یہ تھا کہ گو ہرِ برجِ شرف ہوں میں — فرزندِ صاحبِ شرفِ من عرف ہوں میں
فخرِ سلف جو شاہ ہے اُس کا خلف ہوں میں — اللہ و پنجتن ہیں جدھر اُس طرف ہوں میں
رایت سے پیش رو ہوں خدا کی سپاہ کا
پیرو ہوں بادشاہِ ہدایت پناہ کا (جاتا ہے شیرِ بیشہ....)

رو کے ہمیں نکل کے جو طاقت کسی میں ہو — لے تیغ میاں سے جو شجاعت کسی میں ہو
گرمائے رخش کو جو حرارت کسی میں ہو — آئے جو حرب و ضرب کی قدرت کسی میں ہو
دو ہاتھ میں علیؑ کے پسر وار پار ہیں
دریا نہیں کہ رُک گیا ہم ذوالفقار ہیں

سرکش ہیں سب ہماری زبردستیوں سے زیر — دادا شجاع باپ اولوالعزم ہم دلیر
جب رَن پڑا ہے کردیئے ہیں زخمیوں کے ڈھیر — لائے ہیں جا کے آگ سے پانی خدا کے شیر
عفریت بھاگتے ہیں وہ چوٹیں ہماری ہیں
بیرالعلم میں کود کے تلواریں ماری ہیں (جب رن میں سربلند...)

جب معرکے میں جم گئے ہیں پاؤں گاڑ کے   دم میں قدم اُکھاڑ دیئے ہیں پہاڑ کے
روکی ہے تیغ کفر کی بستی اُجاڑ کے   پھینکا ہے گھر سے حق کے بُتوں کو اُکھاڑ کے
پڑھ کر درود فوجِ مَلک مدح خواں ہوئی
جب ہم گئے تو کعبہ کے اندر اذاں ہوئی

در پے ہمیں رہے رہِ حق کی تلاش کے   ٹکڑے تلک جلا دیئے کافر کی لاش کے
چھوڑا نہ سر بدن پہ کسی بد معاش کے   کاٹے ہمیں نے ہاتھ ہر اک بُت تراش کے
ناقوس کو اُٹھا کے زمیں پر پٹک دیا
آتشکدوں پہ تیغ کا پانی چھڑک دیا

کیا کیا لڑے ہیں خیبر و بدر و تبوک میں   یہ ہاتھ پیاس میں نہ رُکے ہیں نہ بھوک میں
شہرہ ہے اپنی جود و سخا کا مُلوک میں   حاتم سے بھی سخی ہیں سوا ہم سلوک میں
بگڑے ہیں جب تو خون کے دریا بہائے ہیں
سر دے دیا ہے بات پہ جس وقت آئے ہیں

جنگ آزما ہیں صف شکن و قلعہ گیر ہیں   صولت میں دبدبے میں عدیم النظیر ہیں
دنیا کے بادشاہ ہیں گردوں سریر ہیں   اِس اوج پر حسینؑ کے در کے فقیر ہیں
رتبے پہ فخر ہے نہ شجاعت پہ ناز ہے
گر ہے تو بس غلامیٔ حضرت پہ ناز ہے (آمد ہے کربلا کے نیستاں....)

بچوں کا ایلچی بھی ہوں اور تشنہ کام ہوں   سقائے اہلِ بیتِ رسولِ انام ہوں
شبیرؑ کی سپر ہوں علی کی حسام ہوں   شاہوں کا شاہ ہوں شہِ دیں کا غلام ہوں
سینے پہ تیر کھاؤں گا تلواریں کھاؤں گا
یہ مشک آب نہر سے میں لے کے جاؤں گا

یوں تو ہیں تین روز سے بے آب و دانہ سب
لیکن قریبِ مرگ ہیں دو طفلِ تشنہ لب
کیوں آل کو ستاتے ہو بے جرم و بے سبب
کچھ مصطفٰے کا پاس نہیں تم کو ہے غضب
دو دن تو بیکسوں پہ عطش میں گزر گئے
کس پر یہ خون ہو گا جو معصوم مر گئے

یہ دھوپ یہ خیام کا تپنا یہ گرم بن
مرجھا گیا ہے احمدِ مختار کا چمن
مانندِ غنچہ پیاس سے کھولے ہیں سب دہن
پانی بغیر اب نہ جئیں گے وہ گلبدن
گرمی سے ہاتھ پاؤں غریبوں کے سرد ہیں
نیلے ہیں ہونٹ پھول سے رخسار زرد ہیں

چلّایا شمر تب کہ عبث ہے سوالِ آب
دیں گے زبانِ تیغ سے ہم آپ کو جواب
بچوں کی پیاس سے ہے جو حضرت کو اضطراب
پھر کس لئے ہے بیعتِ حاکم سے اجتناب
خیمے سے گھٹنیوں اگر اصغر بھی آئے گا
جز آبِ تیر پانی کا قطرہ نہ پائے گا

ایسا سخن کبھی جو سُنا تھا نہ کان سے
برچھی لگی مگر نہ کہا کچھ زبان سے
جھومے فرس پہ جب شہِ مرداں کی شان سے
بس خود بخود نکلنے لگی تیغ میان سے
نعرہ کیا کہ او سگِ ناپاک دُور ہو
یہ کیا سخن ہے منہ میں ترے خاک دُور ہو

حجت تمام کرنے کی خاطر تھے یہ کلام
ظالم شراب خوار کی بیعت کرے امام
سوکھی ہوئی زبان جو ہلا دے وہ تشنہ کام
حاضر ابھی ہوں چشمۂ کوثر کے لاکھ جام
قدرت ہے سب طرح کی امامِ جلیل کو
چاہیں تو وہ سبیل کریں سلسبیل کو

کیا جانے مرتبہ پسرِ فاطمہؑ کا تو
عزت بہشت کی ہیں تو کوثر کی آبرو
سردار بُرد بار نکوکار نیک خو
ان کا عدو خدا و پیمبر کا ہے عدو
جاری ہے فیض فاطمہؑ کے نورِ عین کا
غاصب ہے تو یہ نہر بھی ہے حق حسینؑ کا

یہ کہہ کے لی نیام سے تیغِ شرر فشاں
آواز دی زمیں نے کہ یا حافظِ زماں
شعلے نے الحذر کہا بجلی نے الاماں
دہشت سے تھرتھرا گیا مریخِ آسماں
ثابت ہوا کہ چہرۂ خورشید کٹ گیا
غُل تھا کہ فوجِ شام کا دفتر اُلٹ گیا

بجلی چمک کے ہوتی تھی جب آسماں کے پار
پڑھتا تھا عرش آیۂ کرسی کو بار بار
زیرِ زمیں تو گاوِ زمیں کو نہ تھا قرار
تھرا رہا تھا ثورِ فلک وقتِ گیرودار
غُل تھا علیؑ کی تیغ کا سب رنگ ڈھنگ ہے
جبریل کانپتے تھے کہ خیبر کی جنگ ہے

اقبال و تندرستی و آسائش و قرار
امن و امان و صبر و توانائی و وقار
حلم و سکون و راحت و آرام و اختیار
رعب و ثبات و سرکشی و قدر و اقتدار
آثارِ قہرِ حق انھیں معلوم ہو گئے
سب تیغ کے چمکتے ہی معدوم ہو گئے

غُل تھا چمکتی آتی ہے تیغِ اجل چلو
ڈر کر کہا اماں نے کہ قبل از جدل چلو
دب کر صدا غرور نے دی سر کے بل چلو
بولی سلامتی کہ سلامت نکل چلو
دریا بہے گا خوں کا کنارے فرات کے
دم بھر میں بند ہوئیں گے کوچے نجات کے

ڈھالوں سے شامیوں کی اُدھر چھا گئی گھٹا
دریا پہ جھُوم جھُوم کے سب آ گئی گھٹا
ایسا بڑھا یہ اَبر کہ شرما گئی گھٹا
بارانِ تیر دشت میں برسا گئی گھٹا
کُشتوں کو اپنے فوجِ عدو رَوندنے لگی
جنگل میں برقِ قہرِ خدا کوندنے لگی

چمکی جو تیغ آمدِ قہرِ خُدا ہوئی
سر پر جو آ گئی تو قیامت بپا ہوئی
سینے سے روح جسم سے گردن جُدا ہوئی
خوں میں ڈبو چکی تو نہ پھر آشنا ہوئی
باڑھ اس غضب کی وار وہ اس زور شور کا
دشمن کو اُس کا گھاٹ کنارا تھا گور کا

ہردم بھی معرکے میں اجل اُس کے دم کے ساتھ
گرتا تھا خود کٹ کے برابر جھلم کے ساتھ
رہتی تھی اس طرح ظفر و فتح خم کے ساتھ
جیسے ہمیشہ رہتا ہے سکہ درم کے ساتھ
ہر دل پہ اُس کی شان و جلالت کا نقش تھا
تمغہ نہ کہیے آیۂ نصرت کا نقش تھا

بسم اللہِ صحیفۂ نصرت تھی اُس کی ناب
مانندِ ذوالفقار گراں قدر و انتخاب
جوہر میں آبرو میں اصالت میں لاجواب
وہ قد وہ خم وہ مُنہ کی صفائی وہ آب و تاب
اُترے جگر سے جس کے اُسی کو خبر نہ ہو
کاٹے گلے ہزار کے اور خوں میں تر نہ ہو (جاتا ہے شیر بیشۂ حیدر....)

قد کتنا خوشنما ہے بدن کس قدر ہے گول
جوہر شناس ہے تو اسے موتیوں میں تول
مفتاحِ فتح ہے درِ نصرت کو اس سے کھول
وہ تیغ ہے خراجِ صفاہاں ہے جس کا مول
اشراف کا بناؤ رئیسوں کی شان ہے
شاہوں کی آبرو ہے سپاہی کی جان ہے

دلسوز، شعلہ خو، شرر انداز، جاں گداز
لشکر کُش و شکست رسان و ظفر نواز
خونخوار و کج ادا و دل آزار و سرفراز
حاضر جواب، تیز طبیعت، زباں دراز
سچ اس کی ہے پسند جہاں کو کبھی نہ ہو
معشوق پھر نہیں اگر اتنی کجی نہ ہو

پُشتہ وہ اس کا اور وہ باریکیٔ خمیر
کس بل میں بے مثال، اصالت میں بے نظیر
جنگ آزما، خراج ستانندہ، ملک گیر
گیتی نورد، بادیہ پیما، فلک مسیر
اس کا جلال خلق میں کس پہ جلی نہیں
کوچہ وہ کون سا ہے جہاں یہ چلی نہیں (آمد ہے کربلا کے نیستاں...)

پایا تھا باغیوں نے ثمر یہ دمِ جدل
ڈھالوں سے پھول اڑ گئے تھے برچھیوں سے پھل
شاخیں کماں کی توڑتا تھا پنجۂ اجل
گرتے تھے سہم کر قد انداز منہ کے بل
گوشوں کو ڈھونڈتے تھے کماں کش ہٹے ہوئے
ریتی پہ تخلِ تیر پڑے تھے کٹے ہوئے

گرزِ گراں و تیغ و خنجر و گرز و سنان و تیر
دو دو تھے پیشِ آئینۂ تیغ بے نظیر
دم میں یہ صف تمام ادھر کا سپاہ اخیر
آفت کا معرکہ تھا قیامت کی دار و گیر
اڑ کر بھی مُرغِ روح کا بچنا محال تھا
جوہر حسام میں تھے کہ لوہے کا جال تھا

یوں مورچوں کو چاٹ گئی تیغ شعلہ رنگ
لوہے کو خاکِ شور میں کھا جائے جیسے زنگ
کمروں سے کھنچ نہ سکتے تھے خنجر میانِ جنگ
جوشن جو کٹ گئے تھے تو چار آئینے تھے دنگ
تلواریں منہ چھپائے تھیں ضربِ درشت سے
ڈھالیں لپٹ گئی تھیں سواروں کی پشت سے

گرتی تھی کوند کر جو وہ برقِ شرارہ ریز — دوزخ کھلا تھا بند تھے سب کوچہ گریز
چلنے میں تیغ تیز، فرس تیز، ہاتھ تیز — رہ رہ کے گرم ہوتا تھا ہنگامۂ ستیز

کشتے تھے ایک ضرب میں دو سوں کہ چار سوں
ششدر تھے سب کہ موت سے کیونکر دوچار ہوں

کاٹی سپر تو کاسۂ سر تک پہونچ گئی — سر پر پڑی تو پیر کے بر تک پہونچ گئی
بڑھ کے مثالِ برق جگر تک پہونچ گئی — پی کر لہو جگر کا کمر تک پہونچ گئی

بڑھ کر کمر سے زین پہ آئی سُرنگ کے
ٹکڑے گرے نہ تھے کہ یہ نیچے تھی تنگ کے (جاتا ہے شیرِ بیشۂ حیدرؑ...)

آمد تھی تیغ کی کہ اجل کا پیام تھا — یہ صف اخیر تھی وہ رسالہ تمام تھا
بجلی سا ہر جگہ فرسِ تیز گام تھا — ششدر تھی موت چار طرف قتلِ عام تھا

اِس غول پر کبھی تھی کبھی اُس قطار پر
پڑتا تھا ایک تیغ کا سایہ ہزار پر

وہ تیغ کی چمک وہ تڑپ راہوار کی — رفرف کی اک شبیہ تو اک ذوالفقار کی
شوکت سوار میں شہِ دُلدل سوار کی — حملوں میں شان سب اسدِ کردگار کی

چتون وہی غضب وہی بیباکیاں وہی
پھرتی وہی جھپٹ وہی چالاکیاں وہی

توڑا یہ مورچہ وہ صف اُلٹی اُدھر پھرے — تلوار خوں میں آپ پسینے میں تر پھرے
یوں خاک پر گرا کے لعینوں کے سر پھرے — جیسے شکار کھیلے ہوئے شیرِ نر پھرے

تھی قہر کی نگاہ غضب کا جلال تھا
آنکھیں بھی سرخ سرخ تھیں چہرہ بھی لال تھا

منہ پھر گیا سپاہ کا جس سمت رُخ کیا | یاں آئے واں گئے اِسے مارا اُسے لیا
باقی رہے ہزار میں دس سو میں اِک جیا | اللہ رے دم لہو پہ لہو تیغ نے پیا
اس پر بھی تشنگی میں نہ تسکین ذری ہوئی
گویا تھی آگ پیٹ میں اُس کے بھری ہوئی

بے شک تھا ان کا ہاتھ امیرِ عرب کا ہاتھ | پہونچا وغا میں تو طرف اِک تشنہ لب کا ہاتھ
آئی اجل اُٹھا جو کسی بے ادب کا ہاتھ | شیرِ خدا کے شیر نے مارا غضب کا ہاتھ
بازو پہ آئی تیغِ دودم شانہ کاٹ کے
پہونچے کو بھی قلم کیا دستانہ کاٹ کے

چلتا تھا مثلِ برق یمین و یسار ہاتھ | ڈر ڈر کے جوڑتے تھے ضلالت شعار ہاتھ
اِن کی نہ ایک ضرب نہ اُن کے ہزار ہاتھ | کافی تھے سب کو تیغِ دو دستی کے چار ہاتھ
آواز شش جہت میں تکبیرِ و بزن کی تھی
اللہ کا کرم تھا مدد پنجتن کی تھی

نعرہ جُدا صدائے بگیر و بدہ جُدا | گوشے کماں سے دور تو گوشوں سے زہ جُدا
بکتر جُدا زمین پہ ٹکڑے زرہ جُدا | نیزوں کو دیکھئے تو گرہ سے گرہ جُدا
اللہ رے فرق گردن و سر بھی بہم نہ تھے
کُشتوں کا ذکر کیا ہے کہ تیغوں میں دم نہ تھے

جس کی طرف نظر دمِ جنگ و جدل پھری | کچھ ہٹ کے تیغ سے اُسی جانب اجل پھری
رہوار یوں پھیرا کہ اشارے میں کل پھری | تلوار بھی گلوں کی طرف برمحل پھری
ایسے جری سے کس کو مجالِ مصاف تھی
یوں پھر کے صف کی صف کو جو دیکھا تو صاف تھی

نیزے اِدھر قلم تو اُدھر برچھیاں قلم — ترکش دونیم ٹکڑے کمانیں نشان قلم
ہر ہاتھ میں قلم کی طرح اُستخواں قلم — منہ تیغ کا خراب سناں کی زباں قلم
جب سَن سے آئی سر پہ کسی بدخصال کے
گویا سموم چل گئی پھولوں پہ ڈھال کے

ثابت رہی نہ ڈھال نہ مغفر نہ سر بچا — سینے میں دل کو کاٹ گئی، گر جگر بچا
دو ٹکڑے ہوگیا وہ اِدھر جو اُدھر بچا — بے زخم کھائے ایک نہ بیداد گر بچا
تلوار سے کوئی کوئی ڈر سے ہلاک تھا
سالم تھا جس کا جسم جگر اُس کا چاک تھا

سر سے کمر میں تھی تو کمر سے تہِ فرس — آفت کا منہ تھا قہر کا دم خم ستم کا کس
کشتے تڑپ رہے تھے چپ و راس و پیش و پس — دو تھے اگر تو چار ہوئے پانچ تھے تو دس
غُل تھا وہی لڑے جسے سر تن پہ بار ہو
آفت بپا ہے کون اجل سے دوچار ہو

جب بڑھ کے سَن سے صورتِ تیغِ علیؑ چلی — ثابت ہوا کہ ضربتِ دستِ ولی چلی
دل پر خفی چلی تو گلوں پر جلی چلی — تن سے نکل کے روح پکاری چلی چلی
دی تیغ نے صدا کہ ارادہ کدھر کا ہے
چلاّئی موت چل یہی رستہ سقر کا ہے

خشکی میں تھی جو آب تو آتش تری میں تھی — ہمنامِ ذوالفقارِ علیؑ صفدری میں تھی
تلوار تھی کہ برق لباسِ پری میں تھی — بے باک اِس لئے تھی کہ دستِ جری میں تھی
خوں بھی اُسے حلال دِیت بھی معاف تھی
کاٹا تھا سَو گلوں کو مگر پاک صاف تھی

سارے رسالہ دار تباہی میں پڑ گئے — اب منہ کسے دکھائیں کہ چہرے بگڑ گئے
نامی جو تھے جواں قدم اُن کے اُکھڑ گئے — بھاگے جو سب نشاں بھی خجالت سے گڑ گئے
علموں کے پاس ڈھیر پھریروں کے رن میں تھے
ریتی پہ بیرقیں تھیں کہ مُردے کفن میں تھے

پہنے ہوئے تھے جسم میں زرہیں جو چُست چُست — چوٹیں کڑی پڑیں تو ہوئے وہ بھی سخت سُست
خوفِ اجل سے بھول گئے وعدہ نخست — ٹوٹی صفوں میں ہوش کسی کے نہ تھے درست
اک شور تھا کہ جان گئی اس لڑائی میں
گھوڑے بھگاؤ آگ لگی ہے ترائی میں

مغفر نہ سر کے پاس نہ خنجر کمر کے پاس — بیٹے کے پاس باپ نہ بیٹا پدر کے پاس
قبضے کے پاس تیغ نہ دستہ تبر کے پاس — کڑیاں زرہ کے پاس نہ دامن سپر کے پاس
نیزے پہ نہ سناں تھی نہ پرچم نشان پہ
پیکاں نہ تیر پہ تھے نہ چلّے کمان پہ

ڈر ڈر کے پچھلے پاؤں سپاہِ لعیں ہٹی — یہ صف سوئے یسار وہ سوئے یمیں ہٹی
سرکے جبال نہر کہیں سے کہیں ہٹی — دہشت سے آسماں ہوا اونچا زمیں ہٹی
بھاگڑ پڑی کہ ایک سے اک آگے بڑھ گیا
دریا لہو کا کشتیِ گردوں پہ چڑھ گیا (جب رن میں سر بلند....)

دشمن جو گھاٹ پر تھے وہ دھو بیٹھے جاں سے ہاتھ — سر اُڑ گئے تنوں سے جدا تھے عناں سے ہاتھ
توڑا کبھی جگر کبھی چھیدا سناں سے ہاتھ — جب کٹ کے گر پڑیں تو پھر آئیں کہاں سے ہاتھ
اب ہاتھ دستیاب نہیں منہ چھپانے کو
ہاں پاؤں رہ گئے ہیں فقط بھاگ جانے کو

سر ہر قدم پہ تھے تنِ کفار سے جُدا　　قبضہ کماں کا دستِ کماندار سے جُدا
چلّے تھے سر بسر لبِ سوفار سے جُدا　　ڈرے جُدا ہلاک تھے تلوار سے جُدا
زہگیر کیا کرے جو نہ ترکش میں تیر ہوں
چلّاتے تھے کہ چل کے کہیں گوشہ گیر ہوں

یوں تھرتھرا رہے تھے ہر اک پہلواں کے پاؤں　　چلنے میں جیسے کانپتے ہوں ناتواں کے پاؤں
اُٹھ اُٹھ گئے سپاہِ ضلالت نشاں کے پاؤں　　رن میں جمے رہے تو اسی نوجواں کے پاؤں
ہٹتا کبھی ہے جہاد میں حق کا ولی کہیں
عباسؑ بھی ہٹیں جو ہٹے ہوں علیؑ کہیں

جب شیر سے ترائی کی جانب جھپٹ گئے　　صف آئی صف پہ گھوڑے پہ گھوڑے اُلٹ گئے
اب کیا بڑھیں کہ ڈر سے لہو تن کے گھٹ گئے　　جن کے قدم جمے رہے سر اُن کے کٹ گئے
حملوں کے بعد تنتے تھے یوں نعرے مار کے
انگڑائی شیر لیتا ہے جیسے ڈکار کے

نیزے کو تولتا ہوا گر کوئی یل بڑھا　　دریائے قہرِ حق طرفِ پُر دغل بڑھا
کچھ ہاتھ کچھ حسامِ دو دستی کا پھل بڑھا　　تلوار سر پہ آئی کہ دستِ اجل بڑھا
دو ٹکڑے طول میں جو دمِ امتحاں ہوئے
غل تھا کہ معنیٔ یدِ طولیٰ عیاں ہوئے

رکتی تھی خود پہ نہ جھلم پہ نہ ڈھال پہ　　حیرت تھی فوجِ شام کو اس چال ڈھال پہ
بالا تھا راستی میں قد اُس کا ہلال پہ　　جوہر فروتنی کے بھی تھے اس کمال پہ
چشمک یہ دمبدم تھی کہ سرکش ذلیل ہیں
چلتے ہیں جھک کے وہ جو نجیب و اصیل ہیں

گھوڑوں کے دوڑنے سے اُڑی دشت میں جو گرد — معقل بھی زرد تھا فلکِ نیلگوں بھی زرد
جتنے جواں تھے دفترِ مردانگی میں فرد — چہرے کٹے ہوئے تھے اُنھیں کے دمِ نبرد
تقسیمہ کیسا ہوش میں اک خود غلط نہ تھا
زخمی تھے منہ کہیں اثرِ خال و خط نہ تھا

ہر سمت تھا مقدمہ جانوں کا رُوبکار — آتی تھی موت جائزہ لینے کو بار بار
اسوار ہر طرف تو نمار و رسالہ دار — طبلق لئے تھے غشیٔ فوجِ ستم شعار
کیا ابتری سپاہِ ضلالت اثر میں ہے
غل تھا چلو کہ فوج کی بھرتی سقر میں ہے

آئے جو سوئے نہر صفیں موڑ موڑ کے — بھاگے کماں میں تیر عدو جوڑ جوڑ کے
تلواریں پٹکیں خاک پہ دم توڑ توڑ کے — بھاگے وغا میں گھاٹ کو سب چھوڑ چھوڑ کے
وہ برچھیاں نہ پھر نہ وہ شورِ مصاف تھا
جس مورچے پہ تیغ اُٹھائی وہ صاف تھا

وہ رہ گئے کہ زخموں سے جو چُور چُور تھے — جو تھے قریبِ نہر وہ سب دُور دُور تھے
غازی تھے صف شکن تھے جری تھے غیور تھے — دریا پہ اور کوئی نہ تھا بس حضور تھے
غل تھا کہ اب بچیں گے نہ ہم اس لڑائی میں
بھاگو کہ شیر گونج رہا ہے ترائی میں

لڑتا کنارِ نہر جو پہنچا وہ شہسوار — خوں پونچھ کر رکھی تہِ داماں تیغِ آبدار
آئی صدائے حضرتِ الیاس با وقار — اے نورِ عینِ ساقیٔ کوثر ترے نثار
سر پر ہو کون تیغ پکڑ کر جو تو بڑھے
دھو ہاتھ منہ کہ نہر کی بھی آبرو بڑھے (جاتا ہے شیرِ بیشۂ حیدر...)

ف۔ زخمی اصطلاحِ سپہ گری کے معنوں میں استعمال ہوا

گرمی میں تھے جو غرق عرق سر سے تا بہ پا　　سردی سے اس ترائی کی جاں آگئی ذرا
دریا سے ٹھنڈی ٹھنڈی جو آنے لگی ہوا　　صد مرحبا کہ دھوپ میں ہیں شاہ کربلا
دل ہو گیا کباب مصیبت پہ شاہ کی
عباسؑ نامدار نے اک سرد آہ کی

ڈوروں سے بیزباں پہ جو تھا آب و دانہ بند　　دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کا پتا تھا سمٹتا تھا بند بند　　چمکارتے تھے حضرت عباسؑ ارجمند
تڑپاتا تھا جگر کو جو شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا منہ سوار کا　(آمد ہے کربلا کے نیستاں...)

ڈالا میانِ نہر جو اسپِ صبا شتاب　　آنکھیں قدم سے ملنے لگے دوڑ کر حباب
موجیں بڑھیں برائے قدم بوسئ جناب　　اچھلیں علم کے چومنے کو ماہیانِ آب
لہروں کی بجلیاں جو برابر چمکتی تھیں
کھلتی تھیں اور حبابوں کی آنکھیں جھپکتی تھیں

پانی سے منہ اٹھائے جو تھا اسپ سربلند　　ڈھیلا کیا دلیر نے خود جھک کے زیر بند
بولا ہلا کے سر کو سمندِ وفا پسند　　پیاسا ہے ذوالجناح شہنشاہِ ارجمند
حیواں تو ہوں حضور پہ خوش اعتقاد ہوں
میں بھی تو ابنِ فاطمہؑ کا خانہ زاد ہوں

فرمایا آپ نے مرے غمخوار مرحبا　　ڈگتا نہیں کبھی قدمِ صاحبِ وفا
تو اپنی خانہ زادی کا حق کر چکا ادا　　پیشِ خدا بزرگ ہے صابر کا مرتبا
پانی سے اے فرس تجھے جب اجتناب ہو
سیراب کس طرح پسرِ بوتراب ہو

دریا سے مشک بھر کے جو نکلا وہ تشنہ کام — پھر گھاٹ پر گھٹا کی طرح آئی فوجِ شام
تنہا پہ بے وطن پہ ہوا پھر ہجومِ عام — پھر ہر طرف سے چلنے لگے نیزہ و حسام
اک شور تھا کہ بڑھنے نہ دو اس دلیر کو
کُشتہ کرو ترائی میں حیدرؑ کے شیر کو (جاتا ہے شیر بیشۂ حیدرؑ ...)

نعرہ کیا جری نے کہ ہم رُکنے والے ہیں؟ — یہ دیکھے بھالے سب ہیں جو بھالے نکالے ہیں
ابتر کیا تھا جن کو وہی یہ رسالے ہیں — ثابت ہوا کہ دن ابھی ڈھالوں پہ کالے ہیں
پستی کو ڈھونڈتی ہے بلندی نشانوں کی
شاید ابھی کمی یہ ہے قسمت کمانوں کی

اس وقت سب جہاں مجھے مل کر تو روک لے — فوجیں تو آئیں سامنے لشکر تو روک لے
دیوار تیغ و نیزہ و خنجر تو روک لے — تم کیا ہو مجھ کو سدِّ سکندر تو روک لے
آیا ہوں جاں طلب کئی بچوں کو چھوڑ کر
حائل پہاڑ ہو تو نکل جاؤں توڑ کر

فرما کے یہ فرس کو بڑھایا دلیر نے — دریا لہو کا دم میں بہایا دلیر نے
شیرِ خدا کا زور دکھایا دلیر نے — پٹکا زمیں پر جسے پایا دلیر نے
یوں توڑ ڈالیں نیزوں کی ڈانڈیں مروڑ کے
جس طرح پھینک دے کوئی تنکے کو توڑ کے

ہتھیار پھینک پھینک کے بھاگے شریر سب — چوٹیں پڑیں کہ بھول گئے دار و گیر سب
کٹ کٹ گئے لئے ہوئے چلّوں سے تیر سب — چھپتے تھے سہم سہم کے برنا و پیر سب
تھیں دھجیاں پھریروں کی ٹکڑے اڑی ہوئی
ڈھالوں میں منہ چھپاتی تھیں تیغیں مڑی ہوئی

جس دوش پر تھی مشک اُسی ہاتھ میں علم — سینہ سپر تھی کوندتی تھی برقِ تیغ دم
برسا رہے تھے تیروں کا مینہ بانیٔ ستم — رُکتے نہ تھے مگر کہیں عباسِ ذی حشم
کیا شیر دل سوار تھا کیا راہوار تھا
جب باگ اُٹھائی فوج کے حلقوں سے پار تھا

لشکر یزید کا تھا کہ دریائے بے کنار — پیدل جو گر پڑے تو بڑھے جنگ کو سوار
بھاگے جو وہ تو آئے کنارے پہ نیزہ دار — نیزے قلم کئے تو چلے برچھیوں کے وار
کیونکر بہم یہ سر ہوا اک آفت نصیب سے
بلّے سے تیر چلتے تھے نیزے قریب سے (حبدم حسینؑ لبر شبرؑ....)

تا نصف راہ نہر سے لڑتا گیا دلیر — تودے کہیں سروں کے کہیں تھے تنوں کے ڈھیر
تکتے تھے سوئے خیمۂ شہ منہ کو پھیر پھیر — دم لے لیا کہیں کہیں جھپٹے مثالِ شیر
پھر پھر کے تیغ چلتی تھی اُس دیں پناہ کی
پر ہائے کم نہ ہوتی تھی کثرت سپاہ کی

اک تشنہ کام لاکھوں میں کس کس کو دے جواب — شل ہو گیا تھا بازوئے فرزندِ بوتراب
کہتا تھا ہاتھ اُٹھنے کی مجھ میں نہیں ہے تاب — لڑنے میں فکر تھی کہ نہ ضائع ہو مشکِ آب
پروا نہ تھی جو بازوؤں پر تیر کھاتے تھے
لیکن سپر سے مشکِ سکینہ بچاتے تھے

برچھی سے چھد گیا کبھی دل اور جگر کبھی — اک شیر سے ادھر کبھی جھپٹے اُدھر کبھی
چھاتی تلے تھی مشک کبھی دوش پر کبھی — سینہ کبھی تھا مشک کے اوپر سپر کبھی
رہوار پر سنبھلتے تھے جب جھوم جھوم کے
روتے تھے بازوؤں کو علی چوم چوم کے

تکتے تھے مسکرا کے سوئے آسماں کبھی — ہونٹوں پہ پھیر لیتے تھے سوکھی زباں کبھی
لگتا تھا تن پہ تیر کبھی اور سناں کبھی — جھکتے تھے خود فرس سے کبھی اور نشاں کبھی

گھوڑے کو جب بڑھاتے تھے رانوں میں داب کے
قدموں سے نکلے جاتے تھے حلقے رکاب کے (آمد ہے کربلا کے نیستاں...)

تلوار ہاتھ میں علمِ شاہ دوش پر — ہرنے پہ گاہ مشک رکھی گاہ دوش پر
اک تیغ تیز چل گئی ناگاہ دوش پر — تلوار کیا پہاڑ گرا آہ دوش پر

صدمہ اِدھر تو مشک کا جانِ حزیں پہ تھا
دیکھا جو پھر کے دستِ مبارک زمیں پہ تھا (جب کربلا میں داخلہ...)

اک ہاتھ سے سنبھالے تھے مشکیزہ و علم — بہتا تھا خون ضعف بھی بڑھتا تھا دمبدم
گھوڑے پہ سیدھے ہوتے تھے گاہے تو گاہ خم — فریاد الغیاث ستم پر ہوا ستم

تیغا کسی کا شیر کے شانے پہ پھر پڑا
وہ ہاتھ بھی بدن سے جُدا ہو کے گر پڑا

گو ہاتھ کٹ گئے تھے مگر کچھ نہ تھا ہراس — دانتوں سے جھک کے مشک کو پکڑا دبا دیا
غم تھا کہ گر پڑا علمِ شاہِ حق شناس — یہ رعب تھا کہ ڈر سے نہ آتا تھا کوئی پاس

آنکھیں لہو تھیں رُخ سے جلال آشکار تھا
مشکیزہ تھا کہ شیر کے منہ میں شکار تھا

ٹھکرا کے راہوار کو بڑھتے تھے واں سے جب — چھاتی پہ نیزے رکھ کے اُنھیں روکتے تھے سب
اس پر بھی بڑھ چلا تھا وہ بے دست و تشنہ لب — مارا کسی نے فرق پہ اک گرز بے غضب

صدمے سے زرد چہرۂ پُرنور ہو گیا
ضربت لگی کہ کاسۂ سر چور ہو گیا

ہر چند چھوٹ گیا تھا سرِ دلبرِ علی تسمہ نہ چھوڑا مشک کا دانتوں سے اپنے بھی
اپنا نہ کچھ خیال تھا پیاسوں کی فکر تھی ہرنے پہ سر پٹک دیا جب مشک چھد گئی
آنکھوں سے بہہ کے اشک بصد یاس گر پڑے
پانی گرا تو گھوڑے سے عباسؑ گر پڑے (آمد ہے کربلا کے .....)

شانوں سے سارے جسم کا جب بہہ گیا لہو ریتی پہ تھرتھرا کے جھکے آپ قبلہ رُو
آواز دی کہ آیئے یا شاہِ نیک خو سر تن سے کاٹ لینے کے درپے ہیں کینہ جُو
خوں میں تڑپ تڑپ کے یہ غمخوار رہ نہ جائے
صد حیف یہ ہے کہ حسرتِ دیدار رہ نہ جائے

نکلا حرم سرا سے علمدار کا پسر گورے گلے میں ہنسلیاں تھیں کان میں گہر
چہرے کا رنگ اُڑا ہوا کُرتا عرق میں تر کی عرض شہ سے ننھے سے ہاتھوں کو جوڑ کر
شاید خبر نہیں ہے امامِ غیور کو
آقا پدر پکار رہے ہیں حضور کو

حضرت نے آہ کی کہ لرزنے لگی زمیں ناگاہ واں سے بڑھ کے پکارے کئی لعیں
اب جلد سر کاٹنے کو آئیں امامِ دیں کہہ دے کوئی کہ مر گئے عباسؑ مہ جبیں
بڑھنے دیا نہ گھاٹ سے آگے دلیر کو
کیا گھیر کر کچھار میں مارا ہے شیر کو

سُنتے ہی اِس صدا کے شکستہ ہوئی کمر تڑپے اُٹھے گرے نہ سنبھالا گیا جگر
کانپے جو پاؤں تھام لیا بازوئے پسر چلاتے تھے کہو علی اکبر چلیں کدھر
خورشید کیوں چھپا ہے یہ کیا واردات ہے
کچھ سوجھتا نہیں ہمیں دن ہے کہ رات ہے

عباس کے پسر سے تو کہہ دو کہ گھر میں جائے دیکھو حرم سرا سے سکینہ نکل نہ آئے
فضہؔ ابھی خبر نہ کسی رانڈ کو سُنائے اکبرؔ اُجڑ گیا مرا گھر ہائے ہائے ہائے
پُرسا تو دوں نجف کی طرف منہ کو موڑ دو
سر پیٹتا چلوں گا مرے ہاتھ چھوڑ دو

یہ روزِ قتلِ حمزہؑ و جعفرؑ ہے اے پسر یوم وفاتِ حضرتِ شبّرؑ ہے اے پسر
یہ ماتمِ شہادتِ حیدرؑ ہے اے پسر صبر اب کہاں یہ داغِ برادر ہے اے پسر
میرا الم بتولؑ کی جائی سے پوچھئے
صدمہ جوان بھائی کا بھائی سے پوچھئے (جاتا ہے شیر بیشۂ حیدر...)

دریا پہ سر برہنہ شہِ بحر و بر چلے صدمہ یہ تھا کہ ہاتھوں سے پکڑے کمر چلے
اکبرؔ سنبھالے باپ کو باچشمِ تر چلے یہ بھی چلے اُدھر شہِ والا جدھر چلے
صدمہ ہے ضربِ غم سے دلِ پاش پاش پہ
رونے کو بھائی جاتا ہے بھائی کی لاش پہ

صورت یہ شاہ کی ہے کہ زلفوں پہ خاک ہے آلودۂ غبارِ الم روئے پاک ہے
سوکھے لبوں پہ نالۂ روحی فداک ہے اور تا کمر قبا کا گریبان چاک ہے
دستِ یسار بیٹے کی گردن میں ڈالے ہیں
شہ کو جھکے ہوئے علی اکبرؔ سنبھالے ہیں

جب پاؤں کانپتے تھے تو کہتے تھے رُک کے شاہ طاقت بدن کی لے گئے عباسؑ آہ آہ
دریا نہ اِتنا دور تھا اے میرے رشکِ ماہ رستہ غلط کیا ہے کہ کچھ بڑھ گئی ہے راہ
ہے دُوریاں سے یا مرا بھائی قریب ہے
کہتے ہیں وہ حضورؑ ترائی قریب ہے

القصہ لائے باپ کو اکبر ترائی میں — زخمی ملا وہ شیر دلاور ترائی میں
پائی جو بوئے خونِ برادر ترائی میں — لاشے کے پاس گر پڑے سرور ترائی میں
گذری تھی عمر ہاتھ جسے جوڑتے ہوئے
دیکھا اُسی کو خاک پہ دم توڑتے ہوئے

منہ رکھ کے منہ پہ بھائی کے بھائی نے دی صدا — اے شیر اے دلیر یہ بیکس ترے فدا
کیوں پُتلیاں پھراتے ہو بھائی یہ کیا یہ کیا — عباسؑ میں حسینؑ ہوں دیکھو مجھے ذرا
میرا ابھی حلق خشک ہے خنجر کے واسطے
بھائی کو چھوڑے جاتے ہو دم بھر کے واسطے

ٹھہرو عنانِ توسنِ عمرِ رواں نہ لو — ساتھی تھکا ہوا ہے رہِ کارواں نہ لو
کروٹ کراہ کر مرے آرامِ جاں نہ لو — لگتی ہے چوٹ دل پہ مرے ہچکیاں نہ لو
مر جاؤں گا میں ساتھ اگر چھوٹ جائے گا
بھائی مرا تو رشتۂ جاں ٹوٹ جائے گا

بولے یہ آنکھ کھول کے عباسؑ نامدار — آقا ہزار جانِ گرامی ترے نثار
یہ موت زندگی ہے زہے فخر و افتخار — نکلے جو گل کے سامنے بلبل کی جانِ زار
دیدار دیکھنے میں نہ آتا تو موت تھی
پروانہ شمع کو جو نہ پاتا تو موت تھی

زانوئے پاکِ نورِ خدا اور سرِ حقیر — عالم کا بادشاہ کجا اور کجا فقیر
ذرے کو مہر کر دیا اے آسماں سریر — تکیہ کسی کو بھی یہ ملا ہے دمِ اخیر
پایا یہ اوج ماں کی نہ بابا کی گود میں
معراج مل گئی شہِ والا کی گود میں

رحمت نے رُخ کیا مری جانب حضورؐ آئے — لے کر رسولؐ جام شرابِ طہور آئے

روشن ہو کیوں نہ چشم جو خالق کا نور آئے — ایسا نہ ہو سرور جو بالیں پہ حور آئے

عشاق مر بھی جاتے ہیں زخمی بھی ہوتے ہیں

میں اب تو تندرست ہوں کیوں آپ روتے ہیں

مولا کھڑے ہیں سامنے محبوبِ ذوالجلال — یہ رو رہے ہیں شیرِ الٰہی بصد ملال

استادہ ہیں یہ حضرت شبیرؑ نکو خصال — یہ فاطمہؑ ہیں پہلو میں بکھرائے سر کے بال

تنہا نہیں حضورؐ بھلا کیوں ہراس ہیں

جن کا غلام میں ہوں وہ سب میرے پاس ہیں

شہ نے کہا کہ لینے کو آئے ہیں تم کو سب — عباسؑ چھوڑ جاؤ گے اب ہم کو ہے غضب

سر خاک پر پٹک کے یہ بولا وہ جاں بلب — اے جانِ فاطمہؑ جگرِ سیدِ عرب

کس کس کو روکئے کہ یہ اعدا کے ریلے ہیں

صدمہ بڑا یہی ہے کہ حضرت اکیلے ہیں

راحت کی راہ ہے سفرِ گلشنِ ارم — صدمہ مگر ہے روح پہ اے قبلۂ امم

اب تک تو کب کے مر گئے ہوتے تڑپ کے ہم — اُلفت یہ آپ کی ہے کہ اٹکا ہوا ہے دم

دُنیا سے کوچ کرنے کو جی چاہتا نہیں

اے بھائی جان مرنے کو جی چاہتا نہیں (آمد ہے کربلا۔ نیستاں..)

گھبرا کے نزع میں علی اکبر سے یہ کہا — اے شاہزادۂ دو جہاں میں ترے فدا

میرا تو کوچ ہے طرفِ گلشنِ بقا — فرزندِ فاطمہؑ سے خبردار اک ذرا

گر منع بھی کریں تو اکیلا نہ چھوڑیو

عمّو نثار باپ کو تنہا نہ چھوڑیو

یہ کہہ کے پائے شاہ کی جانب بڑھایا سر — کانپے لہو بھری ہوئی آنکھوں کو کھول کر
ٹپکے مژہ سے خون کے قطرے اِدھر اُدھر — بس یاس سے حسینؑ پہ کی آخری نظر
منکا جری کا ڈھل گیا بھائی کی گود میں
بھائی کا دم نکل گیا بھائی کی گود میں (جاتا ہے شیر بیشۂ حیدر...)

بھائی کے آگے بھائی تڑپ کر جو مر گیا — صدمہ غضب کا سبطِ نبیؐ پر گزر گیا
خنجر الم کا دل سے جگر تک اُتر گیا — چلاتے تھے کہ شیر ہمارا کدھر گیا
لیتے تھے بوسے جھک کے تن پاش پاش کے
اُٹھ اُٹھ کے گرد پھرتے تھے بھائی کی لاش کے

جھک کر پکارتے تھے کہ بھیا صدا سناؤ — سر رکھ لو میرے زانو پہ گردن ذرا اُٹھاؤ
زینب تمہیں بلاتی ہیں خیمے کے در پہ جاؤ — کب سے بلک رہی ہے سکینہؑ کو دیکھ آؤ
باتوں میں پیار کی کہیں تم سے گلہ نہ ہو
دریا پہ سو گئے ہو سکینہ خفا نہ ہو (آمد ہے کربلا کے نیستاں...)

جلدی عبا اُڑھا کے دلاور کی لاش پہ — اکبرؑ نے عرض شاہ سے کی ہاتھ جوڑ کر
خیمے سے نکلی آتی ہیں رانڈیں برہنہ سر — تنہا کھڑا ہے راہ میں عباسؑ کا پسر
آیا وہ گر تو ساتھ سکینہ بھی آئے گی
دیکھیں چچا کی لاش تو جیتی نہ جائے گی

ناچار لاش چھوڑ کے اُٹھے امامِ دیں — مشک و علم کو لے کے چلے اکبرِ حزیں
کوتل تھا ساتھ اسپِ علمدارِ مہ جبیں — باگیں کٹی تھیں تیغوں سے ڈھلکا ہوا تھا زیں
لٹکی ہوئی تھی تیغ و سپر بھی دلیر کی
پُرخوں زرہ سمند پہ رکھی تھی شیر کی

صدمے سے تھی علم کی بھی ٹوٹی ہوئی کمر
چھینٹیں تھیں خوں کی سبز پھریرے پہ سر بسر
پرچم پہ یوں جھکا ہوا پنجہ تھا خوں میں تر
جس طرح پیٹتا ہے کوئی سوگوار سر
پیدا تھی ہر قدم پہ علامت نشان سے
پیٹو کر اُٹھ گیا مرا حامل جہان سے

پہنچے حسین خیمۂ اقدس کے جب قریں
آگے بڑھے جھکا کے علم اکبرِ حزیں
دوڑا تڑپ کے دلبرِ عباسؑ مہ جبیں
چلّایا کیا غضب یہ ہوا اے امامِ دیں
کوتل ہے کیوں فرس مرے بابا کدھر گئے
سر پیٹ کر حسینؑ پکارے کہ مر گئے

پردہ اُلٹ کے خیمے کا فضّہ نے دی صدا
اے پردہ والو ڈیوڑھی سے ہٹ جاؤ اک ذرا
لاتے ہیں گھر میں مشک و علم شاہِ کربلا
مارے گئے جہاد میں عباسؑ باوفا
موت آئی اُن کو پیاسوں کی تقدیر سو گئی
ہے ہے علیؑ کی چھوٹی بہو رانڈ ہو گئی

خیمے میں حشر ہو گیا سنتے ہی یہ خبر
رانڈوں کے دل اُلٹ گئے تھرا گئے جگر
ماتم کی صف پہ بیٹھ گئی کوئی نوحہ گر
غش کھا کے گر پڑی کوئی کھولا کسی نے سر
ہے ہے کا غُل ہوا کہ سکینہ اُچھل پڑی
حجلے سے بال کھولے دُلہن بھی نکل پڑی

اکبر نے آ کے گاڑ دیا صحن میں علم
کھولے سروں کو زیرِ علم آئے سب حرم
حضرت پکارے پیٹ کے زانو بدرد و غم
لو زینبؑ اپنے بھائی کو رو آئے رن میں ہم
جیتے رہے تھے اِس الم و یاس کے لئے
رنڈسالہ لاؤ زوجۂ عباسؑ کے لئے

برپا ہوا یہ حشر کہ ہے ہے علی کا لال
بکھرا دیئے حسینؑ کی بہنوں نے سر کے بال
پیٹی پچھاڑیں کھا کے جو بانوئے خوش خصال
مٹی پہ لوٹنے لگے اطفالِ خورد سال

فق ہو گیا سکینہؑ کا منہ سانس اُلٹ گئی
پھیلا کے ننھے ہاتھ علم سے لپٹ گئی

شور ے دلخراش علیؑ کی بہو کے بین
سکانِ آسمان و زمین کو بھی تھا نہ چین
چادر پڑی تھی منہ پہ کہ بیٹھے سامنے حسینؑ
تھامے تھی ہاتھ خواہرِ سلطانِ مشرقین

ٹکڑے تھے تیغِ غم سے دلِ سوگوار کے
حکم حیا یہ تھا کہ نہ رونا پکار کے

کچھ سوچ کر جو ہٹ گئے واں سے امامِ دیں
اُس وقت ہاتھ اُٹھا کے علم کی بلائیں لیں
منہ کر کے سوئے نہر پکاری وہ دل حزیں
صاحب حسینؑ روتے ہیں تم کو خبر نہیں

جنگل بسا دیا شہِ والا کو چھوڑ کے
صاحب کدھر چلے گئے آقا کو چھوڑ کے

کل تھی سہاگن آج تو میں سوگوار ہوں
بیوہ ہوں جاں بلب ہوں غریب الدیار ہوں
جانِ علیؑ ہیں آپ تو میں جاں نثار ہوں
ہاں ناز ہے تو یہ ہے کہ خدمت گزار ہوں

جنگل میں چھوڑیئے نہ مجھے ہاتھ تھام کے
بیٹے ہیں آپ امام کے بھائی امام کے

ہے ہے علم کے ملنے کی شادی کہوں میں کیا
خضرانؑ کو مل گئے علم سبز کیا ملا
بابر سے پہلے آکے مرے پاس یہ کہا
تھی جس کی آرزو ہمیں عہدہ ہوا عطا

صدقے سے شہ کے جعفرِ طیار ہم ہوئے
صاحب تمہیں خبر ہے علمدار ہم ہوئے

میں نے بلائیں لے کے پس از تہنیت کہا — آقا کو اور تم کو سلامت رکھے خدا
سردار فیض بخش ۔ علمدار باوفا — بولے یہ سب حسینؑ کی ہے شفقت و عطا
کیا کیا نوازشیں ہیں امامِ غیور کی
لے آؤ تم بھی جا کے بلائیں حضور کی

کہتے تھے شب کو بھر کے دمِ سرد صبحدم — تم ہم کو چاہتی ہو تمہیں چاہتے ہیں ہم
سنو سَر خدا جو دے تو نثارِ شہِ اُمم — گر ہے تو بس تمہاری جدائی کا ہے الم
کل ہم ہیں اور خنجر و شمشیر و تیر ہیں
اس کا بھی غم بڑا ہے کہ بچے صغیر ہیں

کیسی یہ غفلت آج ہے اے شیرِ حق کے لال — بچوں کی اب نہ فکر نہ لونڈی کا ہے خیال
بھاتی تھی جس کے بالوں کی بُو آپ کو کمال — اُس نے تمہارے سوگ میں کھولے ہیں سر کے بال
اب وصل کے نہ دن نہ شبیں اشتیاق کی
کیونکر کٹیں گی دشت میں راتیں فراق کی

صاحب تمہیں تو سونے کو ہاتھ آئی خوب جا — دریا کا قرب سرد ترائی خُنک ہوا
میں اور آپ آج کی شب تک نہ تھے جُدا — بستر کو خالی دیکھ کے گزرے گی مجھ پہ کیا
تڑپوں نہ کس طرح کہ نئی واردات ہے
صدقے گئی فراق کی یہ پہلی رات ہے

کیونکر کہوں کہ آپ میں مہرو وفا نہ تھی — میری ہی خاک قابلِ خاکِ شفا نہ تھی
اتنا گلہ ہے بس کہ یہ غفلت روا نہ تھی — کیا پائینتی بھی اک مری تربت کی جا نہ تھی
بے وجہ خیر خواہ سے مُنہ موڑتے نہیں
ساتھی بُرا بھی ہو تو اُسے چھوڑتے نہیں

صاحب تمہیں سکینۂ ناشاد کی قسم صاحب تمہیں مصیبتِ سجاد کی قسم
تم کو حسینِ کشتۂ بیداد کی قسم تم کو ہمارے نالہ و فریاد کی قسم
جب تم نہ ہو تو خاک ہے دُنیائے زشت میں
مجھ کو بھی اپنے پاس بلا لو بہشت میں (جاتا ہے شیر بیشۂ حیدر....)

یہ کہہ کے پیٹنے جو لگی وہ جگر فگار زینب نے شاہِ دیں سے کہا رو کے زار زار
وارث کے غم میں ہوتا ہے یہ حال میں نثار لے جایئے علم کو اب اے شاہِ نامدار
ماتم میں اور کوئی مصیبت گذر نہ جائے
ڈر ہے مجھے کہ زوجۂ عباسؑ مر نہ جائے

زینبؑ سے رو کے کہنے لگے سرورِ زمن لے کر نشاں کو جائے کہاں اب یہ بے وطن
اب تو نہ فوج ہے نہ علمدارِ صف شکن گھر لٹ گیا علم کو بڑھاؤ بس اے بہن
لو یہ نشانِ شہِ دُلدل سوار لو
پٹکا علم سے کھول لو پنجہ اُتار لو

جس دم سنا علم کے بڑھانے کا سب نے نام سر اُٹھ کے پیٹنے لگیں سیدانیاں تمام
رایت لٹا کے خاک پہ کہنے لگے امام بس الوداع اے حرمِ سیدِ انام
پیاسے گلے کو خنجرِ خونخوار چاہیئے
بس اب مجھے علم نہ علمدار چاہیئے (آمد ہے کربلا کے نیستاں....)

جب لشکرِ خدا کا علم سرنگوں ہوا اِک شور تھا کہ خانۂ دیں بے ستوں ہوا
سقائے اہل بیتِ نبی غرقِ خوں ہوا سیدانیوں میں اور تلاطم فزوں ہوا
ڈوبا لہو میں چاند شہِ مشرقین کا
خالی کیا اجل نے بھرا گھر حسینؑ کا

یارب کوئی جہاں میں اسیرِ محن نہ ہو — جنگل میں گھر لُٹے کے کوئی بے وطن نہ ہو
ماں باپ سے جُدا کوئی گُل پیرہن نہ ہو — پھولا پھلا اُجاڑ کسی کا چمن نہ ہو
بھائی بچھڑ چکا ہے شہِ مشرقین سے
اب نوجواں پسر کی ہے رخصت حسینؑ سے

طاقت تھی جس سے شہ کو سفر کر گیا وہ شیر — جس سے مزا حیات کا تھا مر گیا وہ شیر
پیاسا جہان سے لبِ کوثر گیا وہ شیر — سقائی کر کے خون میں خود بھر گیا وہ شیر
خم آگیا کمر میں شہِ خوش خصال کی
تصویر مٹ گئی اسدِ ذوالجلال کی

لشکر میں شادیاں تھیں اُدھر غم تھا اس طرف — ساماں وہاں تھا جشن کا ماتم تھا اس طرف
اُمید اُدھر تھی یاس کا عالم تھا اس طرف — اعدا میں عید تھی تو محرم تھا اس طرف
کمریں کسے ہوئے تھا زمانہ جدال پر
کیا وقت پڑ گیا تھا محمدؐ کے لال پر

مرنا جوان بھائی کا اور اُس پہ یہ ستم — پُرسا نہ دلدہی نہ تشفّی درد و غم
اعدا صفیں جمائے ہوئے جنگ پر بہم — ہنستے تھے سوگواروں کے رونے پہ دم بدم
نرغے میں اُن کے سبطِ رسالت پناہ تھا
مشرب میں جن کے پانی کا دینا گناہ تھا

نہ پاس اُنھیں نبی کا نہ مطلق خدا کا ڈر — قرآں سے بے وقوف حدیثوں سے بے خبر
باتوں میں زور دل میں بدی طینتوں میں شر — بدکار و بدخصال و بداعمال و بدگہر
پیدا تھا کفر، شرم و حیا ناپدید تھی
سادات ذبح ہوتے تھے اور اُن کو عید تھی

کیسے وہ کلمہ گو تھے تعجب کا ہے مقام — کافر بھی لیتے ہیں تو کراہت سے اُن کا نام
اسلام اگر یہی ہے تو اسلام کو سلام — کھل جائے گا کھنچے گی جو کل تیغِ انتقام
کس جا چھپیں گے روزِ عدالت ضرور ہے
ہم دور ہیں نہ وہ نہ قیامت ہی دُور ہے

حضرت علیؑ اکبر کی رخصت، جہاد اور شہادت

اولاد والے دل میں کریں اک ذرا خیال — ہوتی ہے کیسی اُلفتِ فرزندِ خوش جمال
بیٹا وہ نوجواں جسے اٹھارھواں ہے سال — کیا ہوگا نورِ چشمِ رسولِؐ خدا کا حال
ماں باپ کے لئے تو اجل کا پیام ہے
دشمن بھی رونے لگتے ہیں یہ وہ مقام ہے

بھائی وہ مر چکا ہے کہ تھا جس کے دم سے گھر — سیدھی ابھی ہوئی نہیں ٹوٹی ہوئی کمر
اب طالبِ رضائے وغا ہے جواں پسر — نوکوں میں برچھیوں کی ہے شبیرؑ کا جگر
پیری میں اس جواں کو بھی کھوئیں تو کیا کریں
کیوں منصفو جو نہ روئیں تو کیا کریں

بڑھتا ہے ہاتھ جوڑ کے جب شہ کا نورِ عین — خیمے کو تکنے لگتے ہیں مُنہ پھیر کر حسینؑ
فرماتے ہیں کہ سُنتے ہو سیدانیوں کے بین — عباسؑ کے الم میں یہ برپا ہے شور و شین
بھائی جہاں سے جانبِ خُلدِ بریں گئے
پُرسے کو بھی پھوپھی کے تم اب تک نہیں گئے

بیکس پھوپھی کو گھر میں تمہارا ہے انتظار — دھڑکے سے ماں کے دل کو نہیں ایک دم قرار
چھوٹی بہن پکارتی ہے تم کو بار بار — دیکھو آؤ اپنے چاہنے والوں کو میں نثار

ہم کوئی دم میں آب دمِ تیغ پیتے ہیں
یہ چند دم تمہارے بھروسے پہ جیتے ہیں

اصغر کو دیکھو عابدِ مضطر کی لو خبر
سمجھاؤ بیبیوں کو کہ پیٹیں نہ اپنا سر
رانڈوں کے تم پسر ہو یتیموں کے تم پدر
گھر تھامتے ہیں باپ کا ذی مرتبہ پسر
کس کو یہ داغ پیرِ فلک نے دیا نہیں
ہر سر پہ کسی کے باپ ہمیشہ جیا نہیں

تم سے بھی کم تھے عمر میں جب ہم ہوئے یتیم
ماں بھی نہ تھی یہ اور تھی اک آفتِ عظیم
ہم دونوں بھائیوں کے جگر غم سے تھے دونیم
پر ہر بلا میں حافظ و حامی رہا کریم
رانڈوں کو یہ الم ہے کہ منہ موڑے جاتے ہیں
ہم تو جہاں میں تم سا پسر چھوڑے جاتے ہیں

کنبے کی جان باپ کا اقبال گھر کا نور
یوسف جمالؑ صاحبِ توقیر ذی شعور
جرار و بردبار و دلاور سخی غیور
آنکھوں کی روشنی جگر و قلب کا سرور
خرد و کلاں کو اجرِ زیارت حصول ہے
تم ہو تو اہلِ بیت میں گویا رسولؐ ہے

نعمت ہے زیست خلق میں ایسے سعید کی
پیدا ہے نورِ رخ سے ضیا صبحِ عید کی
تھی سب کو آرزو رخِ روشن کی دید کی
تصویر ہو رسولِ خدائے مجید کی
کیونکر خدا نگاہ سے جدا کریں تمہیں
آنکھیں یہ چاہتی ہیں کہ دیکھا کریں تمہیں

راحت کے دن ہیں آمدِ فصلِ شباب ہے
پہلا ابھی کتابِ جوانی کا باب ہے
اٹھارھویں برس کا بھلا کیا حساب ہے
بے حاشیہ ابھی ورقِ آفتاب ہے

نقطے ہیں خال کے خطِ عنبر فشاں نہیں
بابا نثار ہو ابھی پورے جواں نہیں

پھولو پھلو کہ زینتِ باغِ جہاں ہو تم		آخر ہے عمر پیر ہیں ہم - نوجواں ہو تم
شاداں رہے گی روح کہ راحت رساں ہو تم		مرنے کے بعد باپ کا نام ونشاں ہو تم
گر ہم نہیں تو خانۂ زہرا میں تم رہو
اب زندگی یہی ہے کہ دنیا میں تم رہو

اکبر کا رنگ اڑ گیا سنتے ہی یہ کلام		کی عرض ہاتھ جوڑ کے شہ سے کہ یا امام
فرزندِ ارجمند ہیں سجادِ نیک نام		اکبر تو ہے حضور کا ادنیٰ سا اک غلام
اس امر سے فدوی کو کوئی شرمندگی نہیں
آقا کے بعد موت ہے یہ زندگی نہیں

بندے ہزار ہم سے نثارِ سرِ حضور		دنیا ہو اور آپ ہوں اے کبریا کے نور
روشن جو ہے جہان اسی دم کا ہے ظہور		ذرہ ہر اک ہے نورِ قدم سے چراغِ طور
ظلمت نہ دائے خلق شہِ دیں کی ذات ہے
دنیا میں آفتاب نہ ہو جب تو رات ہے

افضل ہے کون سبطِ رسالت مآب سے		دنیا میں ہے تو یہ برکت ہے جناب سے
سرسبز ہے زراعتِ عالم سحاب سے		ذروں کی زندگی ہے فقط آفتاب سے
چھٹ کر پدر سے باپ کے پیارے کہاں رہیں
جب آسماں نہ ہو تو ستارے کہاں رہیں

دم سے حضور کے ہے غلاموں کی ہست و بود		مولا ہیں اس جہاں میں درِ رحمت و درود
اے چشمۂ عطا و کرم بحرِ فیض و جود		دریا اگر نہ ہو تو حبابوں کی کیا نمود

سب خلق شاہِ دیں سے طلبگارِ عون ہے
جب نوح غرقِ خوں ہو تو کشتی کا کون ہے

پھر زیست کیا کرے وہ جو بعد آپ کے جیئے — کھائے غم اور خونِ جگر عمر بھر پیئے
غیروں نے آج پائے مبارک پہ سر دیئے — بچپن سے ہم نے باندھی ہے تلوار کس لیئے
اب پنجتن کا خاتمہ ہے کوئی آن میں
پھر بھی یہ معرکہ کبھی ہو گا جہان میں

سینے میں دل لرزتا ہے جینے کے نام سے — زندہ وہی ہے پہلے مرے جو امام سے
سیراب ہونے دیجیے شہادت کے جام سے — آقا یہ بوجھ اٹھ نہ سکے گا غلام سے
دیکھے گا کون لوٹنے فوجیں جو آئیں گی
خادم سے بیڑیاں کبھی پہنی نہ جائیں گی

عابد خدا کے فضل سے ہیں صابروں میں فرد — مظلوم بردبار غم انگیز اہلِ درد
سہ لیں گے وہ یتیمی و غربت میں گرم و سرد — ہم اور کام کے نہیں لائق بجز نبرد
وہ آلِ مصطفیٰ کا مدار المہام ہو
جو ہو پسر امام کا خود بھی امام ہو

خوں میں نہا کے گر نہ ہوا آج سرخرو — پھر کس کو منہ دکھاؤں گا یا شاہِ نیک خو
چمکا رہے ہیں برچھیاں میداں میں جنگجو — غصے سے جوش کھاتا ہے اب جسم کا لہو
کس سے کہوں اگر نہ کروں عرض آپ سے
بیٹے کی آبرو متعلق ہے باپ سے

دیجے رضائے حرب کہ مرتا ہے اب غلام — خیمے میں چلیئے لے کے مجھے یا شہِ انام
چپ ہو رہیں گی سن کے پھوپھی آپ کے کلام — بن جائے گا زباں کے ہلانے میں میرا کام

مانے گا وہ ادب سے جو صاحبِ اہل ہے
مشکل کشا کے لال کو ہر امر سہل ہے

بولے بہا کے اشک شہنشاہِ نامور — مرنے کی تم کو ماں سے دلائے رضا پدر
سچ ہے بھلا تمہیں مرے دل کی ہے کیا خبر — پوچھو یہ اُس سے جس کا جواں ہو کوئی پسر
اس معرکے سے جو نہیں واقف وہ آپ ہیں
بیٹا ہمارے حق بطرف ہے کہ باپ ہیں (حبیبِ لشکرِ خدا کا علم .....)

دیتا اگر تمہیں کوئی فرزند ذوالجلال — ہوتی پدر کی قدر سمجھتے ہمارا حال
رخصت کا آپ سے یونہی کرتا وہ جب سوال — تب جانتے کہ دیتے اُسے رخصتِ جدال
کیا جانے وہ مزا جسے اس کا ملا نہیں
اچھا سدھارو تم سے ہمیں کچھ گلا نہیں

تسلیم کر کے بولے علی اکبرِ غیور — لاکھوں برس جہاں میں سلامت رہیں حضور
فرمایا شہ نے خیر اجل بھی نہیں ہے دور — برچھی لگا کے دل پہ خوشامد یہ کیا ضرور
تقریر میں پدر کو نہ اب بند کیجئے
خیمے میں جا کے ماں کو رضامند کیجئے

سب جانتے ہیں جو ہے پھوپھی کو تمہاری چاہ — معلوم ہو گا جاؤ گے جب سوئے خیمہ گاہ
باہیں گلے میں ڈالے گی زینب باشک و آہ — قدموں پہ گر کے آپ کے ماں ہو گی سدِّ راہ
یہ مرحلہ بھی کم نہیں زنجیر و طوق سے
دونوں رضا جو دیں تو چلے جاؤ شوق سے

روتے ہوئے چلے علی اکبر سوئے خیام — کانپا یہ دل کہ بیٹھ گئے خاک پر امام
روتا ہوا جو ڈیوڑھی سے آیا وہ نیک نام — دوڑی پسر کو دیکھ کے بانوئے تشنہ کام

دامن سے آکے بالی سکینہ چمٹ گئی
زینب بلائیں لے کے گلے سے لپٹ گئی

ماں گرد پھر کے بولی کہ اے میرے گلعذار — تم صبح سے گئے تھے اب آئے یہ ماں نثار
در پر تڑپ تڑپ کے میں جاتی تھی بار بار — کھولو بس اب کمر کہ مرا دل ہے بے قرار
گرمی یہ اور قحط کئی دن سے آب کا
رُخ تمتما گیا ہے مرے آفتاب کا

تر ہے قبا پسینے میں پنکھا کوئی ہلاؤ — سنولا گئے ہو دھوپ میں واری ہوا میں آؤ
جھاڑوں ردا سے گرد میں زلفوں کی بیٹھ جاؤ — گھٹ جائے گا لہو مرا آنسو نہ تم بہاؤ
صدمہ جو دل پہ ہوا ہے کچھ منہ سے کہتے ہیں
کیا ہے جو اشک نرگسی آنکھوں سے بہتے ہیں

صغرا کی تو وطن سے کچھ آئی نہیں خبر — جلدی کہو کہ منہ سے نکلتا ہے اب جگر
اکبر نے عرض کی کہ ہیں سب خیر سے مگر — لٹتا ہے کوئی آن میں خیر النسا کا گھر
ملتی نہیں رضا ہمیں آنسو بہاتے ہیں
بابا گلا کٹانے کو میداں میں جاتے ہیں

اس وقت کس سے درد دل اپنا کہوں میں آہ — تم بھی ہو سد راہ پھوپھی بھی ہیں سد راہ
چھائی ہے واں گھٹا کی طرح شام کی سپاہ — اماں مدد کرو کہ کمر باندھتے ہیں شاہ
اب زندگی ہے تلخ بہت دق ہیں جان سے
اُلفت نے آپ کی ہمیں کھویا جہان سے

دیتے نہیں رضا جو امامِ فلک اساس — خاطر فقط یہ آپ کی ہے اور پھوپھی کا پاس
اب غیر یاس کوئی نہیں ان کے آس پاس — ناطاقتی ہے ضعف ہے فاقہ ہے اور پیاس

کیونکر لڑیں گے وہ کہ سراپا ضعیف ہیں
پیری میں دل ضعیف ہے اعضا ضعیف ہیں

عباسؑ جب سے مر گئے روتے ہیں دم بہ دم
رُخ زرد ہے، کماں کی طرح ہو گئے ہیں خم
چلّوں میں تیر جوڑے ہیں واں بانیِ ستم
قرباں ہوں کس طرح پسرِ فاطمہؑ پہ ہم
سب روکتے ہیں اِن کی طرف جائیں کس طرح
ماں کو پھوپھی کو بہنوں کو سمجھائیں کس طرح

دیکھی گئی نہ ماں سے یہ بیتابیِ پسر
وارث کی بے کسی پہ لگا کانپنے جگر
ہاتھوں سے دل کو تھام کے بولی وہ نوحہ گر
دولت پہ فاطمہؑ کی تصدق تمام گھر
پہلے نہ کچھ کہا تھا نہ اب روکتی ہوں میں
روتے ہو کس لئے تمہیں کب روکتی ہوں میں

زہراؑ کے لال پر مرے مادر پدر نثار
عابد نثار، اصغرِ تشنہ جگر نثار
جائیں ہزار ہوں تو فدا لاکھ سر نثار
قربان گھر، کنیز تصدق، پسر نثار
گھبرائی گو کہ ہوں، پہ بہو میں علی کی ہوں
مانگو گے جو وہ دوں گی کہ لونڈی سخی کی ہوں

مجھ پر حوالہ کرتے ہیں گر شاہِ خوش خصال
رخصت نہ تم کو دوں یہ بھلا ہے مری مجال
صدقہ انھیں کا ہے کہ ملا تم سا نونہال
رخصت کا صدقے جاؤں پھوپھی سے کرو سوال
ہم سب کنیزیں بنتِ امیرِ عرب کی ہیں
اصغر ہو یا کہ تم وہی مختار سب کی ہیں

کہنے کو یوں ہیں چاہنے والے تمہارے سب
لیکن ہے اُن کے عشق سے نسبت کسی کو کب
دن کو انھوں نے دن کبھی جانا نہ شب کو شب
لیجیے انھیں سے آپ کو جس شے کی ہے طلب

مجھ سے نہ کچھ نہ سیدِ عالی سے پوچھیے
گر پوچھیے تو پالنے والی سے پوچھیے

روتے ہوئے گئے جو علی اکبر پھوپھی کے پاس — دیکھا کہ غش پڑی ہیں زمیں پر وہ حق شناس
زانو پہ سر لئے ہوئے کبرا ہے بے حواس — اس حال میں بھی لب پہ یہی ہیں کلام یاس
اب تاب و طاقتِ جسد و روح و دل گئی
کیوں صاحبو! رضا علی اکبر کو مل گئی

اکبر سے مجھ کو یہ نہ توقع تھی ہے غضب — اتنا نہیں خیال کہ ہے کون جاں بلب
اس گل نے ہائے میری ریاضت بھلا دی سب — نامِ خدا جواں ہوئے کیا ہم سے کام اب
ہیں محو رن کے شوق میں رخصت کے دھیان میں
سچ ہے کسی کا کون ہوا ہے جہان میں

یا بے ہمارے چین نہ آتا تھا کوئی دم — مالک اب اور ہو گئے، کوئی ہوئے نہ ہم
کیا دخل تھا جو ڈیوڑھی سے باہر رکھیں قدم — ہے ہے وہ میرا دردِ مصیبت وہ رنج و غم
جاگی ہوں میں، جو چونک کے راتوں کو رُوئے ہیں
پوچھو تو کس کی چھاتی پہ بچپن سے سوئے ہیں

کنگھی کسی کے ہاتھ کی بھاتی نہ تھی کبھی — بے میرے لیٹے نیند انھیں آتی نہ تھی کبھی
بے اُن کے ماں کی قبر پہ جاتی نہ تھی کبھی — روئیں نہ پھر پہ اُن کو رلاتی نہ تھی کبھی
میرے سوا کسی کو کبھی جانتے نہ تھے
جو تھی سو میں تھی ماں کو تو پہچانتے نہ تھے

ہر چند دونوں تھے مرے فرزند خرد سال — پر ان کے آگے اُن کا مجھے کچھ نہ تھا خیال
راتوں کو جب لپٹتے تھے مجھ سے وہ نونہال — میں کہتی تھی ہٹو علی اکبر ہے میرا لال

وہ دونوں مرنے والے تو پہلو میں ہوتے تھے
پھیلا کے پاؤں یہ مری چھاتی پہ سوتے تھے

چھوٹا تو ضد بھی کرتا تھا راتوں کو بارہا — پر عون کیا عقیل تھا بخشے اُسے خدا
دن رات تھی خوشامدِ ہمشکلِ مصطفےٰ — سینے پہ جب یہ سوئے تو اُس نے یہی کہا
آقا کے نورِ عین ہیں عالی مقام ہیں
اماں یہ شاہزادے ہیں اور ہم غلام ہیں

رہتے تھے پاس باپ کے وہ غیرتِ قمر — اُلفت میں اِن کی مجھ کو کچھ اُن کی نہ تھی خبر
قرآں پڑھنے بیٹھتی تھی جب میں دمِ سحر — صورت پہ تھی انھیں کی تلاوت میں بھی نظر
غافل نہ ان کے پیار سے میں ایک آن تھی
قرآں تو رحل پر تھا حمائل میں جان تھی

میں نے انھیں پہ صدقے کیے اپنے دونوں لال — تسکین تھی کہ باقی ہے اکبر سا نونہال
مانگے تو آ کے مجھ سے بھلا رخصتِ جدال — نکلوں گی ساتھ خیمے سے بکھرا کے سر کے بال
کیا خوب جیتے جی مرے جائیں گے مرنے کو
تلوار باندھ لی ہے ہمیں ذبح کرنے کو

بچپن میں تھا نہ ہم سے زیادہ کسی کا پیار — اب کیا غرض گزر گئی وہ فصل وہ بہار
بھیگیں مسیں نمود ہوا سبزۂ عذار — مالک ہیں خود بھلا مرا اب کیا ہے اختیار
ثابت ہوا اُدھر ہی اُدھر مرنے جائیں گے
میں مر بھی جاؤں گی تو وہ یاں تک نہ آئیں گے

باہر سدھارے یا ابھی ہیں ماں سے کچھ کلام — بھابی نے کیوں لیا تھا ابھی رو کے میرا نام
سینے پہ منہ کو رکھ کے یہ بولا وہ لالہ فام — آنکھیں تو آپ کھولئے حاضر ہے یہ غلام

خادم جدا نہ تھا شہِ گردوں سریر سے
کس جرم پر حضور خفا ہیں حقیر سے

کیا ہے قصور جس پہ یہ غصہ ہے یہ عتاب
کرتا ہوں بات میں کوئی بے مرضیٔ جناب
روتا ہوں اب کہ صبر کی مجھ کو نہیں ہے تاب
شکوہ یہ خاکسار کا اے بنتِ بوتراب
ہر دکھ میں ہر بلا میں مددگار آپ ہیں
پالا ہے مجھ کو مالک و مختار آپ ہیں

پیدا ہوا تو آپ کی صحبت مجھے ملی
کرتی ہے روح شکر وہ راحت مجھے ملی
یوسفؑ کو کب ملی تھی جو دولت مجھے ملی
رکھا عزیز آپ نے عزت مجھے ملی
صدقہ ہے اس قدم کا جو سر تا فلک گیا
کی مہر آفتاب نے ذرہ چمک گیا

مرضی نہ ہو تو رن کو بھی جائے نہ یہ غلام
بندے ہیں ہم اطاعتِ مالک سے ہم کو کام
تکرار کی مجال نہ اصرار کا مقام
مرتے اگر تو اس میں بھی تھا آپ ہی کا نام
روتی ہیں آپ کس لئے اچھا نہ جائیں گے
پر یاد رکھیے منہ نہ کسی کو دکھائیں گے

یہ کہہ کے جھک گیا جو قدم پر وہ ذی وقار
بس ہو گئیں محبتِ قلبی سے بے قرار
پھیلا کے دونوں ہاتھوں کو اُٹھیں بحالِ زار
شکوے کے بدلے منہ سے یہ نکلا کہ میں نثار
اُمڈا یہ دل کہ چشم کے ساغر چھلک پڑے
دیکھا جو آفتاب کو آنسو ٹپک پڑے

لے کر بلائیں بولیں کہ واری خفا نہ ہو
صدقے ہے تم پہ جان ہماری خفا نہ ہو
باتیں تھیں یہ تو پیار کی ساری خفا نہ ہو
روتے ہو کیوں منگا دوں سواری خفا نہ ہو

آئے بلا حسینؑ پہ جو اُس کو رد کرو
اچھا سدھارو دکھ میں پدر کی مدد کرو

اُلفت کے جوش میں تو یہ منہ سے کہا مگر | اُٹھا یہ دل میں درد کہ تھرا گیا جگر
کبریٰ کو رو کے دیکھ کے بولی وہ نوحہ گر | کیا ماجرا ہوا مجھے مطلق نہیں خبر
میں رہ گئی نہ پائی کہ وار اُن کا چل گیا
کیا میں نے کہہ دیا کہ کلیجہ نکل گیا

کیا جا کے اب نہ آئے گا گھر میں یہ نونہال | ہے ہے مری کمائی پہ آجائے گا زوال
جس وقت سے شہید ہوئے دن میں قتل لال | بے ہوش ہوں حواس میں ہے میرے اختلال
ایسا ہے اضطراب کہ کچھ جس کی حد نہیں
جو آپ میں نہ ہو سخن اُس کا سند نہیں

میں ہوش میں نہ تھی یہ قدم پر گرے تھے جب | میں بھی کہوں یہ پاؤں پہ گرنے کا کیا سبب
لو مجھ پہ اب کھلا کہ یہ رخصت کی تھی طلب | اکبر کو میں نے ہاتھ سے کھویا تھا ہے غضب
اصلاً خبر نہیں مرے دلبر نے کیا کہا
میں نے جواب کیا دیا اکبر نے کیا کہا

کیا کہہ دیا تھا مرنے کو جائے یہ گلبدن | راضی ہوئی تھی میں کہ خزاں ہو مرا چمن
بیخود ہوں جب سے دن میں سدھارے شہِ زمن | کہتی ہوں کچھ زباں سے نکلتا ہے کچھ سخن
اتنی خبر نہیں علی اکبر کے پیار میں
قابو میں ہے نہ دل نہ زباں اختیار میں

رخصت کے نام سے مرا پھٹتا ہے اب جگر | ایسا نہ ہو کہ بانوئے بے کس کو ہو خبر
گر سن لیا تو دل میں کہیں گی وہ نوحہ گر | پیارا ہوا نہ بنتِ علی کو مرا پسر

سمجھی تھیں کیا جو دی اُسے رخصت جدال کی
زینبؑ نے ہائے قدر نہ کی میرے لال کی

سچ ہے کہ اُس کی چاہ سے نسبت مجھے کہاں
ہوں لاکھ اُن کی چاہنے والی وہ پھر ہیں ماں
آنکھوں کا نور قلب کی طاقت بدن کی جاں
آنچ آشنا کی ہے وہ قیامت کہ الاماں
کیا سوچتے ہو صاحبو کچھ تم کو خیر ہے
ماں ہے تو ماں ہے خلق میں پھر غیر غیر ہے

جس دم سُنے یہ دُور سے بانو نے سب کلام
آئی قریب حضرتِ زینبؑ وہ نیک نام
کی عرض ہاتھ جوڑ کے اے خواہرِ امام
میں ہوں کنیز آپ کی اور یہ پسر غلام
کس کی مجال ہے جو کہے گا یہ کیا کیا
بی بی نے دی غلام کو رخصت بجا کیا

لونڈی ہے فاطمہؑ کی کنیزوں میں باوفا
ہو قطع وہ زباں جو کرے آپ کا گلا
حضرت کو ان کے سر پہ سلامت رکھے خدا
مالک ہیں آپ اس میں کسی کو ہے دخل کیا
کچھ جائے گفتگو ہے نہ ماں کو نہ باپ کو
ہے دخل اِذن دینے نہ دینے کا آپ کو

غم کھائیے نہ خونِ جگر آپ پیجئے
عابد کو بھیج دیجئے اصغر کو لیجئے
ہے اختیار دیجئے رخصت نہ دیجئے
قربان جاؤں جو ہو مناسب وہ کیجئے
شادی ہو یا کہ غم ہو شریکِ ثواب ہوں
ہر طرح سے میں تابعِ حکمِ جناب ہوں

گھر میرا جب سے لُٹ گیا اس گھر میں آئی ہوں
شکوے کا کوئی حرف کبھی لب پہ لائی ہوں؟
کسریٰ کی گو کہ پوتی ہوں سلطاں کی جائی ہوں
لونڈی ہوں آپ کی علی اکبر کی دائی ہوں

صدقہ یہ آپ کا ہے جو شہ کو عزیز ہوں
بھاوج نہ جانئے مجھے ادنیٰ کنیز ہوں
آپ اس کی ماں ہیں آپ کا فرزند ہے یہ لال — دخل اس معاملہ میں کوئی دے یہ کیا مجال
یہ عازمِ جدال ہے اور آپ کا یہ حال — قدموں کو چھوڑتا نہ کبھی یہ نکو خصال
آپ اس کو چاہتی ہیں یہ صدقے ہے آپ کے
پر کیا کرے کہ آج مصیبت ہے باپ پہ

قسمت بُری ہے اس میں کسی کا قصور کیا — اچھا، رہیں کہ جائیں ہمارا بھی ہے خدا
پروا ہماری ہے نہ خیال ان کو آپ کا — تابع ہم آپ کے بھی ہیں ان پہ بھی ہیں فدا
عابد ہوں یا کہ یہ بھی آنکھوں کے تارے ہیں
پر اب تو یہ نہ آپ کے ہیں نہ ہمارے ہیں (جب غازیانِ فوجِ خدا ....)

یہ ذکر تھا اِدھر کہ پکارے امامِ دیں — لو الوداع اے حرمِ ختمِ مرسلیں
آپہونچے متصل درِ خیمہ کے اہلِ کیں — لے آؤ جا منہ کہاں اے زینبِ حزیں
رخصت کو آئیں جو مرے نازوں کے پالے ہیں
اکبر کو روکیو یہ تمہارے حوالے ہیں

اکبر پھوپھی کو دیکھ کے بولے کہ ہے غضب — لو آفت آئی گھر پہ چلے شاہِ تشنہ لب
دوڑے سروں کو کھولے ہوئے اہلِ بیت سب — بانو گری تڑپ کے قدم پر بصد تعب
بیٹے نے تھامے ہاتھ شہِ کربلائی کے
زینب نے سر جھکا دیا سینہ پہ بھائی کے

شانے پہ منہ کو رکھ کے پکارے شہِ زمن — اماں کی تم سے بُو مجھے آتی ہے اے بہن
بولی یہ ہاتھ جوڑ کے بانوئے خستہ تن — آقا ابھی تو زندہ ہے اکبر سا صف شکن

دکھ درد میں پدر کے پسر کام آتے ہیں
آپ ان کے ہوتے کس لئے میداں میں جاتے ہیں

شہ نے کہا نہیں مجھے اس کا نہیں خیال ۔ ہے تم کو صابروں کی طرح صبر میں کمال
اپنے چمن کو دیکھ کے ہوتے ہیں سب نہال ۔ خود چاہتا ہوں میں کہ یہ گُل ہو نہ پائمال
شادی کے دن ہیں آس غریب الوطن کی ہے
صدمہ مجھے یہ ہے کہ ریاضت بہن کی ہے

بولی وہ عندلیب چمن پرورِ بتولؑ ۔ طرہ وہی ہے سب پہ میسر جسے جو پھول
اے نخلِ باغِ فضل و گلِ گلشنِ رسولؐ ۔ داغِ گلِ ریاضِ تمنا یہ دل قبول
شادی سدا نہیں ہے چمن روزگار میں
رویا خزاں میں وہ جو ہنسا ہے بہار میں

کیجے کنیز کی نہ ریاضت کا کچھ خیال ۔ صدقے گلِ ریاضِ نبیؐ پر ہزار لال
بھائی یہ آبنی تو بھتیجے کا کیا ملال ۔ ان کو بھی صدقے ہونے کی ہے آرزو کمال
ہاں دل تو چاہتا ہے کہ دم بھر جدا نہ ہوں
کام آئیں غیر جب تو یہ کیونکر فدا نہ ہوں

گر کر قدم پہ شہ کے یہ بولا وہ نوجواں ۔ بس اب رضا جہاد کی دیں قبلۂ زماں
صدمہ ہوا پھوپھی کے جگر پر کہ لا اماں ۔ کانپے جو پاؤں گرنے لگی تھرتھرا کے ماں
خوں گھٹ گیا امامِ زماں زرد ہو گئے
اچھا کہا مگر ہمہ تن درد ہو گئے

اکبر پھرے جو گرد قدم سے اٹھا کے سر ۔ بولے گلے لگا کے شہنشاہِ بحر و بر
بابا کی جان اے سببِ قوتِ جگر ۔ کیا اپنا زور خیر جہاں سے کرو سفر

بس قطع ہو گئی جو توقع تھی آپ سے
اٹھارھویں برس میں بچھڑتے ہو باپ سے
غل پڑ گیا کہ خلق سے اکبر کا کوچ ہے   لٹتا ہے گھر شبیہِ پیمبر کا کوچ ہے
لو روشنی چلی مہِ انور کا کوچ ہے   گلزارِ مصطفیٰ کے گلِ تر کا کوچ ہے
اس کربلا میں کون سے کرب و بلا نہیں
کٹتا ہے وہ نشاں جو پھولا پھلا نہیں

حلقے سے بیبیوں کے جو نکلا وہ آفتاب   ہمراہ تھے پسر کے امامِ فلک جناب
چڑھنے لگا زیں پہ تو دل کو رہی نہ تاب   گھبرا کے شہ نے ہاتھ بڑھایا سوئے رکاب
تڑپا جو دل تو ہاتھوں کو حضرت کے تھام کے
سر رکھ دیا پسر نے قدم پہ امام کے

تھرا کے عرض کی خلفِ مرتضیٰ ہیں آپ   کعبہ ہیں آپ یا شہِ دیں رہنما ہیں آپ
شہ نے کہا مسافرِ ملکِ بقا ہیں آپ   ہم صورتِ جنابِ رسولِ خدا ہیں آپ
الفت نہیں یہ پاسِ رسالت مآب ہے
ایسے سعید لال کی خدمت ثواب ہے

صدقے میں اس لحاظ کے اے رتبہ داں مرے   عاشق مرے شفیق مرے مہرباں مرے
مہرو مرے، حسیں مرے شیرِ ژیاں مرے   پیری میں باپ کیا کرے اے نوجواں مرے
طاقت تھی جس سے دل کو وہ دولت بچھڑ گئی
میں تو یہ جانتا ہوں کہ دنیا اجڑ گئی

آتے ہیں ہم بھی خیر سدھارو سفر کرو   اچھا بساؤ دشت کو ویران گھر کرو
تیغوں میں آفتاب سا سینہ سپر کرو   پھر دیکھ لے یہ باپ ذرا منہ ادھر کرو

اک جا رہے پہ غنچۂ خاطر کھلا نہیں
مدت گزر گئی کہ گلے سے ملے نہیں

یہ کہہ کے خود سوار کیا نورِ عین کو
کس صبر سے ادا کیا خالق کے دَین کو
روتا اُس آفتاب نے چھوڑا حسینؑ کو
روشن ضیائے رُخ نے کیا مشرقین کو

قدسی درود پڑھتے تھے چہرے کے نور پر
گھوڑے پہ آپ تھے کہ تجلی تھی طور پر (حبیبِ لشکرِ خدا کا علم.....)

حضرت تو یاں زمیں پہ گرے تھام کر جگر
جاسوس نے یہ لشکرِ اعدا کو دی خبر
آتا ہے اک جوانِ حسیں غیرتِ قمر
چہرے پہ جس کے نورِ محمدؐ ہے جلوہ گر

شان و شکوہ سب اسدِ کبریا کی ہے
کہتے ہیں سب بشر نہیں قدرت خدا کی ہے

ہے دھوم ذرہ ذرہ میں اُس آفتاب کی
خوشبو ہے زلف و جسم میں مشک و گلاب کی
سر تا قدم ہے شان رسالت مآب کی
تصویر ہے رسولِ خدا کے شباب کی

گھوڑے کے گرد جن و ملک کا ہجوم ہے
صلوا علی النبیؐ کی بیاباں میں دھوم ہے

روشن کیا ہے روئے منور نے راہ کو
رُخ پر نہیں ٹھہرنے کا یارا نگاہ کو
حیراں ہے عقل دیکھ کے زلفِ سیاہ کو
آغوش میں لئے ہے شبِ قدر ماہ کو

چہرے کے نور سے شبِ مہتاب ماند ہے
خالق گواہ ہے کہ اندھیرے کا چاند ہے

یہ ذکر تھا کہ نورِ خدا جلوہ گر ہوا
گویا رسولِ پاک کا رن میں گزر ہوا
چلائے اہلِ شام کہ طالع قمر ہوا
ہنگام ظہر تھا پہ گمانِ سحر ہوا

جلوہ دکھایا برقِ تجلّیِ طور نے
خورشید کو چھپا دیا چہرے کے نُور نے (جب زبانِ نوحِ خدا...)

پھیلی ہوئی تھی دشت میں زلفِ رسا کی بُو — کچھ بُو تھی، گیسوؤں کی تو کچھ کربلا کی بُو
غل تھا یہ بُو ہے سلسلۂ مصطفیٰ کی بُو — مٹی ہے اس کے سامنے مشکِ خطا کی بُو
حلقے نہیں یہ گیسوئے عنبر سرشت کے
دیکھو کھلے ہوئے ہیں دریچے بہشت کے

صدقے ہے عودِ عنبرِ سارا نثار ہے — جنگل ہے عطر بیز ہوا مشکبار ہے
حلقہ ہے جو وہ نافۂ مشکِ تتار ہے — سُنبل کا اس کے سامنے کیا اقتدار ہے
ہمسر نہیں جو گیسوؤں کے پیچ و تاب سے
مخفی ہے آج تک شبِ قدر اس حجاب سے

پیدا ہے زلف و روئے منوّر سے شانِ رب — نکلا ہے آفتاب میانِ سوادِ شب
یہ لطف روزِ عید و شبِ قدر میں ہے کب — ہے دو طرف تو چین و خطا بیچ میں حلب
رستہ نہ بھول جائے مسافر ہجوم میں
اک شب کا فاصلہ ہے فقط شام و روم میں

وہ خود فرقِ پاک پہ وہ چاندسی جبیں — پرتو سے جس کے غیرتِ مہتاب سب زمیں
قرآں کی لوح۔ مطلعِ نو۔ آفتابِ دیں — آئینۂ حلب، یدِ بیضا، مہِ مبیں
اس کو جو اس جبیں کے برابر نہ دیکھتا
پھر اپنے آئینہ کو سکندر نہ دیکھتا

ابرو ہے یا کھنچی ہوئی شمشیرِ تیز دم — صانع نے ایک لوح پہ رکھے ہیں دو قلم
پایا بھلا کمانِ کیانی نے کب یہ خم — کیا متصل ہے گوشے سے گوشہ زہے حشم

مدت کھنچے تو پھر کشش ان کی بیاں نہ ہو
قرباں ہو لاکھ بار تو خاطر نشاں نہ ہو

خمدار وہ بھویں وہ جبینِ قمر مثال　　تابندہ ایک چاند کے نیچے ہیں دو ہلال
مطلع ہے صاف، غور سے بینا کریں خیال　　نقطہ ہے نونِ حسن کا ابرو پہ ہے جو خال
خوبی میں یوں تو یہ ہمہ تن لاجواب ہے
دیوانِ حسن میں یہی بیت انتخاب ہے

ہے آسمانِ حسن و شرف یہ فلک جناب　　ابرو ہیں دو ہلال تو پیشانی آفتاب
منظور شمسی و قمری کا ہو گر حساب　　ہاں دیکھ لیں رُخِ خلفِ ابن بوتراب
باریک بیں سمجھ گئے مطلب انیس کا
اُنتیس ۲۹ کا وہ چاند ہے یہ چاند تیس ۳۰ کا

مانندِ شانہ گر ہمہ تن ہو کوئی زباں　　تو بھی مژہ کا وصف سرِ مو نہ ہو بیاں
قربانِ حسنِ صنعتِ خلاقِ انس و جاں　　پردہ ہے بہرِ چشم کبھی گاہ سائباں
موئے نگینِ دیدۂ شیرِ نجف یہ ہے
آنکھوں پہ اس کو رکھتے ہیں مردم شرف یہ ہے

آنکھیں وہ نرگسی جنھیں دیکھے سے ہو سرور　　روشن میانِ کعبہ ہیں یا دو چراغِ طور
یا صاف دو ستاروں کا ہے ایک جا ظہور　　کوثر سے یا بھرے ہوئے ہیں ساغرِ بلور
حق بیں ہیں حق شناس ہیں یزداں پرست ہیں
ہشیار کیوں نہ ہوں مئے عرفاں سے مست ہیں

جاگے ہیں رات کے تو نقاہت ہے آشکار　　ڈورے جو سرخ ہیں تو یہ ہے نیند کا خمار
مستانہ ہے یہ طور کہ جھکتے ہیں بار بار　　آنسو ہیں یہ، صدف میں ہیں یا دُرِ شاہوار

روئے ہیں فرقتِ شہِ عالی جناب میں
نرگس کے پھول تیر رہے ہیں گلاب میں

رخسار کو قمر جو کہوں اُس میں داغ ہے
خورشید ہے تو کیا ہے، وہ دن کا چراغ ہے
ذرّوں کو سر چڑھائے یہ کس کا دماغ ہے
وہ گل ہیں جن کے ذکر سے دل باغ باغ ہے
دنیا میں کوئی شے نہیں اس آب و تاب کی
رنگت ہے سیوتی کی تو خوشبو گلاب کی

گُل سرخ زرد ہوا [illegible] کے سامنے
مخفی چمن کا روئے نکو ان کے سامنے
بے رنگ ہے گلاب کی بو ان کے سامنے
باغِ بہشت، ساختہ رو ان کے سامنے
خوشبو سے عطر بیز ہیں پردے دماغ کے
تازہ یہ دونوں پھول ہیں زہرا کے باغ کے

اعجاز دونوں ہاتھوں میں مشکل کشا کا ہے
زور ان کلائیوں میں شہِ لافتا کا ہے
گھر بازوؤں میں قوتِ خیرالوریٰ کا ہے
سینہ نہ جانیو یہ خزانہ خدا کا ہے
کیوں شور ہو نہ ان کے قدم کے ثبات کا
جس سے تھما ہوا ہے سفینہ نجات کا

پڑتا ہے ماہِ رخ کا جو پرتو ادھر اُدھر
پھرتی ہے چاندنی کی طرح ضَو اِدھر اُدھر
گرتے ہیں کانپ کانپ کے سو سَو اِدھر اُدھر
لشکر میں بے وغا ہے رواروِ اِدھر اُدھر
غل ہے عمر کا سر ابھی لائیں جو زد رہو
اس کو نگاہ بد سے جو دیکھیں تو کور ہو

[illegible] ہے لشکر نہیں
چہرے پہ ضو یہ ہے کہ مجالِ نظر نہیں
[illegible] کی خبر نہیں
پھر کون ہے پیمبرِ برحق اگر نہیں

وقتِ ادب ہے ہاتھ سے تیغ و تبر رکھو
آئے رسولؐ دوڑ کے قدموں پہ سر رکھو

نکلا لگا کے چیتر زری ابنِ سعدِ شوم　　بولا یہ کیا ہراس ہے شیرو یہ کیا ہے دھوم
تنہا وہ اک جواں، یہ ادھر فوج کا ہجوم　　کھوتے ہو آبروئے رئیسانِ شام و روم
پیارا یہی پسر ہے شہِ مشرقین کا
خوش ہو کہ خاتمہ ہوا فوجِ حسینؑ کا

تلواریں لو نیاموں سے جلدی پرے جماؤ　　نیزے ہلا ہلا کے سوارو ادھر کو آؤ
ہاں اے کماں کشو قدر اندازیاں دکھاؤ　　فرزندِ فاطمہؑ کے پسر کا لہو بہاؤ
گر نورِ احمدی کی جہاں میں ضیا نہ ہو
انعام پھر وہ دوں جو کسی نے دیا نہ ہو

لالچ میں آئے سُن کے یہ باتیں وہ زر پرست　　سمجھے کہ اس طرف ہے ظفر اُس طرف شکست
دریا پہ کچھ سوا ہوا پہلے سے بندوبست　　جھومے یلانِ فوجِ ستم مثلِ پیلِ مست
جنگل تھا سب سیاہ، ہجومِ سپاہ سے
کوسوں چھپی ہوئی تھی ترائی نگاہ سے

اس طرح بڑھ کے ہٹتے تھے وہ بانیٔ حسد　　اٹھتا ہے جس طرح کہ سمندر سے جزر و مد
پیاسے پہ آئے تیر اُدھر سے جو لاتعد　　قبضے پہ ہاتھ رکھ کے کہا یا علیؑ مدد
دیکھا نگاہِ قہر سے ہر نابکار کو
گویا خدا کا شیر بڑھا کارزار کو

اللہ رے نہیبِ رجز خوانیٔ ہزبر　　جھنجھلا کے گونجتا ہے نیستاں میں جیسے ببر
چھائی ہوئی تھی فوجِ ضلالت مثالِ ابر　　جو منچلے تھے فوج میں بڑھتا تھا اُن پہ جبر

غل تھا کہ سب علیؑ کا جلال آشکار ہے
فقرہ ہر اک رجز کا نہیں ذوالفقار ہے

نعرہ کیا جو شبلِ علیؑ آسماں ہلے
تھرائی یوں زمیں کہ کڑک کر مکاں ہلے
سینوں میں دل ہلے تو صفوں میں نشاں ہلے
کیا منہ کسی کا تھا کہ دہن میں زباں ہلے
گردن نہ اُن کی اُٹھتی تھی جو سربلند تھے
اللہ رے رعب نطق فصیحوں کے بند تھے

بعد از ستائشِ اب و جد شیرِ نر بڑھا
ہٹتی ہوئی گھٹا کی طرف خود قمر بڑھا
لاکھوں تھے پر نہ ایک اُدھر سے اِدھر بڑھا
جرار تیغ تولے ہوئے بے سپر بڑھا
یوں خندہ زن گیا وہ جری رزم گاہ میں
جاتا ہے جس طرح کوئی اپنی سپاہ میں

نیزوں سے روکنے لگے ڈر ڈر کے سب سوار
صفدر نے بڑھ کے میاں سے لی تیغِ آبدار
سب کی نظر میں کوند گئی برقِ ذوالفقار
ٹوٹے علم، گرے جو الف ہو کے راہوار
غل تھا کہ سربلند ہے جو وہ بھی پست ہے
اکبرؑ نے دی صدا یہ نشانِ شکست ہے

فرما کے یہ کمر میں رکھی اسپ کی لجام
پھرنے لگا نظر کے اشارے پہ خوش خرام
سرعت وہ رخش کی وہ درخشانی حسام
اک برق کوندتی تھی میانِ سپاہِ شام
دُلدُل کی چال جو وہ چلن بادپا کا تھا
بجلی کی تھی جو تیغ تو گھوڑا ہوا کا تھا

کہنی تک آپ نے جو الٹ لی تھی آستیں
اک زلزلہ تھا کانپتی تھی دشت کی زمیں
روکے تھے منہ پہ خوف سے ڈھالوں کو اہلِ کیں
ہنس ہنس کے دیکھتے تھے علی اکبرِ حسیں

افزوں تھی اُنگلیوں کی ضیا شمع طور سے
جنگل میں روشنی تھی کلائی کے نور سے
ناگہ چلی میانِ دو صف تیغِ شعلہ ریز　　دم بھر میں گرم ہو گیا ہنگامۂ ستیز
آئی چمک چمک کے سروں پر جو تیغ تیز　　ان میں سے ایک کو نہ ملی مہلتِ گریز
سالم بچے نخلِ قد پہ نشانِ ثمر نہ تھا
دونوں صفوں میں ایک کی گردن پہ سر نہ تھا
بڑھتے تھے یوں کہ شیر جھپٹتا ہے جس طرح　　پھٹتے تھے دل کہ ابر سمٹتا ہے جس طرح
ہاتھ اُڑتے تھے شجر کوئی چھٹتا ہے جس طرح　　یا نرم خامہ تیغ سے کٹتا ہے جس طرح
جواد بھی دوچار ہوا صاف چار تھا
فولاد موم، جسم سکیلہ[1] خیار تھا
تھی استخوانِ شانۂ سپر اُس کے سامنے　　دامِ زرہ تھا سنبلِ تر اُس کے سامنے
سو وار سب تھے کاسۂ سر اُس کے سامنے　　ڈھیلی گرہ تھا بندِ کمر اُس کے سامنے
آفت کا کاٹ قہر کا خم منہ بلا کا تھا
سب رنگ ڈھنگ ضربتِ مشکل کشا کا تھا
آئی جو سن سے سینہ کی جانب اُڑا کے سر　　دھڑ سے گرا سمند کی ٹاپوں پہ آ کے سر
مرکب نے کی نظر سوئے راکب ہلا کے سر　　نکلی وہ تیغ تیز بغل سے جھکا کے سر
ظالم نئی طرح سوئے دوزخ روانہ تھا
سر تھا نہ صدر تھا نہ کمر تھی نہ شانہ تھا
برسا رہی تھی دشت میں وہ شعلہ رو لہو　　حیدر کا لال بیچ میں تھا چار سو لہو
تا سینہ اُس طرف تو اِدھر تا گلو لہو　　کوسوں تھا سرزمینِ عرب میں لہو لہو

[1] لوہے کی ایک قسم

بہتا تھا خوں زمیں پہ جو اہلِ خلاف کا
فرطِ خوشی سے سُرخ تھا چہرہ مصاف کا (جب لشکرِ خدا کا علم ...)

ٹکڑے پڑے تھے خاک پہ بھالے اِدھر اُدھر — چھپتے تھے ڈر کے برچھیوں والے اِدھر اُدھر
پیشِ نظر تھے خون کے تھالے اِدھر اُدھر — ابتر تھے دشتِ کیں میں رسالے اِدھر اُدھر
ملتا تھا فصل کا نہ ٹھکانا نہ باب کا
شیرازہ کھُل گیا تھا ستم کی کتاب کا

بڑھ کر کسی نے وار جو روکا سپر کٹی — چار آئینہ کٹا زرہِ خیرہ سر کٹی
نیزے کی ہر گرہ صفتِ نیشکر کٹی — سینہ کٹا، جگر ہوا زخمی، کمر کٹی
رہوار بھی دو نیم میانِ مصاف تھا
اِن سب کے بعد منہ کو جو دیکھا تو صاف تھا

وہ گھاٹ باڑھ اور وہ اس کی چمک دمک — کانپی کبھی زمیں کبھی تھرا گئے فلک
شعلہ میں یہ چمک تھی نہ بجلی میں یہ لپک — ہر ضرب میں سما سے تلاطم تھا تا سمک
کونین میں حواس بجا تھے نہ ایک کے
گاوِ زمیں سمٹتی تھی گھٹنوں کو ٹیک کے

سیدھی چلی وہ جب صفِ دشمن اُلٹ گئی — باقی تھی جتنی عمر تہِ تیغ کٹ گئی
آ کر زمیں پہ جب سوئے گردوں پلٹ گئی — بجلی سے رعد، رعد سے بجلی لپٹ گئی
گرتے تھے جن زمین پہ منہ ڈھانپ ڈھانپ کے
ہٹتے تھے جبرئیلِ امیں کانپ کانپ کے

ملتا نہ تھا صفوں میں علم کا نشاں کہیں — چلّے کہیں تھے شست کہیں اور کماں کہیں
نیزے کہیں تھے ڈانڈ کہیں اور سناں کہیں — جودھر کہیں، کمند کہیں، برچھیاں کہیں

اک اک سیاہ رُو کا جگر داغ داغ تھا
جنگل تمام ڈھالوں کے پھولوں سے باغ تھا

چمکی گری اُٹھی اِدھر آئی اُدھر گئی — خالی کئے پرے تو صفیں خوں میں بھر گئی
کاٹے کبھی قدم کبھی بالائے سر گئی — ندی غضب کی تھی کہ چڑھی اور اُتر گئی

اک شور تھا یہ کیا ہے جو قہرِ صمد نہیں
ایسا تو رودِ نیل میں بھی جزر و مد نہیں

سر خود سروں کے چنبرِ گردن سے اُڑ گئے — ہاتھ آستیں سے اُڑ گئے سر تن سے اُڑ گئے
ڈر ڈر کے سب پرند نشیمن سے اُڑ گئے — پائی جو راہ طائرِ جاں تن سے اُڑ گئے

تھے قتلِ عام پر علی اکبر تُلے ہوئے
رستے تھے بند زخموں کے کوچے کھُلے ہوئے

اللہ رے دو آبۂ تیغِ دو دم کا کاٹ — آفت تھی جس کی باڑھ قیامت تھا جس کا گھاٹ
مقتل سے تا بہ نہر تھا دریائے خوں کا پاٹ — ہر دم تھی اُس کو تازہ لہو چاٹنے کی چاٹ

سختی کو جوڑ بند کے کب مانتی تھی وہ
ہر استخواں کو مغزِ قلم جانتی تھی وہ

آئی جدھر پلٹ کے صفوں کو بچھا گئی — تن سے اُڑا دیا وہی سر جس کو پا گئی
ہر اک کڑی کو نرم سمجھ کر چبا گئی — فولاد کی زرہ کو اشارے میں کھا گئی

چار آئینہ کا کاٹ بھی اُس پر حوالہ تھا
ذکر اُس کا کیا ہے خود تو منہ کا نوالہ تھا

تیغوں کو ڈر کے عربدہ جُو پھینکنے لگے — مغفر سروں کے مثلِ سبُو پھینکنے لگے
حلقے کماں کے سب لبِ جُو پھینکنے لگے — تنکا سمجھ کے تیر عدو پھینکنے لگے

ترکش بھی اہلِ ظلم کے آفت رسیدہ تھے
چلّے بھی کشمکش میں کماں سے کشیدہ تھے

کرتے تھے فسخ جنگ کو جو ایک آن میں
رعشہ تھا اُن کے ہاتھوں میں لکنت زبان میں
اُلجھاتے تھے کمند کمینے کمان میں
ترکش میں تیغیں رکھتے تھے نیزوں کو میان میں
تلوار رکھ کے ہاتھ سے منہ ڈھانپ لیتے تھے
آتی تھی تیغ جب تو سپر پھینک دیتے تھے

بڑھتے تھے جو پرے سے بڑے بول بول کے
پہلے اُنھیں کو مار لیا رول رول کے
حملہ کیا جو تیغِ دو دم تول تول کے
ہتھیار سب نے پھینک دئے کھول کھول کے
اس شان سے کبھی نہ عجم نہ عرب لڑے
دو دن کی پیاس میں علی اکبر غضب لڑے

وہ حرب وہ شکوہ وہ شانِ پیمبری
نعرے وہ زور شور کے وہ ضربِ حیدری
وہ تیغِ خونچکاں وہ جلالِ غضنفری
راکب جو رشکِ حور تو رہوار بھی پری
چالاک آہوانِ ختن اس قدر نہ تھے
اُڑ جاتا تھا ہما کی طرح اور پر نہ تھے

باریک جلد وہ کہ نظر آئے تن کا خوں
کنڈے کو دیکھ کر مہِ نو ہوئے سرنگوں
رفتار میں وہ سحر کہ پریوں کو ہو جنوں
غنچے بھی کچھ بڑے ہیں کنوتی کو کیا کہوں
قرباں ہزار جاں فرسِ بے نظیر پہ
سوفار دو چڑھے ہوئے ہیں ایک تیر

وہ جست و خیز و سرعت و چالاکیٔ سمند
سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب اس کے جوڑ بند
سُم قرصِ ماہتاب سے روشن ہزار چند
نازک مزاج و شوخ و سیہ چشم و سربلند

گر بل گئی ہوا سے ذرا باگ اُڑ گیا
پُتلی سوار کی نہ پھری تھی کہ مڑ گیا
آہو کی جست شیر کی آمد پری کی چال — کبکِ دری خجل، دلِ طاؤس پائمال
سبزہ سبک روی میں قدم کے تلے نہال — اک دو قدم میں بھول گئے چوکڑی غزال
جو آ گیا قدم کے تلے گرد برد تھا
چھل بل غضب کی تھی کہ چھلاوہ بھی گرد تھا

بجلی کبھی بنا کبھی رہوار بن گیا — آیا عرق تو ابرِ گہربار بن گیا
گہ قطبِ گاہ گنبدِ دوّار بن گیا — نقطہ کبھی بنا کبھی پرکار بن گیا
حیران تھے اُس کی گشت پہ لوگ اُس ہجوم کے
تھوڑی سی جا میں پھرتا تھا کیا جھوم جھوم کے (کیا غازیانِ فوجِ خدا.....)

صرصر سے تند، بُو سے سبک رَو، ہوا سے تیز — چالاک فہم و فکر سے، ذہنِ رسا سے تیز
طاؤس و کبک و نسر و عقاب و ہما سے تیز — جانے میں اُڑ کے ہُدہُدِ شہرِ سبا سے تیز
ذی جاہ تھا سعید تھا فیروز بخت تھا
رہوار کیا ہوا پہ سلیماں کا تخت تھا

سمٹا، جما، اُڑا، اِدھر آیا اُدھر گیا — چمکا، پھرا، جمال دکھایا، ٹھہر گیا
تیروں سے اُڑ کے برچھیوں میں بے خطر گیا — برہم کیا صفوں کو پروں سے گذر گیا
گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اُس کی فگار تھا
ضربت تھی نعل کی کہ سروہی کا وار تھا (جب بادبانِ کشتیٔ.....)

تھا اُس گروہ میں یہ تلاطم یہ انتشار — ناگہ اُٹھا جو شام کی جانب سے اک غبار
بولا یہ فوج سے عمرِ سعدِ نابکار — بھیجی کمک یزید نے لو شکرِ کردگار

یہ اکبرِ جری کی اجل کا بہانہ ہے
آیا وہ پہلواں جو وحیدِ زمانہ ہے

یہ سُن کے فوج سب متوجہ ہوئی اُدھر　　دیکھا کہ اک جواں ہے فرس پر بہ کرّ و فر
نیزے پہ آگے آگے تو ہیں رہزنوں کے سر　　پیچھے ہیں دو ہزار جوانانِ پُرجگر
شورش مزاج میں تو ستم آب و گِل میں تھا
نہ آنکھ میں حیا تھی نہ رحم اُس کے دل میں تھا

وہ خود جس کو دیکھ کے مرحب ہو سرنگوں　　کیفِ شرابِ غیظ سے آنکھیں دو جامِ خوں
قتّال و بدمزاج و مہیب و سیہ دروں　　یکتاش و خیلتاش سے بھی توش میں فزوں
تیغ و سناں میں رشکِ زریان و گیو تھا
کہنے کو آدمی پہ حقیقت میں دیو تھا

بعد از سلام بڑھ کے عمر نے کیا بیاں　　آپ آئے کیا کہ آ گئی مرتے ہوؤں میں جاں
نیزہ زمیں پہ گاڑ کے بولا وہ پہلواں　　سرگرمِ کارزار ہے یہ کون سا جواں
عباسؑ ہے کہ فاطمہؑ کا نورِ عین ہے
کی عرض اُس شقی نے کہ ابن الحسین ہے

کاٹے ہیں جب سے دستِ علمدارِ نامور　　سرگرمِ کارزار ہے یہ شاہ کا پسر
پوچھا شقی نے ہوئے گا سِن اس کا کس قدر　　اُس نے کہا جواں نہیں پورا یہ پُرجگر
اٹھارھواں یہ سال ہے سِن کے حساب میں
سبزہ ابھی نمود ہے باغِ شباب میں

بولا شقی کہ فوج کا لڑکے سے ہے یہ حال　　ٹوٹے ہیں مورچے صفِ لشکر ہے پائمال
تب شمر نے کہا کہ یہ ہیں شیرِ حق کے لال　　طفل و جوان و پیر ہیں اس گھر کے بے مثال

؎ صرف بیت بدل کر اس مرثیہ کی لگا دی ہے جس کا مطلع ہے ع جب بادبانِ کشتیِ شاہِ اُمم گرا۔

سر بر ہو کون قہرِ خدا ہے وغا نہیں
اس پر کہ تین روز سے پانی ملا نہیں

ناری کے آگ لگ گئی سُن کر علی کا نام
بولا بگڑ کے وہ کہ مرے منہ پہ یہ کلام
پھر کیا اگر علیؑ کا خلف ہے یہ تشنہ کام
کرتی ہے شق پہاڑ کا سینہ مری حسام
پیدا کیا ہے نام ہزاروں کو مار کے
اُتروں گا اب فرس سے سر اس کا اُتار کے

یہ کہہ کے پھر کیا کمرِ آہنی کو چُست
آلاتِ حرب تن پہ کئے سر بسر دُرست
سارے قویٰ قوی تھے مگر عقل تھی سُست
سر میں وہی غرور وہی غرۂ نخست
کوڑا کیا فرس کی جو باگ اُس نے پھیر کے
ہر صف میں غل ہوا کہ چلا منہ میں شیر کے

آیا اُڑا کے رخش وہ جس دم قریبِ زد
ہمشکلِ مصطفےٰ نے کہا یا علی مدد
پُشتی پہ ہوئے شیرِ الٰہی سا جس کا جد
ہوتا ہے کیا حریف کرے لاکھ جد و کد
دریائے موج خیز یہ تھے وہ حباب تھا
زہرہ شقی کا آنکھ ملاتے ہی آب تھا

بڑھ کر ہٹا لرز کے جو سنبھلا وہ پُر غرور
بولے یہ مسکرا کے علی اکبرِ غیور
آمد میں وہ شکوہ و تعلّی وہ مکر و زور
گرجا تھا اس قدر تو برسا بھی تھا ضرور
سرکش زمیں پہ گر کے سنبھلتا نہیں کبھی
نخلِ غرور پھولتا پھلتا نہیں کبھی

مقدور پہ بھی کرتے ہیں عاقل فروتنی
عاجز ہیں سب خدا کی مگر ذات ہے غنی
ہم سے زیادہ کون ہے تلوار کا دھنی
چلتے ہیں جھک کے صورتِ شمشیرِ آہنی

دیکھا نہ راستی کا مزہ کج ادائی میں
سبقت کسی سے ہم نہیں کرتے لڑائی میں

سب جانتے ہیں دستِ علیؑ کی صفائیاں   سرکیں نبیؐ کے سامنے کیا کیا لڑائیاں
عالم کے سرکشوں نے شکستیں اُٹھائیاں   بدر و اُحد میں خون کی نہریں بہائیاں
مدحِ علیؑ و رسولِ خدا کی زباں پہ ہے
لاسیف و لافتیٰ کی صدا آسماں پہ ہے

غرّہ ہمیں نہیں تجھے دعویٰ ہے گر تو آ   تیری طرف یزید ہماری طرف خدا
آمد تو دیکھی جنگ کا بھی کچھ ہنر دکھا   مالک تجھے سقر میں بلاتا ہے جلد جا
ساتوں جہنم آتشِ فرقت میں جلتے ہیں
شعلے تری تلاش میں باہر نکلتے ہیں

تو لاشقی نے سنتے ہی یہ گرزِ گاؤسر   اکبر نے دوشِ پاک سے لی ہاتھ میں سپر
آیا اُدھر سے گرز اِدھر سے چلا تبر   دو ہو گیا عمود مثالِ خیارِ تر
گرز اس طرح نکل گیا پنجے سے چھوٹ کے
سمجھے یہ سب زمیں پہ گرا ہاتھ ٹوٹ کے

بھالا سنبھالا دشمنِ ایماں نے مَل کے ہاتھ   نیزے کے چار پانچ نکالے سنبھل کے ہاتھ
پہلے ہی بک چکا تھا ستمگر اجل کے ہاتھ   بڑھتا نہ تھا جو پاؤں تو رکتا تھا چل کے ہاتھ
کم تھے نہ یہ بھی زور میں گر وہ زیاد تھا
نیزے کے بند بند کا توڑ ان کو یاد تھا

رکھ کر تبر نیام سے لی تیغ شعلہ دم   تھرا کے خود اماں نے صدا دی کہ الحذر
بھالے کے ہاتھ بھول گیا سب وہ خیرہ سر   یہ بھی اُدھر سے پھرتا تھا نیزہ جدھر جدھر

جاتا کدھر یہ تیغ سے جائے اماں نہ تھی
دیکھا جو غور سے تو سناں کی زباں نہ تھی

بالائے سر جو ڈانڈ کو لایا وہ خود پسند   کھولے تمام نیزۂ بیداد گر کے بند
پھینکی شقی نے فرق پہ جھنجھلا کے پھر کمند   سر کو بچا کے شیر نے تلوار کی بلند
گردش تھی ہاتھ کی نہ بڑھے کچھ نہ گھٹ گئے
حلقے کھلے تھے جو وہ اشارے سے کٹ گئے

ہٹ کر خطا شعار نے جوڑا کماں میں تیر   تیر افگنی میں شہرۂ آفاق تھا شریر
سرکش خدنگ مرگ سے کیونکر ہو گوشہ گیر   چلہ کٹا کماں کا زہے تیغ بے نظیر
قربان زور و ضربتِ نصرت نشان کے
کھل کر قضا سے بندھ گئے بازو کمان کے

خادم نے تیر جوڑ کے دی دوسری کماں   نیزہ اٹھا کے شیر نے آواز دی کہ ہاں
سپر ادھر اٹھی تھی کہ چمکی ادھر سناں   بھالے کی نوک جھونک نئی تھی نئی تکاں
سمجھا یہ دل کہ بن گئی موذی کی جان پر
ناوک زمیں پہ تھا تو کماں آسمان پر

ہاں اے محیطِ طبع روانی دکھا مجھے   پیری میں زورِ شورِ جوانی دکھا مجھے
ہاں اے زبان سیف زبانی دکھا مجھے   اے نطق آج سحر بیانی دکھا مجھے
تلواریں کھنچ گئیں دمِ تیغ آزمائی ہے
آفت کا معرکہ ہے غضب کی لڑائی ہے

اے تیغِ بادشاہِ نجف شعلہ بار ہو   اے شہسوارِ مستعدِ کارزار ہو
اے برقِ طبع کوند کے گردوں کے پار ہو   اے سیفِ خامۂ دو زباں شعلہ بار ہو

ہاں معرکہ ہے یہ کہ لڑائی بگڑ نہ جائے
چوٹیں نئی ہوں سب کوئی مضموں لڑ نہ جائے

ہاں غازیو دکھاتا ہوں تصویرِ حرب گاہ — غل جو ہو دو دو کا ہو جس شور یہ واہ واہ
تولے ہے تیغ اِدھر پسرِ شاہِ دیں پناہ — آمادۂ نبرد اُدھر ہے وہ رو سیاہ
دونوں کو معرکہ میں تمنا ہے جنگ کی
باگیں اُٹھی ہوئی ہیں کمیت و سرنگ کی

دوزخ اُدھر ہے خلدِ بریں کا چمن اِدھر — کانٹے اُدھر ہیں وارثِ گلبدن اِدھر
کافر اُدھر شبیہِ رسولِ زمن اِدھر — مرحب ہے اُس طرف شہِ خیبر شکن اِدھر
باطل چلا جہاں سے کہ حق کا ظہور ہے
جو نار ہے وہ نار ہے پھر نور نور ہے

عاری ہیں تیغ زن شہِ مرداں کے سامنے — گُل ہیں چراغ مہرِ درخشاں کے سامنے
کیا سحر سامری بنِ عمراں کے سامنے — کیا مور کی بساط سلیماں کے سامنے
آہو کا اور شیر کا انداز اور ہے
حقا کہ سحر اور ہے اعجاز اور ہے

وہ بجلیاں سی کوند کے گرتی ہیں بار بار — ڈھالوں کے پرزے اُڑتے ہیں دوہرے ہیں جن پہ چار
طاؤس ہیں ہرن ہیں چھلاوا ہیں راہوار — لشکر ہے اک زباں کہ یہ جرأت ہے یادگار
غالب یہی ہیں گو وہ قوی تر ہے گیو سے
غل ہے کہ لڑ رہے ہیں یداللہ دیو سے

بڑھتا ہے تول تیغ اِدھر سے وہ نامور — دب دب کے پیچھے ہٹتا ہے وہ صورتِ بشر
یوں نعرہ زن ہے غیظ میں شبیر کا پسر — یہ اضطراب جنگ میں عالم تہ و زبر

حملے تو دیکھ رُخ سے جھلم کو اُتار کر
او رُوسیاہ آنکھ تو شیروں سے چار کر

کٹ کٹ کے وار کرتا ہے پیہم وہ روسیاہ — پران کی تیغ سے کہیں ملتی نہیں پناہ
روباہ وہ یہ نخوتِ دلِ ضیغمِ الٰہ — جن کے غلام مُلکِ شجاعت کے بادشاہ
زیبا ہے برقِ شعلہ فشاں میغ کے لئے
تیغ ان کے واسطے ہے یہ ہیں تیغ کے لئے

اس دوپہر کی دھوپ میں تیغوں کی وہ چمک — دو بجلیاں سی کوندرہی تھیں تہِ فلک
حیرت میں تھے زمیں پہ بشر چرخ پر مَلک — مثلِ علیؑ جھپکتی نہ تھی شیر کی پلک
رُخ پر ہراس کچھ دمِ جنگ و جدال نہ تھا
تلوار چل رہی تھی پہ ابرو پہ بل نہ تھا

گھاتیں ہزار کرتا تھا وہ لاکھ مکر و زُور — لیکن کہاں چراغ کہاں مہرِ دیں کا نور
او جبڑ سپر کی ہے جو اُٹھائے سرِ غرور — بولے تو موت کا بھی طمانچہ نہیں ہے دُور
سچ کہتے ہیں ہراس میں کیا زور چل سکے
پنجہ میں شیر کے ہو تو کیونکر نکل سکے

شانہ کٹا سپر سے بچایا جو اُس نے سر — ٹکڑے اُڑے جھلم کے ہٹی منہ سے جب سپر
چار آئنہ میں جسم تو محفوظ تھا مگر — سارا چھنا ہوا تھا زرہ کی طرح جگر
تاب و تواں کو حرب میں ہارا ہوا تھا وہ
تیغِ زباں کے زخم کا مارا ہوا تھا وہ

خالی گئیں منجھی ہوئی چوٹیں جو اُس کی سب — منہ کو پھرا پھرا کے شقی کاٹتا تھا لب
تلوار کو اُٹھا کے پکارا وہ شیر تب — ہشیار او لعیں اجل آتی ہے سر پہ اب

مہلت ابھی ہے تیغ و سپر کو سنبھال لے
باقی ہو کچھ ہوس تو اُسے بھی نکال لے

بولا سپر کو فرق پہ رکھ کر وہ پُر غرور — پھنکتا ہے تن یہ دھوپ سے ہے پیاس کا وفور
میداں کُرہ ہے نار کا اے کبریا کے نور — بھڑکی ہے آگ سینے میں اک صورتِ تنور
ہر چند ہاتھ دھوئے ہوں اپنی حیات سے
مہلت ملے تو پی لوں میں پانی فرات سے

تلوار روک کر یہ پکارا وہ لالہ فام — تو نے سنا تو ہوگا کہ ہم بھی ہیں تشنہ کام
تلوار روکنے کا نہیں گرچہ یہ مقام — پُر خیر پی لے نہر سے پانی کا بھر کے جام
فیاض ہیں کریم ہیں ابنِ کریم ہیں
دشمن پہ رحم کرتے ہیں ہم وہ رحیم ہیں

خنداں ہوئے شقی پہ لبِ تیغِ جاں گداز — بڑھ کر زبانِ طعن، سناں نے بھی کی دراز
آواز دی کماں نے زہے شانِ بے نیاز — سوفار نے صدا دی کہ سرکش ہے حیلہ ساز
ہے خوفِ ضربِ تیغ سے طالب پناہ کا
بولی سپر کہ پھر گیا رُخ روسیاہ کا

لے آیا آب سامنے خادم بصد شتاب — پانی پہ گر پڑا وہ کہ تھی ضبط کی نہ تاب
ظالم نے سامنے جو پیا ڈگڈگا کے آب — پیاسے تھے تین دن کے ہوا دل کو اضطراب
تڑپا جو قلب چشم کے ساغر چھلک پڑے
اُٹھا دھواں جگر سے کہ آنسو ٹپک پڑے

سیراب ہو چکا جو وہ سفاک و بدگہر — کی عرض کیجے آپ بھی پانی سے حلق تر
فرمایا تشنہ لب ہے شہنشاہِ بحر و بر — آبِ حیات ہو تو پئیں ہم نہ بے پدر

ڈوبے ہوئے ہیں چشمۂ کوثر کی چاہ میں
یہ آب نہر خاک ہے اپنی نگاہ میں

شبیرؑ نے جو دور سے دیکھا یہ ماجرا — دو چار گام بڑھ کے یہ بیٹے کو دی صدا
اے مرحبا رسولؐ کے ہم شکل مرحبا — سیراب سلسبیل سے تم کو کرے خدا
کیونکر نہ صبر و شکر میں ایسا کمال ہو
کیونکر نہ ہو کہ ساقیٔ کوثر کے لال ہو

تسلیم کر کے شہ کو بصد عجز و انکسار — مثل اسد شکار پہ آیا وہ شہسوار
نعرہ کیا کہ او سگِ بزدل ستم شعار — ہاں اب تو تازہ دم ہے اٹھا تیغ آبدار
ہنستا ہے کیوں عرب کی حمیت کو تو نہ کھو
پانی تو پی چکا ہے بس اب آبرو نہ کھو

سن کر برس پڑا وہ جفا کار و بدگہر — رو کر کے سارے وار بڑھا شاہ کا پسر
لہرا رہی تھی فرق پہ وہ ماہیٔ ظفر — مارا جو ہاتھ برق سی کوندی قریب سر
چھوڑا سوار کو نہ فرس کو تنگ کو
اک شور تھا کہ کھا گئی مچھلی نہنگ کو

دو ہو کے گر پڑا جو برابر وہ پہلواں — جبریل پر اٹھا کے پکارے کہ الاماں
نکلی زمیں میں ڈوب کے شمشیر خوں چکاں — تکبیر کہہ کے جوش میں جھوما وہ نوجواں
. افلاک سے گزر گئی ساونت کی صدا
آئی خدا کے عرش سے احسنت کی صدا (حیا لشکر خدا کا علم ....)

دیکھا جو باپ نے کہ پسر کو ہوئی ظفر — بس جھک گئے زمیں پہ شہنشاہ بحر و بر
سجدے سے سر اٹھا کے پکارے بچشم تر — یا رب لٹا ہے تیسرے فاقے میں یہ پسر

قابو میں دل نہیں ہے بہت بیقرار ہوں
ہاں تیرے رحم و لُطف کا اُمیدوار ہوں

بہتر نہیں ہے اس سے مرے پاس کوئی شے — مایہ ہے تو یہ ہے جو بضاعت ہے تو یہ ہے
گذری بہارِ زیست کی آیا زمانِ دے — اب کوئی دم میں عمر کا بھی مرحلہ ہے طے
حُرمت ہے اِس پسر کی شہادت حصول کر
یارب فقیر کا ہے یہ ہدیہ قبول کر

مقبول جس طرح ہوئی قربانیِ خلیل — اُس طرح سرفراز ہو یہ بندۂ ذلیل
دُنبہ وہاں بہشت سے لائے تھے جبرئیل — میں اُس کا ملتجی نہیں اے خالقِ جلیل
اُمت بھی بخشی جائے پسر بھی سعید ہو
مقبول ہو اگر یہ ذبیحہ تو عید ہو

مصروف تھا دعا میں اِدھر فاطمہؑ کا لال — ڈوبا ہوا تھا فوجِ عدو میں وہ نونہال
بڑھ کر وغا کرے یہ کسی کی نہ تھی مجال — لاکھوں سے معرکہ تھا ہزاروں سے تھی جدال
سوکھے تھے ہونٹ رنگ بھی فاقوں سے زرد تھا
بازو تھکا ہوا تھا کلائی میں درد تھا

یہ دیر سے لڑتے ہوئے وہ فوج تازہ دم — فاقوں کا ضعف پیاس کا صدمہ پدر کا غم
ہاتھوں کا زور کم ہوا جاتا تھا دمبدم — پر کھیت میں جمے ہوئے تھے شیر کے قدم
آنکھیں تو سُرخ غیظ سے تیوری چڑھی ہوئی
طاقت گھٹی ہوئی تھی پہ ہمت بڑھی ہوئی (جب بادبانِ کشتیِ شاہِ اُمم --)

روکی تمام فوج نے اک تشنہ لب کی راہ — گھوڑا اڑا کے بیچ میں آیا وہ رشکِ ماہ
ڈھالوں سے دشتِ کیں تھا کئی کوس تک سیاہ — تلوار چل رہی تھی کہ اللہ کی پناہ

لاکھوں سے معرکے میں کوئی یوں لڑا نہیں
غُل تھا عرب میں رَن کبھی ایسا پڑا نہیں

گردوں پہ تھی صدائے چکاچاک تیغ و تیر — ڈوبا تھا خوں میں سب شہِ دیں کا مہِ مُنیر
فرماتے تھے جو رُکتا تھا اسپِ فلک مسیر — اب ہم بھی ہیں تمام لڑائی بھی ہے اخیر
زخموں سے تو بھی چُور ہے اور ہم بھی چور ہیں
افسوس بس یہی ہے کہ بابا سے دُور ہیں

نکلا پرے سے شیثِ ربعی خطا شعار — ہمراہ تھے شقی کے کماندار دس ہزار
تیروں کا مینہ برس گیا پیاسے پہ ایک بار — راکب کا جسم گھوڑے کے پہلو ہوئے فگار
اُڑ اُڑ کے طے جو کرتا تھا راہِ ثواب کو
غُل تھا کہ پر خدا نے دیئے ہیں عقاب کو

نکلے کماں کشوں کے جو حلقے سے وہ جناب — تھی پھر تو برچھیوں کی کرن گِردِ آفتاب
ڈوبے لہو میں گُھٹنے لگا گلشنِ شباب — روتے تھے خوں کے آنسوؤں سے دیدۂ رکاب
مجروح شیر بیچ میں تھا اُس ہجوم کے
نیزوں پہ نیزے کھاتے تھے جھوم جھوم کے (جب لشکرِ خدا کا علم ....)

اس حال میں بھی تیغ سے کیں برچھیاں قلم — لیکن جگر پہ لگ گیا اک نیزۂ ستم
زخمِ جگر سے بہنے لگا خون دمبدم — نکلے ہوئے رکابوں سے تھراتے تھے قدم
کھینچا جو اُس نے سینے سے نیزہ تکاں کے ساتھ
دو پارۂ جگر نکل آئے سناں کے ساتھ

نیزہ لگا کے بھاگ چلا تھا وہ نابکار — قربانِ جرأتِ پسرِ شاہِ نامدار
زخمِ سناں تھا سینۂ انور کے وار پار — ماری شقی کو دوڑ کے اک تیغِ آبدار

پہنچوں سے اُس کے ہاتھ قلم ہو کے گر پڑے
لیکن فرس سے آپ بھی خم ہو کے گر پڑے
گرنا تھا بس کہ سر پہ لگا گرز بے ستم — یوں جھک گئے کہ ہوتے ہیں سجدے میں جیسے خم
رکھ دی گلے پہ شیث نے شمشیرِ تیز دم — تلوار اک پڑی کہ ہوئیں پسلیاں قلم
غل تھا کرو نہ رحم تنِ پاش پاش پر
دوڑا دو گھوڑے اکبرِ مہرو کی لاش پر
حضرت کھڑے تھے خیمے کی پکڑے ہوئے طناب — سُن کر یہ غل رہی نہ دلِ ناتواں کو تاب
ناگاہ آئی رن سے صدا اے فلک جناب — بیٹا جہاں سے جاتا ہے اب آئیے شتاب
لاشے پہ ظلم و جَور بد افعال کرتے ہیں
گھوڑوں سے اہلِ کیں ہمیں پامال کرتے ہیں
سُن کر یہ استغاثۂ فرزندِ خوش خصال — سیّد نے آہ کی کہ ہلا عرشِ ذوالجلال
کھولے جنابِ فاطمہؑ کی بیٹیوں نے بال — بانو پکاری خیر تو ہے اے علیؑ کے لال
ہے ہے پسر سے کون سی مادر بچھڑ گئی
صاحب بتاؤ کیا مری بستی اُجڑ گئی
نیزے سے کس کے لال کا زخمی ہوا جگر — کرتے ہیں کس کی لاش کو پامال اہلِ شر
کہتا ہے کون رن میں تڑپ کر پدر پدر — اب گھر سے میں نکلتی ہوں ہے ہے مرا پسر
پردا نہ مجھ سے کیجئے سب جانتی ہوں میں
آواز یہ اُسی کی ہے پہچانتی ہوں میں
بانو کو قسمیں دے کے چلے شاہِ نامدار — وہ پیاس اور وہ دھوپ کا صدمہ وہ اضطرار
دل تھا اُلٹ پلٹ تو کلیجہ تھا بے قرار — اُٹھتے تھے اور زمیں پہ گرتے تھے بار بار

چلاتے تھے شبیہ پیمبر ہم آتے ہیں
گھبرائیو نہ اے علی اکبر ہم آتے ہیں

بیٹا پکارو پھر کہ بصارت میں فرق ہے　　اے نورِ عین جسم کی طاقت میں فرق ہے
تم یہ نہ جانیو کہ محبت میں فرق ہے　　زخمی ہے قلب روح کی راحت میں فرق ہے
داغِ جگر ملا ہمیں گودی میں پال کے
کس کو دکھاؤں اپنا کلیجہ نکال کے

کچھ سوجھتا نہیں میں کدھر جاؤں کیا کروں　　اے نورِ چشم تجھ کو کہاں پاؤں کیا کروں
مضطر ہے جان و دل کسے سمجھاؤں کیا کروں　　کیونکر پسر کو ڈھونڈ کے میں لاؤں کیا کروں
پایا تھا مدتوں میں جسے خاک چھان کے
وہ لعل ہم نے کھو دیا جنگل میں آن کے

بس اب خبر حسینؑ کی لے جلد اے اجل　　اے جسمِ زار زیست کا باقی نہیں محل
اے جانِ ناتواں تنِ مجروح سے نکل　　ہاں اے نفس چھری کی طرح سے گلے پہ چل
چھوٹے نہ اُس کا ساتھ جو پیری کی آس ہو
لاشہ بھی لاشۂ علی اکبر کے پاس ہو

جنگل سے بے حواس پھرے نہر پر گئے　　واں بھی جو وہ گہر نہ ملا سوئے بر گئے
دوڑے کسی طرف تو کسی جا ٹھہر گئے　　تھا لے لے لہو کے برابر جدھر گئے
ٹپکا ہوا زمیں پہ جگر کا لہو ملا
لیکن کہیں نہ وہ پسرِ ماہرو ملا

جا کر صفوں کے پاس پکارے باشکِ آہ　　ہے کس طرف مرے علی اکبر کی قتل گاہ
اے ظالمو یہ شب ہے کہ دن ہو گیا سیاہ　　کس ابر میں چھپا ہے مرا چودھویں کا ماہ

بتلاؤ جان ہے کہ نہیں جسم زار میں
زخمی پڑا ہے شیر مرا کس کچھار میں

لاشِ پسر کو ڈھونڈتے تھے شاہِ بحر و بر — سر پیٹنے کی جا ہے کہ بنتے تھے اہلِ شر
کہتا تھا شمر اے پسرِ سیدالبشر — کس کو حضور ڈھونڈتے ہیں مرگیا پسر
خود ڈھونڈھ لیجیے جسدِ پاش پاش کو
بتلائیں گے نہ ہم علی اکبر کی لاش کو

یہ سُن کے کھینچ لی شہِ والا نے ذوالفقار — چمکی جو برقِ تیغ تو بھاگے ستم شعار
شہ کو نظر پڑا علی اکبر کا راہوار — چلائے اے عقاب کدھر ہے ترا سوار
دکھلا دے مجھ کو لاش مرے نورِ عین کی
کس دشت میں پڑی ہے بضاعت حسینؑ کی

گھوڑے نے ہنہنا کے سوئے دشت کی نظر — یعنی کہ لاش آپ کے پیارے کی ہے اُدھر
جاتا تھا آگے آگے وہ تازی بچشم تر — گھوڑے کے پیچھے پیچھے تھے سلطانِ بحر و بر
جنگل میں لاشۂ پسرِ نوجواں ملا
وہ مر لقا ملا تو مگر نیم جاں ملا

دیکھی عجیب حالتِ فرزندِ نوجواں — پیکاں گلے میں ہونٹوں پہ نکلی ہوئی زباں
تن پر جراحتِ تبر و خنجر و سناں — گردن تھی کج پھری ہوئی آنکھوں کی پتلیاں
ٹاپوں سے مرکبوں کی جراحت پھٹے ہوئے
چہرہ سفید خاک میں گیسو اٹے ہوئے

ہچکی کے ساتھ کہتے ہیں واکر کے چشم تر — اے جان جسم زار میں اور ایک دم ٹھہر
اے موت بے وطن کی جوانی پہ رحم کر — اے درد تھم ذرا کہ پھٹا جاتا ہے جگر

پھر ایک بار سیّدِ والا کو دیکھ لوں
مہلت بس اتنی دے کہ میں بابا کو دیکھ لوں

دشمن کو بھی نہ بیٹے کا لاشہ خدا دکھائے
حضرت زمیں پہ گر کے پکارے کہ ہائے ہائے
زندہ ہے یہ پیر جواں یوں جہاں سے جائے
اے لال تین روز کے فاقے میں زخم کھائے
شاید جگر کے زخم سے تم بے قرار ہو
زخمی تمہاری چھاتی پہ بابا نثار ہو

کیوں کھینچتے ہو پاؤں کو اے میرے گلعذار
کیوں ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے پٹکتے ہو بار بار
آنکھیں تو کھول دو کہ مرا دل ہے بے قرار
بیٹا تمہاری ماں کو تمہارا ہے انتظار
بہنیں کھڑی ہیں در پہ بڑے اشتیاق میں
اکبر تمہاری ماں نہ جئے گی فراق میں

حضرت یہ کہتے تھے کہ چلا خلق سے پسر
اتنی زباں ہلی کہ خدا حافظ اے پدر
ہچکی جو آئی تھام لیا ہاتھ سے جگر
انگڑائی لے کے رکھ دیا شہ کے قدم پہ سر
آباد گھر لُٹا شہِ والا کے سامنے
بیٹے کا دم نکل گیا بابا کے سامنے (حبیب غازیاں خو، با خدا...)

بچھڑا وہ لال جس کا گوارا نہ تھا فراق
فرماتے تھے کہ لوٹ لیا تو نے اے عراق
اے موت جلد آ کہ بس اب زندگی ہے شاق
خنجر کی آرزو ہے شہادت کا اشتیاق
برباد اس طرح کوئی آباد گھر نہ ہو
کیا زندگی کا لطف جب ایسا پسر نہ ہو[1]

---

[1] جب نوجواں پسر شہِ دیں سے جُدا ہوا۔

حضرت امام حسینؑ کی رخصت

روتے ہوئے حرم میں گئے قبلۂ انام — تر تھی لہو سے لختِ جگر کے قبا تمام
رُخ زرد دل میں درد بدن سرد تشنہ کام — طاقت نہ قلب میں نہ بدن میں لہو کا نام
یہ درد تھا بکا میں کہ دل ٹکڑے ہوتے تھے
یہ حال تھا کہ رونے پہ دشمن بھی روتے تھے

پیارے نہ تھے حسین علیہ السلام کے — لائی حرم سرا میں بہن ہاتھ تھام کے
تھرا رہے تھے پاؤں شہِ تشنہ کام کے — سر دوش پر تھا زینبِ عالی مقام کے
فرماتے تھے بہن علی اکبر گذر گئے
ہم ایسے سخت جاں تھے کہ اب تک نہ مر گئے

پُرسا تمہیں شہید کا دینے کو آئے ہیں — کس کس کے داغ آج جگر پر اُٹھائے ہیں
بیٹھے ہیں خاک اُڑائی ہے آنسو بہائے ہیں — یہ ہم تمہارے لال کے خوں میں نہائے ہیں
سر تھا حسینؑ بیکس و تنہا کی گود میں
بیٹے کی جان نکلی ہے بابا کی گود میں

سر بارِ دوش ہے ہمیں رخصت کرو بہن — اب عنقریب خیمۂ عصمت ہیں تیغ زن
مُردے پڑے ہوئے عزیزوں کے بے کفن — پامال ہو نہ لاشۂ فرزندِ صف شکن
محجوب ہم ہیں قاسمِ بے پر کی لاش سے
شرمندگی نہ ہو علی اکبر کی لاش سے

یہ سُن کے بی بیوں کے جگر پر چھری چلی — زینبؑ زمیں پہ گر کے پکاری کہ یا علی
سترِ خفی جہاں کے ہیں سب آپ پر جلی — جاتا ہے ظالموں میں یہ کونین کا ولی

بیکس کو آسرا ہے پسر کا نہ بھائی کا
آقا یہی تو وقت ہے مشکل کشائی کا

صدقے گئی پسر کے بچانے میں کد کرو
فرزندِ فاطمہؑ کی بلاؤں کو رد کرو
دریا کو چھین لو حقِ زہرا سند کرو
یا شیرِ حق مقام مدد ہے مدد کرو
پانی پہ جنگ آگ لگی ہے یہ دہر میں
حصہ پسر کا کیا نہیں مادر کے مہر میں

یا مصطفیٰ بلا میں پھنسا ہے تمہارا لال
یا شیرِ ذوالجلال دکھاؤ انھیں جلال
یا فاطمہ میں لٹتی ہوں بکھراؤ سر کے بال
یارب اُلٹ دے آج یہ سب عرصۂ قتال
پھر کیا کسی سے کام ہے سب سے جدا رہوں
بھائی کو اپنے لے کے میں جنگل میں جا رہوں

فرمایا شہ نے صبر بہن چاہیے تمہیں
خالق کی یاد وردِ علیٰ چاہیے تمہیں
لب پر رضا رضا کا سخن چاہیے تمہیں
جو ماں کا تھا چلن وہ چلن چاہیے تمہیں
ہر بار پوچھتے تھے سبب آہِ سرد کا
شکوہ کیا علیؑ سے نہ پہلو کے درد کا

دردِ شکم سے لوٹتی تھیں وہ نکوخصال
ٹوٹی ہیں پسلیاں یہ ہمیں بھی نہ تھا خیال
پوچھا کسی نے جب تو کہا شکرِ ذوالجلال
بازو کے نیل کا تو کھلا وقتِ غسل حال
رونے میں دن تڑپنے میں راتیں گذر گئیں
بستر تھا جس جگہ اُسی حجرے میں مر گئیں

ظاہر ہیں جو علیؑ پہ کیے ظالموں نے جبر
اِس غم سے تھا نہ چین نبیؐ کو میانِ قبر
حجرے میں بیٹھے بیٹھے کے روتے تھے مثلِ ابر
لیکن کبھی سنا کوئی کلمہ سوائے صبر؟

ہم کیا ہیں چیز ہاتھ بندھے یا گلا بندھے
جب رسیاں سے گردنِ مشکل کشا بندھے

عزلت گزیں تھے بعدِ علیؑ قبلۂ دوم   اس بے کسی میں سر پہ نہ جد تھے نہ اب نہ ام
مسموم کس خطا پہ ہوئے ۔ تھے حواس گم   ٹکڑے جگر کے گنتا تھا میں رو رہی تھیں تم
بعد از فنا بھی درپئے ایذا شریر تھے
فرزندِ فاطمہؑ کے جنازے پہ تیر تھے

ہیں موردِ بلا و مصیبت ازل سے ہم   اس غمکدے میں چین سے گزرا نہ ایک دم
غم ہے ہمارے واسطے ہم ہیں برائے غم   سب اپنے اپنے عہد میں سہہ سہہ گئے ستم
اب آخری بہن یہ سواری ہماری ہے
بعد اُن بزرگواروں کے باری ہماری ہے

یہ سچ کہ تم کو مجھ سے محبت ہے اے بہن   کیا کیجئے ناگزیر یہ فرقت ہے اے بہن
پیارے تمہارے بھائی کی رخصت ہے اے بہن   دنیا مقامِ رنج و مصیبت ہے اے بہن
بھولے نہ یادِ حق کبھی گو حال غیر ہو
اس کی ظفر ہے خاتمہ جس کا بخیر ہو

کیا کرتیں تم بہن اجل آتی وطن میں گر   یکساں ہے مرنے والوں کو جنگل ہو یا کہ گھر
درپیش ہے سفر میں ہمیں خلق سے سفر   اب آرزو یہ ہے کہ کٹے تن سے جلد سر
ہر دکھ میں خوش ہیں وہ جنہیں الفت خدا کی ہے
میرا نہیں یہ سر تو امانت خدا کی ہے

دیکھا یہ کہہ کے بالی سکینہ کو یاس سے   لپٹی وہ دوڑ کر شہِ گردوں اساس سے
طاقت نہ تھی کلام کی ہر چند پیاس سے   بولی وہ تشنہ کام شہِ حق شناس سے

کیا اس بلا کے بن سے تہیہ سفر کا ہے
صدقے گئی بتاؤ ارادہ کدھر کا ہے

فرمایا شہ نے ہاں یہ سفر ناگزیر ہے — آؤ گلے لگو کہ یہ صحبت اخیر ہے
اب آرزوئے قرب خدائے قدیر ہے — تنہا ہیں ہم سپاہ مخالف کثیر ہے
طے ہو یہ مرحلہ جو عنایت خدا کرے
جس کا نہ کوئی دوست ہو بی بی وہ کیا کرے

سن کر مصیبت پدر بیکس و حزیں — بولی بلائیں باپ کی لے کر وہ مہ جبیں
نکلو بلا کے بن سے کہیں یا امام دیں — آقا سوا حضور کے میرا کوئی نہیں
صدقے گئی مدینے چلو یا نجف چلو
للہ ساتھ لے لو مجھے جس طرف چلو

شہ نے کہا کہ بند ہیں راہیں پدر نثار — پھیلی ہوئی ہے چار طرف فوج نابکار
پیدل نکلنے پاتا ہے ناکوں سے نہ سوار — اس دشت کیں میں قید ہے احمدؐ کا یادگار
قاصد جو میرے نام کا خط لے کے آتے ہیں
سر کاٹ کر درختوں میں لٹکائے جاتے ہیں

گھیرا ہے اس لئے مجھے اس بن میں بے گناہ — تا مجھ تک آسکے نہ کوئی میرا خیر خواہ
نہ دوست نہ عزیز نہ غمخوار نہ سپاہ — ساتھی تو سب عدم میں وطن دور گھر تباہ
مجھ سا بھی کوئی بیکس و بے پر بشر نہ ہو
مر کر نہ دفن ہوں تو کسی کو خبر نہ ہو

جانا ہے دور شب کو جو آنا نہ ہو ادھر — ضد کر کے روئیو نہ ہمیں چاہتی ہو گر
پہلے پہل ہے آج شب فرقت پدر — سو رہیو ماں کی چھاتی پہ غربت کدے کے سر

راحت کے دن گزر گئے یہ فصل اور ہے
اب یوں بسر کرو کہ یتیموں کا طور ہے
بُندے اُتارو طوق بڑھاؤ پدر نثار   چھپنا کہیں جو لوٹنے آئیں ستم شعار
چلائیو نہ اَینَ اَبی کہہ کے بار بار   دشمن ہمارے نام کا ہے شمرِ نابکار
لو الوداع جاتے ہیں اب قتل گاہ میں
سونپا تمہیں نبیؐ و علیؑ کی پناہ میں
یہ کہہ کے پیاری بیٹی سے دیکھا اِدھر اُدھر   پوچھا کدھر ہیں بانوئے ناشاد و نوحہ گر
فضہ نے عرض کی کہ اُدھر پیٹتی ہیں سر   رخصت کی بھی حضور کی اُن کو نہیں خبر
لب پر گھڑی گھڑی علی اکبر کا نام ہے
چلیے ذرا کہ کام اب ان کا تمام ہے
روتے ہوئے گئے جو وہاں شاہِ خوش خصال   دیکھا کہ غش میں خاک پہ بکھرے ہوئے ہیں بال
شبیرؑ بیٹھ کر یہ پکارے بصد ملال   اے شہر بانو ہوش میں آؤ یہ کیا ہے حال
سچ ہے فلک نے تم کو بڑے دکھ دکھائے ہیں
صاحب اٹھو ہم آخری رخصت کو آئے ہیں
سن کر صدا حسینؑ کی چونکی وہ نوحہ گر   کی عرض سر جھکا کے قدم پر بچشمِ تر
تنہا حضور آئے ہیں باندھے ہوئے کمر   صاحب کہاں ہے منتوں والا مرا پسر
ایسے نہیں جو دکھ میں جدا ہوں وہ باپ ہے
اپنے مرادوں والے کو لوں گی میں آپ سے
باتیں یہ سن کے کہنے لگے شاہِ بحر و بر   یارب جدا نہ ہو کسی ماں سے جواں پسر
بانو کسے بلاؤں کہاں ہے وہ سیم بر   ہم شکلِ مصطفٰے تو گئے فاطمہؑ کے گھر
ہر دکھ میں صبر کرتے ہیں جو حق شناس ہیں
جس نے تمہیں دیا تھا وہ اب اس کے پاس ہیں

جاتے ہیں ہم وہاں کہ جہاں ہے وہ لالہ فام   کہہ دو جو اپنے لال کو دینا ہو کچھ پیام
سُن کر یہ ذکر ہوش میں آئی وہ تشنہ کام   سمجھی کہ گھر تباہ ہوا اب چلے امام
خنجر سے حلق شاہ کے کٹنے کا طور ہے
بستی اُجڑ کے تخت اُلٹنے کا طور ہے

دامن پکڑ کے شاہ کا بولی وہ دل فگار   اے ابنِ فاطمہ یہ کنیز آپ کے نثار
بعد آپ کے جو لوٹنے آئیں ستم شعار   بیٹھے کہاں یہ بیکس و غمگین و سوگوار
کچھ حق میں اس کنیز کے فرما کے جائیے
صاحب کسی جگہ مجھے بٹھلا کے جائیے

میں وہ ہوں جو کہ قید میں آئی تھی یا امام   مشہور ہوں کنیزِ امامِ فلک مقام
پاس آپ کے ہے نام کا اے قبلۂ انام   گر قید ہو گئی تو کہیں گے یہ خاص و عام
بندی چلی ہے شام کو آلِ رسولؐ کی
دیکھو یہی بہو ہے علیؑ و بتولؑ کی

فرمایا شہ نے حافظ و حامی ہے ذوالجلال   زہراؑ کی بیٹیوں کی رہو تم شریکِ حال
زینبؑ کو دیکھو سر پہ نہ بھائی نہ دونوں لال   صاحب تمہارے ساتھ ہے عابدؑ سا خوش خصال
بے وارثوں کا وارث و والی اِلٰہ ہے
دیکھو ڈگیں نہ پاؤں کہ مشکل کی راہ ہے

لو لو وداع لاش پہ اب آ کے رو ئیو   لیکن نہ خاک اڑا کے نہ چلا کے رو ئیو
زانو پہ سر کو شرم سے منہ ڈھانپ کے رو ئیو   قبرِ رسولِ پاک پہ ہاں جا کے رو ئیو
لٹنے میں صبر، شکر تباہی میں چاہیے
رونا بشر کو خوفِ الٰہی میں چاہیے (جب نوجواں پسر نہ دیں...)

یہ کہہ کے خود چلے جتنے شہنشاہِ بحر و بر دیکھا کہ آپ آتے ہیں سجادِ نوحہ گر
دو بیبیاں سنبھالے ہیں بازو ادھر اُدھر ہے دستِ مرتعش میں عصا اور جھکا ہے سر
چہرے سے ہے عیاں کہ سراپا میں درد ہے
مانندِ زعفراں رُخِ پُر نور زرد ہے

کہنے لگے یہ بڑھ کے امامِ فلک اساس کیوں آئے تم کہ آتے تھے ہم خود تمہارے پاس
کیا حال اب مزاج کا ہے اے خدا شناس خود بے خبر ہیں صبح سے ہے یہ ہجومِ یاس
ہم سا بھی کوئی ہوگا نہ بیکس زمانے میں
آیا ہے وقت ظہر کا لاشے اُٹھانے میں

یہ سب قبا پہ سینۂ اکبر کا ہے لہو بے جاں ہوا ہے گود میں میری وہ ماہ رُو
یہ بھینی بھینی سب ہے اُسی کے بدن کی بُو ہم سر کٹا کے مر نہ گئے اُس کے روبرو
نیزہ ستم کا چاند سے سینے پہ چل گیا
وہ کیا بچھڑ گئے کہ کلیجہ نکل گیا

شکرِ خدا کہ اب نہیں باقی کسی کا غم سترۂ تن میں ہے فقط اپنا ہی ایک دم
ہمدم نہیں ہے کوئی بجز خنجرِ دو دم مقتل سے سب کی لاشیں اٹھا لاچکے ہیں ہم
کٹ کر یہ سر سناں پہ جو چڑھنے کو جائے گا
حیرت ہے کون لاش ہماری اُٹھائے گا

جس دم سُنا حسین سے یہ درد کا بیاں رو کر قدم پہ گر پڑے سجادِ ناتواں
بغلوں میں ہاتھ دے کے یہ بولے شہِ زماں بس بس غش آنہ جائے کہیں اے پدر کی جاں
اس تپ میں بیڑیوں کی مصیبت اُٹھانی ہے
بیٹا ابھی بہت تمہیں آفت اُٹھانی ہے

بستر پہ جا کے لیٹ رہو اور کوئی دم — مہلت نہ دیں گے پھر تمہیں یہ بانیٔ ستم
بولا یہ ہاتھ جوڑ کے تب وہ اسیرِ غم — چھوڑوں گا میں نہ قبلۂ کونین کے قدم
بیٹا نہ ایسے وقت میں بابا کے ساتھ ہو
بیمار چاہیے کہ مسیحا کے ساتھ ہو

قابل نہیں ہے تیغ کے گو دستِ رعشہ دار — کھائے گا نیزے آپ کے بدلے یہ جاں نثار
کچھ غم نہیں جو تپ سے دہکتا ہے جسمِ زار — لڑنے کو جب چڑھے گا تو اُتر جائے گا بخار
لڑنا ہے سہل قید میں جایا نہ جائے گا
خادم سے بارِ طوق اُٹھایا نہ جائے گا

شہ نے کہا کہ اس میں نہیں جائے دم زدن — بیٹا یہی ہے مصلحتِ ربِّ ذوالمنن
کیجو زباں سے تم نہ شکایت کے کچھ سخن — نقصان کیا ہے طوق ہو گردن میں یا رسن
ہے اختیار خالقِ عادل کے واسطے
ظلمت گہن کی ہے مہِ کامل کے واسطے

عالم ہے ذاتِ پاکِ خدا اے خجستہ خو — عمدہ وہی دیا اُسے لائق تھا جس کے جو
ہر وقت چاہیے سرِ طاعت رہے فرو — راحت ہے اُس کی راہ میں ایذا جو ہو سو ہو
سب اس جہاں میں آئے ہیں جانے کے واسطے
پیدا ہوئے ہیں رنج اُٹھانے کے واسطے

قاسم کے تن کے واسطے تھے خنجر و حسام — بے دست ہو یہ تھا مرے بھائی کے لیے نام
اکبر کو حکم تھا کہ سناں کھا کے ہوں تمام — گردن کٹائیں تیغ سے یہ ہے ہمارا کام
حکمِ خدا میں بس ہے نہ ماں کا نہ باپ کا
پہنو گلے میں طوق یہ حصہ ہے آپ کا

صبر اب تمہارا ارث ہے یہ جانتے ہیں سب ہوتا ہے تپ سے شیر کی طاقت میں فرق کب
بچوں کا یاں کے قہر ہے اللہ کا غضب سب عاجزی یہ بخششِ اُمت کا ہے سبب
بہتر ہے وہ جو مرضیٔ ربّ العباد ہے
اے نورِ عین صبر تمہارا جہاد ہے

اب تو تمہیں ہو وارثِ ذریتِ پدر محرم کوئی تو ہو جو کھلیں بیبیوں کے سر
بے جاں ہوئے تو کون سنبھالے گا میرا گھر قائم رہے گی تم سے مری نسل اے پسر
ناموسِ مصطفیٰؐ کے مدار المہام ہو
تم میرے بعد سارے جہاں کے امام ہو

گھر جلتے وقت تم کو اگر آ گیا جلال ہو جائے گی تباہ رسولِ خداؐ کی آل
زنجیر و طوق سامنے لائیں جو بدخصال تم میری بیکسی کی طرف کیجیو خیال
مطلق نہ بولنا کوئی ناری جو گرم ہو
دکھلائیو وہ صبر کہ آہن بھی نرم ہو

بولے یہ ہاتھ جوڑ کے سجادِ تشنہ کام جو مصلحت کریم کی جو مرضیٔ امام
اچھا اسیر ہونے کو حاضر ہے یہ غلام پیدل خدا کی راہ میں جاؤں گا تا بہ شام
جب تک کہ بیڑیوں میں اسیرِ ستم رہوں
حضرت دعا کریں کہ میں ثابت قدم رہوں

فرمایا شاہ نے کہ خدا حافظ اے پسر فرصت ملے تو آئیو بابا کی لاش پر
لیجو بہن کو گود میں لٹنے لگے جو گھر اپنی عبا اُڑھائیو ماں کا کھلے جو سر
لینا خبر رسن میں اگر ان کا ہاتھ ہو
زینب تمہارے ساتھ ہیں تم اُن کے ساتھ ہو (یا رب کسی کا باغ تھا ...)

سواری کی شان و شوکت

مل کر حرم سے در پہ جو شاہِ غیور آئے   اک غل ہوا حضور کرامت ظہور آئے
لاؤ فرس کو ڈیوڑھی پہ جلدی حضور آئے   اعمیٰ بھی ہو تو آنکھ کی پتلی میں نور آئے
پھرتا تھا سر پہ چتر سلیماں جناب کے
سایہ تھا ایک پیچ میں دو آفتاب کے

نصرت کی تھی صدا کہ زہے حشمت و جلال   تاباں رہے یہ نیّرِ اقبال بے زوال
شوکت کی یہ صدا تھی کہ اے فاطمہ کے لال   سرسبز تیرے دوست عدو تیرے پائمال
یارب فسادِ خلق سے امن و اماں رہے
جب تک زمیں رہے یہ امامِ زماں رہے

آیا عجب شکوہ سے اسپِ قمر رکاب   تھامے تھی فتح زین کا دامن ظفر رکاب
چشمک زنی ہلال پہ کرتی تھی ہر رکاب   حلقہ تھا نورِ مہر کا یا جلوہ گر رکاب
فتراک تھے کہ کھولے ہوئے تھا عقاب پر
زیں پر تھا گرد پوش کہ ابر آفتاب پر

اختر خجل ہیں زینِ جواہر نگار سے   ذرّوں نے چن لئے ہیں ستارے غبار سے
تھمتا ہے کب سوارِ فراست شعار سے   گردن میں ہاتھ باگ نے ڈالے ہیں پیار سے
نازاں ہے خود رکاب کے پائے کو دیکھ کر
بل کھا رہا ہے خاک پہ سائے کو دیکھ کر

قربان اس تگاورِ ضیغم شکار کے   پامال کردے شیر کو ٹاپوں سے مار کے
شائستگی کو پوچھئے دل سے سوار کے   چاہے تو ایک طفل چڑھے باگ اُتار کے

رکھ دے قدم تو رنگ نہ میلا ہو پھول کا
پیارا فرس ہے راکبِ دوشِ رسولؐ کا

چاروں سموں سے بدر خجل نعل سے ہلال — کھیلیں شکار شیر یہ آنکھیں ہیں وہ غزال
گھٹے نہ یال حور نے بکھرا دیے ہیں بال — پھرنے پہ جھوم جھوم کے صدقے پری کی چال
رستے ہیں یاد گنبدِ نیلی رواق کے
دلدل کی تیزیاں ہیں طرارے براق کے

سینہ کشادہ تنگ کمر چست جوڑ بند — گردن میں خم ہلال کا اور اس پہ سر بلند
جاندار بردبار عدو کش ظفر پسند — بجلی کسی جگہ کہیں آہو کہیں پرند
سرعت ہے ابر کی تو لطافت ہوا کی ہے
اتنے ہنر فرس میں یہ قدرت خدا کی ہے

لو اب سوار ہوتا ہے زہرا کا یادگار — تھامے رکاب کون نہ یاور نہ غمگسار
رو کر فرس سے کہتے ہیں شبیرِ نامدار — اے ذوالجناح دیکھ یہ نیرنگِ روزگار
سب دوپہر میں ابنِ علیؑ سے جدا ہوئے
جو تیرے گرد پھرتے تھے وہ دوست کیا ہوئے

لکھا ہے یاں لجامِ فرس پر تھا دستِ شاہ — فریادِ واحسینؑ سے ہلتی تھی قتل گاہ
خیمے سے نکلی اک زنِ بالا بلند، آہ — رخ پر نقاب پاؤں میں موزے عبا سیاہ
حسنِ رسولؐ و شانِ علیؑ کا ظہور تھا — ن بتولؑ
گویا لباس کعبہ میں خالق کا نور تھا

پردہ تھا پر جھکی ہوئی آئی وہ دل کباب — تھامی لرزتے ہاتھوں سے راہوار کی رکاب
گھوڑے پہ جلوہ گر ہوئے شاہِ فلک جناب — بیت الشرف میں پھر گئی وہ مثلِ آفتاب

جس کا یہ ذکر تھا وہ نواسی نبیؐ کی تھی
زینبؑ بہن حسینؑ کی بیٹی علیؑ کی تھی

جہاد کے لئے امام حسینؑ کی روانگی

رن کو سواریٔ شہ جن و بشر چلی　　پیچھے تمام فوج ملک ننگے سر چلی
گھوڑے کے ساتھ فاطمہ تھامے جگر چلی　　شبدیز کیا چلا کہ نسیم سحر چلی
طبقہ تمام نورِ سواری سے عرش تھا
سونے کی تھی زمیں تو ستاروں کا فرش تھا

ذرّوں سے آفتاب کی ضو آشکار تھی　　سر سبز تھے درخت زمیں لالہ زار تھی
ماتم میں اک سماں تھا خزاں میں بہار تھی　　جنگل تھا مشک بیز ہوا عطر بار تھی
غل تھا نہ دور دور چلو نہ بہم چلو
ہاں خادمو ادب سے قدم با قدم چلو

وہ شان وہ شکوہ وہ شوکت جناب کی　　اللہ ری ضو جھپکتی ہے آنکھ آفتاب کی
تصویر ہے جناب رسالت مآب کی　　پیری دکھا رہی ہے لطافت شباب کی
بر میں نبیؐ کا جامۂ عنبر شمامہ ہے
رنگت تو پھول سی ہے گلابی عمامہ ہے

غل تھا فرس پہ سیدِ والا کو دیکھ لو　　ہاں برق و شرقِ طورِ تجلّٰی کو دیکھ لو
پڑھ کر درود صورتِ مولا کو دیکھ لو　　بالائے رحل مصحفِ زہراؑ کو دیکھ لو
پایہ کسی بشر نے یہ پایا ہے خلق میں؟
قرآں انھیں کے واسطے آیا ہے خلق میں

حوریں ہیں گردِ ساغرِ کوثر لئے ہوئے قدسی جلو میں ہیں طبقِ زر لئے ہوئے
جبریل ہیں نجات کا دفتر لئے ہوئے جھولی میں ہے نسیمِ گُلِ تر لئے ہوئے
گُلشتے ہیں پھول وادیٔ عنبر سرشت میں
دولھا برات لے کے چلا ہے بہشت میں (جب نوجواں پسر شہِ دیں...)

امام حسینؑ کا سراپا

چہرے سے آشکار ہے خیرالوریٰ کی شان پیدا ہے سر سے تا بقدم مرتضیٰ کی شان
زہرا کا حُسن اور حسنؑ مجتبیٰ کی شان ایسے حسیں بھی ہوتے ہیں بندے خدا کی شان
ششدر ملک تھے دیکھ کے چہرہ جناب کا
جلوہ تھا ایک چاند میں چار آفتاب کا

اُن گیسوؤں کی مدح کوئی کیا کرے رقم شانے پہ بھی کھلا نہ کبھی جن کا پیچ و خم
رکھتے ہیں موشگاف بھی یاں سوچ کر قدم تاریک شب ہے دیکھ کے چل راہ اے قلم
اے بے خبر یہ کوچۂ زلفِ سیاہ ہے
لغزش نہ ہو کہ بال سے باریک راہ ہے

کیا ذکرِ عطر و عنبر و مشک و عبیر و عود سونگھیں اگر یہ بُو تو ملائک پڑھیں درود
کرتی ہے بوئے زلفِ رسا عرش تک صعود ژولیدہ اک گیاہ ہے سنبل کی کیا نمود
نکہت سے گیسوؤں کی زمیں آسماں بسے
عنبر میں کب یہ بُو ہے کہ سارا جہاں بسے

چہرہ ہے گیسوؤں میں کہ ہالے میں ہے قمر پیدا سوادِ شام میں ہے جلوۂ سحر
طُول اس کلام میں ہے بہت قصہ مختصر ہاں اب درود پڑھ کے جبیں پر کرو نظر

یاں کیا فروغ روشنیٔ کوہِ طُور کو
دیکھو اِس آئینے میں محمدؐ کے نور کو

تارا یہ صبح کا ہے کہ سجدے کا ہے نشاں   قرباں ہے ابروؤں کی کشش پر ہر اک کماں
ہر تیر پہ مژہ کے تصدق ہزار جاں   دیکھیں تمام عمر تو خاطر نہ ہو نشاں

شرمندہ حُسنِ چشم سے آہوئے تتار کے
نرگس کے پھول پھینک دو صدقے اُتار کے (یارب کسی کا باغِ تمنا…)

آنکھوں کو کہئے عین تو عینِ خطا ہے یہ   پردے نہ کیوں ہوں سات کہ نورِ خدا ہے یہ
سب کو ہے چشم داشت کہ عینِ عطا ہے یہ   بیمار خود پہ سب کے مرض کی دوا ہے یہ

سرخوش ہے جام ان کی جو اُلفت کا پی گیا
دیکھا نگاہِ لُطف سے جس کو وہ جی گیا

احسان بھی حیا بھی مروت بھی قہر بھی   خود موت بھی حیات بھی امرت بھی زہر بھی
بینا بھی نکتہ سنج بھی دانائے دہر بھی   تسنیم بھی بہشت بھی کوثر کی نہر بھی

سر شرم سے جھکائے ہے نرگس ریاض میں
جنّت سواد میں یدِ بیضا بیاض میں

آہو شکار و تیرِ کماں دار و شیر گیر   ہشیار و خوش نگاہ و سخن سنج و دلپذیر
خوں ریز و جاں فریب و دلآویز و بے نظیر   قبضے میں ابروؤں کی کمانیں مژہ کے تیر

جس سادہ دل کو ان کی سیاہی کی یاد ہو
ناخواندہ بھی اگر ہو تو روشن سواد ہو

ذرہ نواز و زہرہ نما صاحب امتیاز   طناز و شرمگین و گراں خواب و سرفراز
حق بین و پاک باز و خدا بین و بے نیاز   بیدار و داغ دادہ و خوں بار و غم طراز

گرد اس کے پھرو، یہ کعبۂ ایماں کا طوف ہے

بس اے انیس بس نظرِ بد کا خوف ہے

کیا نور ہے رخِ خلفِ بوتراب پر — ہے یہ عرق کہ عطر کے قطرے گلاب پر

کچھ تیرگی سی آ گئی ہے آب و تاب پر — سونا چڑھاؤ پھیر ورقِ آفتاب پر

آئے جلال میں نہ جلالت حضور کی

تشبیہ ہے خدا و محمد کے نور کی

کیوں منہ کو پھیرتا ہے خجل ہو کے آفتاب — شرمندہ ہو گا اپنی چمک کھو کے آفتاب

آنکھیں ملے اٹھا ہے اگر سو کے آفتاب — لازم ہے آئے سامنے منہ دھو کے آفتاب

گر چاہتا ہے عرش سے سر اس کا جا ملے

کہہ دو کہ ارضِ پاک کے ذروں میں آ ملے

دُرجِ دہن پہ لعل و عقیقِ یمن نثار — غنچے نثار پھول تصدق چمن نثار

حسنِ بیاں پہ طوطیٔ شکر شکن نثار — شورِ نمک پہ شاعرِ شیریں سخن نثار

فقروں میں لطف باتوں میں لذت بھری ہوئی

قرآں کی طرح ہے فصاحت بھری ہوئی

توبہ تنافرِ کلمات اور یہ دہن! — جملے صحیح شستہ و رفتہ ہر اک سخن

پھولا ہوا فصاحتِ الفاظ کا چمن — تقریر وہ سمجھ لیں جسے صاف مرد و زن

معنی کا بھی یہ حال ہے حسنِ قبول سے

خوشبو سحر کو جیسے نکلتی ہے پھول سے

لفظوں میں یوں ہے معنیٔ روشن کی آب و تاب — جس طرح عکس آئینہ میں جام میں گلاب

مضموں میں تناسبِ الفاظ لاجواب — تقریر بھی فصیح کنائے بھی انتخاب

یاں منتہی وہ سب ہیں جو علم و کمال ہیں
صلِ علیٰ یہ مصحفِ ناطق کے لال ہیں
دنداں کواکبِ فلکِ عزّ و شانِ حُسنؑ   گر ہیں تو بس یہی ہیں زمانے میں جانِ حُسن
خالق نے موتیوں سے بھرا ہے دہانِ حُسنؑ   خود لال ہے صفات میں جن کی زبانِ حُسن
کوسوں ضیا ہے وادیٔ مینو سرشت میں
گویا چمک رہے ہیں ستارے بہشت میں
بتیس دُر وہ لُعبتِ محبوبِ کردگار   اختر چمک سے جن کی خجل برق شرمسار
براق و دُرفشان و ضیا بار و آبدار   بھولا ہیں ان سبھوں سے ہے اِن کا فروغ و قار
ہیرے نہیں نجومِ سعادت اثر نہیں
یہ شیرِ فاطمہ کے ہیں قطرے گہر نہیں
وہ ریشِ پاک اور وہ چہرہ کی آب و تاب   نکلا ہے چیر کر شبِ یلدا کو آفتاب
کچھ جا بجا جو کھل گیا ہے ریش کا خضاب   رخصت ہے مل رہے ہیں گلے پیری و شباب
تا وقتِ عصر اور زمانِ حیات ہے
اب زندگی میں کوئی نہ دن ہے نہ رات ہے
سینے کا آئینہ ہے کہ نورِ خدا کا گھر   یا وہ مدینہ علم کا، حیدر ہے جس کا در
اس صدر میں بھرے ہوئے ہیں راز کے گہر   آئندہ و گذشتہ کی سب ہے انھیں خبر
پنہاں جو دل میں ہے اُسے پہچانتے ہیں یہ
جو بے زباں ہیں اُن کی زباں جانتے ہیں یہ
ذکرِ گلو جو ہے تو گلے میں رُکا ہے دم   حوروں کی گردنیں ہیں اسی جا ادب سے خم
لیتے ہوں بوسے جس کے رسولِ فلک حشم   افسوس اُس گلے پہ چلا خنجرِ ستم

سوکھی رگیں گلوئے مُبارک کی کٹ گئیں
افلاک گر پڑے نہ زمینیں اُلٹ گئیں

پیہم زباں دکھا کے کہا آب آب آب
اے وا محمدا نہ کسی نے دیا جواب
قطرے سے بھی زباں نہ ہوئی آہ کامیاب
آخر تڑپ کے رہ گیا وہ آسماں جناب
جلتی زمیں پہ لاشِ شہِ نیک خو رہی
گردن گلے سے کٹنے پہ بھی قبلہ رُو رہی

وہ سر رکھا خدا نے شفاعت کا جس پہ تاج
گردن وہ بزمِ لم یزلی کا جو ہے سراج
وہ صدر جس کے علم کی عالم کو احتیاج
وہ ہاتھ جس سے خیر و عطا کا ہوا رواج
دشمن تو لاکھ اور اکیلے حضُور تھے
سارے یہ عضو زخم کی تیغوں سے چُور تھے (جب خاتمہ بخیر ہوا فوج ...)

وہ دوش ہیں شفاعتِ اُمت کا جن پہ بار
بازوئے باپ دیں ہیں یہ بازوئے استوار
گوری کلائیوں کی صفائی پہ ہیں نثار
فانوسِ آستیں سے تجلّی ہے آشکار
پہونچا خیال بات خفی تھی جلی ہوئی
سانچے میں نور کے ہیں یہ شمعیں ڈھلی ہوئی

ہاتھوں کو یاد آگیا زورِ یداللّٰہی
خندق میں جن سے خوں انھیں ہاتھوں سے تھی بہی
ہر چند بازوؤں میں وہ طاقت نہیں رہی
خیبر سا اور در کوئی ہوئے تو پھر سہی
فتح و ظفر کو بیچ کے سر مول لیتے ہیں
ناخن ہوں یا نہ ہوں یہ گرہ کھول لیتے ہیں

ٹوٹا ہوا ہے بارِ الم سے کمر کا بند
خم ہے بصورتِ مہِ نَو قامتِ بلند
پیشِ نظر ہے لاشۂ فرزندِ ارجمند
صدمہ جگر پہ تن پہ تعب رُوح پر گزند

کیا غم نہیں ہے کون سا رنج و الم نہیں
صدمے یہ ہیں پہ کھیت کے باہر قدم نہیں (درطب اللساں ہوں...)

گھر کا خدا کے رُکنِ رکیں ہے کہاں ہٹے   نقش اِس قدم کا نقشِ نگیں ہے کہاں ہٹے
یہ لنگرِ سفینۂ دیں ہے کہاں ہٹے   یہ قطبِ آسمان و زمیں ہے کہاں ہٹے
زور اِس سے آسماں کا بھی چلتا نہیں کبھی
نقطہ ہے دائرے سے نکلتا نہیں کبھی

اِس دبدبے سے لشکرِ بیاں شکن میں آئے   جیسے شکار کھیلنے کو شیر بن میں آئے
یا بُلبُلِ اشتیاق میں گُل کے چمن میں آئے   غُل پڑ گیا ہٹو اسداللہ رن میں آئے
اگلی صفیں اُلٹ گئیں یوں پچھلی فوج پر
طوفاں میں موج گرتی ہے جس طرح موج پر

بھڑکے فرس، پرے ہوئے ابتر، علم ہٹے   بڑھتے ہوئے جو بانیِ ظلم و ستم ہٹے
نامی نشان چھوڑ کے ثابت قدم ہٹے   دریا ہٹا کہ فوج کے بادل بہم ہٹے
بھاگڑ میں خاک اُڑ کے جو سوئے فلک گئی
لشکر میں غل ہوا کہ زمیں بھی سرک گئی (حیدؑ خاتمہ بخیر ہوا...)

بڑھ کر صدا نصیب نے دی روبرو نگاہ   دشمن ترے ذلیل معاند ترے تباہ
آواز دی ظفر نے کہ اے معدلت پناہ   تاباں رہے ستارۂ اقبال و عزّ و جاہ
زہرہ عدو کا آب کلیجہ لہو رہے
ہر معرکے میں تیغِ علیؑ سرخرو رہے

نیزہ زمیں پہ آپ نے گاڑا جو یک بیک   ماہی سے دب کے گاوِ زمیں نے کہا سرک
شاید قیامت آئی زمیں پر گرا فلک   بس یا حفیظ کہہ کے لرزنے لگی سمک

غل تھا اُلٹ چکے ہیں حسینؑ آستین کو
یا بو ترابؑ آ کے بچا لو زمین کو

امام حسینؑ کا رجز

لوگو بجا ہے شیرِ رجز خواں ہیں شاہِ دیں ۔ نعرہ یہ ہے کہ ہیں ہمیں پشت و پناہ دیں
روشن ہمارے نور سے ہے شاہراہِ دیں ۔ دنیا میں ہم ہیں تاج سرِ عز و جاہ دیں
سجدے بتوں کو کرتے تھے ساکن کنشت کے
ہم نے تمہیں بتا دیئے رستے بہشت کے

تقدیر گردنوں پہ تمہاری سوار تھی ۔ شرکِ جلی یہ تھا کہ پرستش میں نار تھی
اسلام کے چمن میں کبھی یہ بہار تھی! ۔ حق حق کی مسجدوں میں یہ کس کی پکار تھی
چرچا تھا کفر و فسق و فجور و گناہ کا
د بیلا یہ شور کب تھا اشہد ان لا الٰہ کا

کعبے میں ہم نے پہلے اذاں دی بشد و مد ۔ دریائے رحمتِ صمدی ہیں ہمارے جد
ہم پر ازل سے ہے کرمِ مفضلِ احد ۔ سب ہم پہ منکشف ہے جو کچھ ہوگا تا ابد
تم لوگ جس طریق سے پھرتے ہو فرش پر
ہم یوں پلک جھپکنے میں جاتے ہیں عرش پر

گھر میں ہمارے وحیِ خدا لائے جبرئیلؑ ۔ جب آئے خادموں کی طرح آئے جبرئیلؑ
مشہور ہم ہیں خلق میں آقائے جبرئیلؑ ۔ اس گھر کی خادمی ہے تمنائے جبرئیلؑ
شاگردیٔ علیؑ سے سرافراز جب ہوئے
جبرئیلؑ تب مقربِ درگاہِ رب ہوئے

آٹھوں بہشت باغِ ولایت کے پھول ہیں ہم سے ولا کرو کہ ہم آلِ رسولؐ ہیں
اعمالِ دشمنانِ علیؑ نا قبول ہیں روزے ہوں یا نمازیں ہوں سب بے اصول ہیں
پھر کیا ادا زکوٰۃ بھی گر حج سمیت کی
شرطِ قبولیت ہے ولا اہلبیت کی

عزت جہاں میں سب کو ہماری ولا نے دی کفار کو شکست شہِ لافتا نے دی
بیٹی نبیؐ نے تیغ دوسر کبریا نے دی کعبے سے بھی سوا ہمیں حرمت خدا نے دی
رتبہ بلند سب سے خدا کے ولی کا ہے
سجدے ہیں اس لئے کہ وہ مولد علیؑ کا ہے

کیوں ظالمو رسولؐ کا پیارا نہیں ہوں میں! کیوں عرشِ کبریا کا ستارا نہیں ہوں میں
کیوں مستحقِ لطف و مدارا نہیں ہوں میں کیوں جا بجا امام تمہارا نہیں ہوں میں
سید پہ ظلم کون سی یہ رسم و راہ ہے
کیا میہماں کو پانی کا دینا گناہ ہے

وہ نہر جس کو خلق میں جاری کرے اللہ روکی ہے تم نے ظلم کی تیغوں سے اس کی راہ
پانی پہ جنگ پیاسوں سے دریا پہ بغض آہ یہ کس ولی کا گھر تھا جسے کر دیا تباہ
سیراب گرگ و شیر ہوں اور اسپ و خر پئیں
اولادِ فاطمہؑ نہ پئے جا نور پئیں!

کھنچ کھنچ کے جائے ساری زراعت میں آب نہر محروم ابنِ ساقیٔ کوثر یہ کیا ہے قہر
اس میں یہ نہر بھی ہے جو ہے فاطمہؑ کا مہر شہرہ ہے تازیوں کی تواضع کا شہر شہر
امت نبیؐ کی آہ یہ سفاک ہو گئی
بس آج آبروئے فلک خاک ہو گئی

کرتا ہے پاسداریٔ مہماں ہر اک بشر ملتے ہیں اُس سے جھک کے جو آتا ہے اپنے گھر
عاجز بھی لا کے سامنے رکھتا ہے ماحضر فاقہ ہے تیسرا ہمیں اور تم ہو بے خبر
بُستانِ فاطمہؑ میں ہوا یہ بُری چلے
پانی طلب کریں تو گلے پر چھری چلے

سُن کر بیانِ شاہ فصیحوں نے سر جھکائے کتنوں نے پھیر پھیر کے مُنہ اشک بھی بہائے
اکثر صفوں میں شور یہ اُٹھا کہ ہائے ہائے کیوں ہم رسولِ حق کے نواسے سے لڑنے آئے
خم کر کے گردنیں عمرو شمر ٹل گئے
فولاد موم ہو گیا پتھر پگھل گئے

نوفل سے بڑھ کے یہ پسرِ سعد نے کہا ہاں جلد حکم دے کہ بجیں طبل جا بجا
ہو سب صفوں میں نالۂ شہنا کا غُل بپا تا فوج میں سُنے نہ کوئی شاہ کی صدا
مظلومیٔ حسینؑ پہ دل ٹکڑے ہوتے ہیں
انساں کا ذکر کیا ہے کہ گھوڑے بھی روتے ہیں

امام حسینؑ کا جہاد

ناگہ بجے جلاجل و قرنا و طبل و دَف خاموش ہو گئے شہِ مظلوم اِس طرف
چلّوں میں تیر جوڑ کے بڑھنے لگی جو صَف اُگلی ادھر نیام سے تیغِ شہِ نجف
بھاگو ہٹو بچو یہ صدا دی سپاہ نے
باہر سے منہ نکالا ہے مارِ سیاہ نے

تیغِ دو سَر کو روک کے حضرت نے یہ کہا بیکس سے کس طرح تمہیں منظور ہے وغا
آؤ عرب کی طرح جو ہے قصدِ جنگ کا سب مل کے گر لڑو تو پھر اس میں ہے دیر کیا

دنیا سے وقتِ عصر گذرنا ہے ہر طرح

حاضر میں ہر طرح ہوں کہ مرنا ہے ہر طرح

سر کو نہ سر نہ جان کو ہم جاں سمجھتے ہیں   ہاں حکمِ کردگار کو ایماں سمجھتے ہیں

مشکل ہزار ہو اُسے آساں سمجھتے ہیں   ہم ایک اور لاکھ کو یکساں سمجھتے ہیں

اس معرکے میں کھیت پڑے ہیں اِسی طرح

بچّے ہمارے تم سے لڑے ہیں اِسی طرح

لڑتا نکل کے ایک سے گر ایک نامدار   برسوں بھی تم سے ختم نہ ہوتی یہ کارزار

نکلا اِدھر سے ایک اُدھر سے بڑھے ہزار   اس پر بھی الاماں کا غُل اُٹھتا تھا بار بار

بے دیں کا ساتھ دے کے حمیّت کو کھو دیا

تم نے تو آج نام عرب کا ڈبو دیا

یہ ذکر تھا کہ تیر چلے اُس سپاہ سے   گیتی کو زلزلہ ہوا زہراؑ کی آہ سے

پھر ضبط ہو سکا نہ شہِ دیں پناہ سے   بجلی گری صفوں پہ غضب کی نگاہ سے

چمکی علیؑ کی تیغ جو دشتِ مصاف میں

پریاں چھپیں جزیروں میں سیمرغ قاف میں

کاٹھی سے اس طرح ہوئی تیغِ دو سر جُدا   جیسے سوادِ شب سے بیاضِ سحر جُدا

نصرت کا آئینہ تھا جُدا اور گہر جُدا   محمل جُدا تھا لیلیٰ فتح و ظفر جُدا

تیغ کشیدہ دستِ شہِ بحر و بر میں ہے

طومار ہاتھ میں ہے لفافہ کمر میں ہے

ناگاہ رن میں تیغِ شہِ لافتےٰ چلی   گویا صفوں پہ کھولے ہوئے منہ بلا چلی

رن میں سمومِ قہر و عتابِ خدا چلی   جھونکوں سے جس کے اُڑتے ہیں مرغِ ہوا چلی

آواز الاماں کی سپہرِ بریں پہ تھی
بڑھ کر جو یوں بھرے صفِ اوّل تہِ تیغ تھی (جب نوجواں پسر...)

وہ تیغ تیز جب صفِ ثانی سے ہل گئی
خفّت ہر اک کو اُس کی گرانی سے مل گئی
لذت چھُری کی تیز زبانی سے مل گئی
دریا کی باڑھ گھاٹ کے پانی سے مل گئی
چمکی جو سر پہ برق تو بے فرق ہو گئے
دریا میں خوں کے تا بہ کمر غرق ہو گئے (جب خاتمِ خیبر ہوا....)

ملتی تھی جائے امن نہ زیرِ فلک کہیں
غل تھا کہ مل نہ جائیں سما و سمک کہیں
جنّات بے حواس کہیں تھے ملک کہیں
سایہ کہیں تھا تیغ کہیں تھی چمک کہیں
پانی سے جل بجھا تھا کوئی کوئی نار سے
گرتی تھیں تین بجلیاں اک ذوالفقار سے (جب نوجواں پسر...)

کھا کھا گئی صفوں کو جدھر آئی ذوالفقار
گر چھپ گئی تو گاہ نظر آئی ذوالفقار
سر پر چمک کے تا بہ کمر آئی ذوالفقار
زیں کاٹ کر زمیں پہ اتر آئی ذوالفقار
یوں صبرِ پنجتن میں گرفتار ہو گئے
اک جوش میں سوار و فرس چار ہو گئے

وہ منہ کہ الحذر وہ روانی کہ الاماں
وہ گھاٹ الحفیظ وہ پانی کہ الاماں
وہ دم وہ خم وہ تیز زبانی کہ الاماں
وہ دل شکن وہ دشمنِ جانی کہ الاماں
نازاں کے سب کو بھائے کرشمے بھلے لگے
چھوڑے نہ بے لہو پئے جس کے گلے لگے

تھی دست گاہ خاص اُسے قتلِ عام میں
بے دم ہوا جو آ گیا جوہر کے دام میں
کس کس ادا سے چلتی تھی وہ فوجِ شام میں
دونوں زبانیں ایک سی تھیں اپنے کام میں

کیا بس چلے کسی کا ہوا جب بُری چلے
چلتی تھی یوں گلوں پہ کہ جیسے چُھری چلے (جب خاتمہ بخیر ہوا ...)

یکتا بَرِش میں جوہرِ ذاتی میں قدر میں　　چمکی اُحد میں خیبر و خندق میں بدر میں
تیزی وہی تھی مُنہ کی اس آشوب و غدر میں　　چل کر سپر سے سر میں گئی سر سے صدر میں
کھینچے ہوئے کمر سے نیا رنگ ڈھنگ تھا
راکب تھا نہ فرس تھا نہ زیں تھا نہ تنگ تھا (جب نوجواں پسر...)

غل شش جہت میں تھا کہ نہ اس سے دوچار ہو　　بھاگو کہیں یہ برق نہ پھر شعلہ بار ہو
کون اس کے منہ پہ جا کے اجل کا شکار ہو　　جو ایک ہے وہ دو ہو جو دو ہے وہ چار ہو
بھاگیں کہ ان صفوں کو ہم آراستہ کریں
مہلت جو تیغ دے تو دم آراستہ کریں (جب نوجواں پسر...)

وہ فوج کا ہجوم وہ گرمی وہ لُو وہ بَن　　دریا پہ شیر ہانپتے تھے دشت میں ہرن
بھڑکی تھی آگ جل رہے تھے ناریوں کے تن　　مثلِ صدف تھے زخم بھی کھولے ہوئے دہن
ڈوبا تھا وہ پسینے میں جو سینہ زور تھا
فوجوں میں ذوالفقار کے پانی کا شور تھا

ابتر صفیں تھیں کینہ وروں کی اِدھر اُدھر　　جانیں ہوا تھیں فتنہ گروں کی اِدھر اُدھر
چھائی تھی اک گھٹا سپروں کی اِدھر اُدھر　　بوچھار تھی زمیں پہ سروں کی اِدھر اُدھر
غل تھا اتر ہے گھاٹ میں دریا کی باڑھ کا
برسا ہے لطف تپ کے مہینہ اساڑھ کا

کاٹا سرِ اِس کا اُس کا جگر چاک کر دیا　　بجلی کو اور آگ نے چالاک کر دیا
جس پر گری جلا کے اُسے خاک کر دیا　　قصہ جو دین و کفر میں تھا پاک کر دیا

شرما کے شرک و کفر نے سر کو فرو کیا
اسلام شاد تھا کہ مجھے سرخرو کیا (جب خاتمہ بخیر ہوا...)

مانندِ برق تیغ کا سایہ جدھر گرا — بیٹے پہ باپ باپ پہ مر کر پسر گرا
یہ ہاتھ اِس طرف تو وہ بازو اُدھر گرا — پرکالے اُڑ گئے وہ سپر کے وہ سر گرا
قبضے میں اب ہے تیغ نہ دستانے ہاتھ میں
کیوں دے دیا تھا ہاتھ کو بیگانے ہاتھ میں

سرکش ہوا پہ جو تھے وہ سب گرد ہو گئے — سُرخی رُخوں سے اُڑ گئی منہ زرد ہو گئے
دعوائے مردمی تھا پہ نامرد ہو گئے — ہنگامہ جن سے گرم تھا وہ سرد ہو گئے
مرنے پہ بھی نصیب کی سوزش نہ جائے گی
اب ناریوں کو آتشِ دوزخ جلائے گی

غل تھا کہ وہ چمکتی ہوئی آئی یہ گری — برچھی سے اُڑ گئی وہ سناں یہ گرہ گری
ترکش کٹا کمانِ کیانی سے زہ گری — یہ سر گرا وہ خود گرا یہ زرہ گری
آتی ہے لشکروں پہ تباہی اسی طرح
گرتی ہے برقِ قہرِ الٰہی اسی طرح

وہ شام و روم کے قدر انداز بے نظیر — سہواً نہ چوکتا تھا نشانے سے جن کا تیر
ہر صف میں سہم سہم کے ہوتے تھے گوشہ گیر — چلّاتے تھے کہ موت کے حلقے میں ہیں اسیر
لیجے قسم اگر کبھی لشکر کشی کریں
سر کاٹ ڈالئے گا جو اب سرکشی کریں

مشّاق ساٹھ ساٹھ برس کے وہ تیر دست — چلّہ نہ سوجھتا تھا اُنھیں آنکھ سے نہ شست
بے سر تھے وہ کبھی با وہ نخوت سے جو تھے مست — غارت تھے مثلِ تیر ہوائی ہوا پرست

ترکش دو نیم ہو گئے زہ گیر کیا کرے
چلّہ نہ ہو کماں پہ تو پھر تیر کیا کرے (جب نوجواں پسر...)

اللہ رے جنگ میں شہِ ذیقدر کی شکوہ — جس جا قدم جمے نہ ہٹے پھر مثالِ کوہ
قہرِ خدا تھی برہمیٔ طبعِ حق پژوہ — بے خوفِ جاں نہ تھا کوئی مجمع کوئی گروہ
حملوں میں ساری شان خدا کے ولی کی ہے
فوجوں میں شور تھا یہ لڑائی علی کی ہے

ساعد سے کچھ بلند جو کر لی تھی آستیں — فانوس سے بڑھا ہوا تھا نورِ شمعِ دیں
نعرے نہ تھے کہ گونجتا تھا شیرِ خشمگیں — جنبش میں آسمان تزلزل میں تھی زمیں
دستِ علیؑ تھے ہاتھ حسینِ دلیر کے
قبضے میں انگلیاں تھیں کہ ناخن تھے شیر کے (جب خاتمہ بخیر ہوا...)

باطل کو حق سے خیر کو شر سے جدا کیا — ظلمت کو دن سے شب کو سحر سے جدا کیا
یوں کفر و دیں کو تیغ دو سر سے جدا کیا — گویا کلف کو روئے قمر سے جدا کیا
ٹکڑے اڑائے دم میں سپاہِ شریر کے
قربان ذوالفقارِ جنابِ امیرؑ کے

اللہ ری شان واہ رے حملے جناب کے — خاک اڑ گئی جدھر گئے گھوڑے کو داب کے
دکھلا دیئے وغا میں چلن بوترابؑ کے — قزاک تھے کہ پر فرسِ لاجواب کے
پتلی جدھر سوار نے پھیری وہ مڑ گیا
اترا براق بن کے پری ہو کے اڑ گیا (جب نوجواں پسر...)

حیرت میں یکہ تاز تھے سب شام و روم کے — پھرتی تھی برق گرد قدم چوم چوم کے
سیر اس کی دیکھتے تھے تماشا نجوم کے — پھرتا تھا اس ہجوم میں کیا جھوم جھوم کے

حیراں سیاہ گوش تو چیتے خموش تھے
شیروں میں جان تھی نہ چکاروں میں ہوش تھے

جم کر اِدھر اُڑا اُدھر اُترا وہ جا پڑا نکلا اُدھر صفوں سے وہ پلٹا یہ آپڑا
جب اُس پہ رَو میں سایۂ زلفِ دوتا پڑا سمجھا کہ تازیانۂ موجِ ہوا پڑا
تسمہ ہر اک جو باگ کا تھا ناگ ہو گیا
آنکھیں اُبل پڑیں یہ مزاج آگ ہو گیا

گرما کے سب رگوں میں لہو دوڑنے لگا فرفر کی دونوں نتھنوں سے آنے لگی صدا
اُٹھنے لگے زمین پہ جم جم کے دست و پا غصہ کہ مجھ تک آکے کہاں رہ گئی ہوا
نزدیک تھا کہ پھاند کے ندی کے پار ہو
روکے وہی حسینؑ سا جو شہسوار ہو

آہو کی آنکھ شیر کی چتون غضب کی چال وہ یال تھی کہ حور نے بکھرا دیے تھے بال
گردن کے خم کو دیکھ کے ہو سرنگوں ہلال پوچھے کوئی سوار سے شائستگی کا حا[ل]
اُڑ کر زمیں تلک کبھی گردِ قدم گئی
جب بس کہا چمکتی ہوئی برق تھم گئی

خوش خو و خوش خرام و خوش اندام و خوش لگام خوش رو و خوش جمال و دانش و تیز گام
جانداروشوخ چشم و سعید و خجستہ گام گل پوش و تیز ہوش و سمن گوش و سرخ فا[م]
غازی تھا سرفراز تھا عالی دماغ تھا
گویا ہوا کے دوش پہ اک زندہ باغ تھا

چالاکیاں بھی غیظ بھی غیرت بھی جنگ بھی بالا دوی بُراق کی دُلدل کا ڈھنگ
بن میں اسد بھی بحرِ وغا میں نہنگ بھی گھوڑا بھی شیر نر بھی ہرن بھی پلنگ.

ہے آگ کا مزاج تو سرعت ہوا کی ہے
اضداد اتنے جمع ہیں قدرت خدا کی ہے

وہ ساز اور وہ زینِ مرصع کی زیب و زین
اُس میں ہوا میں ارض و سما کا تھا فرق و بین
کلغی سے سر کی صاف عیاں فرّ فرقدین
سینے میں دل قوی تھا کہ ہیں پشت پر حسینؑ
دعویٰ کہ میں بُراق کی توقیر پائے ہوں
ناز اس پہ ہے کہ بارِ امامت اُٹھائے ہوں

چھوٹی چھوٹی گاؤ میاں گول گول سُم
سرعت وہ تھی کہ عقل تھی یونانیوں کی گُم
طاؤس کی طرح جو وغا میں چنور تھی دُم
آتی تھی آسماں سے ندا مدِ ظلّہم
پھرنا تجھے نصیب ہو راہِ ثواب میں
قائم یہ دونوں پاؤں رہیں اس رکاب میں

گشت اور وہ اس کے طرارے وہ آؤ جاؤ
پانی پہ گر حباب تو آبِ رواں پہ ناؤ
گھونگھٹ میں دیکھ پائے اگر چال کا بناؤ
دولھا کے دل میں پھر نہ رہے کچھ دلہن کی چاؤ
دعویٰ غلط خرام میں کبکِ دری کا ہے
اس بادپا کے سائے میں جلوہ پری کا ہے

گھوڑے سے بھی بڑھی ہوئی تھی تیغِ آبگوں
جب ہاتھ اُٹھا تو قبضے سے ٹپکا زمیں پہ خوں
ہلی ہوئی صفوں میں نشاں سب تھے سرنگوں
دہشت سے زرد تھا ابنِ سعدِ سیہ دروں
اک شور تھا جو لہر ہے اس کی وہ ناگ ہے
گھوڑے بھگاؤ تیغ کے پانی میں آگ ہے (جب خاتمہ بخیر ہوا …)

معرکے میں یا وہ مشکلکشا رہی
سیّد سے کربلا میں نہ دم بھر جُدا رہی
وہ اس کی ابتدا تھی وہی انتہا رہی
عاشق رہی پدر پہ پسر پہ فدا رہی

یکتا تھی ذوالفقار یہ قطعی دلیل ہے
جو تیغ دونوں باگیں کسے وہ اصیل ہے

ڈوبیں تنوں کے جسم کے ٹکڑے اُڑا دیئے ... ہاتھوں کو کاٹ کاٹ کے پُرزے اُڑا دیئے
گردن بچی کسی کی تو شانے اُڑا دیئے ... پہونچا جو سر پہ ہاتھ تو پہنچے اُڑا دیئے

او چھا بھی وار گر کسی دشمن کو لگ گیا
تن جا رہا تڑپ کے الگ سر الگ گیا

دل کانپتے تھے دیکھ کے اُس کج ادا کا مُنہ ... نا ہیں قضا کی راہ تو قبضہ قفس کا مُنہ
اژدر کے منہ سے کم نہ تھا اُس جاں گزا کا مُنہ ... آفت کی چال قہر کی گرمی بلا کا مُنہ

پہونچے یہ واں اجل کا بھی جس جا گذر نہ ہو
لوہے کو کھائے یوں کہ زباں کو خبر نہ ہو

سر سے جدا تھے خود تو سر تھے جبیں سے دُور ... قبضوں سے تیغیں دُور تھیں ہاتھ آستیں سے دُور
جاں جسم سے تو جسم تھے جانِ حزیں سے دُور ... کار دکیں مکاں سے مکاں تھے مکیں سے دُور

اُس تیغِ جاں ستاں سے فقط سرقلم نہ تھے
اللہ رے تفرقہ کہ عناصر بہم نہ تھے

ہر سو پڑے تھے خاک پہ اعضا جُدا جُدا ... سر گردنوں سے جسم سے تھے دست و پا جُدا
ایذا جُدا تھی روح پہ قہرِ خدا جُدا ... پانی جُدا تھا خاک جُدا تھی ہوا جُدا

پیدا ہوئے تھے نار میں جانے کے واسطے
اک آگ رہ گئی تھی جلانے کے واسطے

حملہ جو پیدلوں پہ کیا شہسوار نے ... ڈر ڈر کے سب قدم پہ رکھے سر اُتار نے
چھوڑا نہ صید ضیغم آہو شکار نے ... زندوں کو چُن کے ذبح کیا ذوالفقار نے

کہتی تھی گرچہ پیٹ کا بھرنا محال ہے
ہاں پی لو جو بھر کے لہو یہ حلال ہے

رن کی زمیں کو خون کا دریا بنا دیا — ہر جزوِ تن کو لایتجزیٰ بنا دیا
نیزوں کو کاٹ کاٹ کے تودا بنا دیا — دو ٹانک کی کماں کو کباوا بنا دیا
دیتے تھے تیر کٹ کے صدا الاماں کی
پتّوں کی طرح اُڑتی تھیں شاخیں کماں کی

ڈھالوں پہ آئی نیزوں کو جب دیکھ بھال کے — پھل بھی لگا نہ تھا کہ گرے پھول ڈھال کے
تھرائے تیر ڈر سے شہِ خوش خصال کے — تیغیں اماں طلب ہوئیں دندان نکال کے
وہ منہ کے بھل پڑے تھے جو بھالے اُٹھائے تھے
دستِ اماں کو برچھیوں والے اُٹھائے تھے

تھی شعلہ ور جو آتشِ شمشیرِ آب گوں — جل جل گئے تھے اہلِ جفا کے دروں بروں
زہرے تھے آب آب جگر ہو گئے تھے خوں — تھیں بیرقیں یزید کے لشکر کی سرنگوں
نوبت یہ پہونچی تھی کہ علم کا نشاں نہ تھا
حیدر کی ذوالفقار کا ڈنکا کہاں نہ تھا

کیا لشکرِ یزید پہ رنج و محن پڑا — طالع جو نحس تھے تو انھیں پر گہن پڑا
شہ پہ لاشہ سر پہ سر اور تن پہ تن پڑا — کہتی تھی موت بھی کہ قیامت کا رن پڑا
اوپر تلے جو کشتوں کے انبار پاتی تھی
گنتی کو بار بار اچھل بھول جاتی تھی

کشتے تڑپ رہے تھے برابر زمین پر — زندہ تھے خوفِ قتل سے مضطر زمین پر
لی جوشن سے تیغِ دو پیکر زمین پر — گردن نے دھڑ سے پھینک دیا سر زمین پر

سُلطانِ دیں کے پاؤں پہ سر کٹ کے گر پڑا
تن مارے ڈر کے چند قدم ہٹ کے گر پڑا

ہر چند ساری فوج پہ ڈھالوں کی آڑ تھی — بھاری تھی ضرب یہ کہ لڑائی پہاڑ تھی
غلبہ تھا دیں کا کفر کی بستی اُجاڑ تھی — میدان مار یہ میں عجب مار دھاڑ تھی
ڈر ڈر کے منہ سے زہر سبھوں نے اُگل دیئے
گھوڑے کے سُم نے موذیوں کے سر کچل دیئے

تلواریں پیچ و تاب سے بل کھا کے رہ گئیں — پھل یوں اُڑے کہ برچھیاں تھرا کے رہ گئیں
سہمے جو دل کمانیں بھی چلّا کے رہ گئیں — چشمِ زرہ کی پُتلیاں پتھرا کے رہ گئیں
ڈھالوں کے رنگ خوف سے کافور ہو گئے
چار آئینوں کے شیشۂ دل چُور ہو گئے

چھوٹیں کمانیں قبضوں سے اور چٹکیوں سے تیر — کیسی لڑائی سہمے ہوئے تھے جوان و پیر
عاری تھے تیغ زن قدر انداز گوشہ گیر — اپنے لہو میں لوٹتے پھرتے تھے خود شریر
لشکر پہ زخموں کا جو پامال ہو گیا
مارے خوشی کے تیغ کا منہ لال ہو گیا (رطب اللساں ہوں ...)

قاصر تھے اُن کے عزم جو تھے بانیٔ فساد — رشتے تھے قطع اُٹھ گیا تھا اُنس و اتحاد
ہر دم اشارہ کرتی تھی تیغِ ظفر نہاد — سب مجھ کو سرگزشتِ جہادِ علیؑ ہے یاد
ٹکڑے کیا ہے عمرے نامی نہنگ کو
جھیلے ہوئے ہوں خندق و خیبر کی جنگ کو

اللہ رے رعب نعرۂ مولائے خوش خصال — لرزاں تھیں برچھیاں قدم پیر کی مثال
لپٹی ہوئی تھیں پشت سے ڈھالوں کا تھا یہ حال — تیغوں کے جوہروں سے کھڑے ہو گئے تھے بال

گوشوں کو ڈھونڈتی تھیں کمانیں مصاف میں
خنجر بھی منہ چھپائے ہوئے تھے غلاف میں

افتادہ تھے زمیں پہ نشاں ہائے سربلند — لاشوں سے راہِ امن واماں ہوگئی تھی بند
تھراتے تھے جو ڈر سے لعینوں کے بند بند — پرچم علم کے کرتے تھے اعدا پہ ریش خند
جب سہم سہم کر قدر انداز روتے تھے
سوفار کے ہنسی سے نہ لب بند ہوتے تھے

کاری جواں سپاہ کے ناکارہ ہوگئے — پانچوں حواس سبعۂ سیارہ ہوگئے
ٹکڑے کٹی کمانوں کے آوارہ ہوگئے — پیکانِ تیر غنچۂ صد پارہ ہوگئے
سرکی وہ جب کہ برچھیوں سے پھل گرالئے
خنجر تو کیا تھے تیغوں نے بھی منہ پھرا لئے (جب خاتمہ بخیر ہوا ...)

ظلمت سے نور نور سے ظلمت جدا ہوئی — وحدت سے ایک ضرب میں کثرت جدا ہوئی
دینِ مبیں سے کفر کی بدعت جدا ہوئی — ایماں کے راستے سے ضلالت جدا ہوئی
اس دبدبے سے زیر کیا روم وشام کو
حکمِ جہاد پھر نہ ہوا تو امام کو

اللہ رے تلاطمِ افواجِ روسیاہ — ٹکراتے تھے پہ ملتی نہ تھی بھاگنے کی راہ
غل تھا پناہ دے ہمیں اے آسماں پناہ — اُمت رسولِ پاک کی ہوتی ہے اب تباہ
بخشو خطا یہ کام ہے مولا ثواب کا
صدقہ محمدِ عربی کی جناب کا

اُس شور میں سُنا جو رسولِ خدا کا نام — پڑھ کر درود آپ نے بس روک لی حسام
فرمایا خیر تم سے خدا لے گا انتقام — عاجز نہیں یہ بیکس ومظلوم وتشنہ کام

کیا چیز سر ہے بات پہ ہم لوگ مرتے ہیں
دیکھو اِس اختیار پہ یوں صبر کرتے ہیں

چرخ و نجوم و شمس و قمر شہر و دشت و در ‎ ‎ سنگ و معادن و صدف و قطرہ و گہر
اشجار و شاخ و برگ و گل و غنچہ و ثمر ‎ ‎ رکن و مقام و باب و منا' زمزم و حجر

جن و ملک ہیں انس ہیں غلمان و حور ہیں
کہہ دیں یہ سب ابنِ علیؑ بے قصور ہیں

میں کیا لڑوں گا غم سے لہو ہے مرا جگر ‎ ‎ آنکھوں کے آگے خاک پہ ہے لاشۂ پسر
بازو کے غم میں ٹوٹ گئی ہے مری کمر ‎ ‎ سر ہو یہ مرحلہ جو کٹے تن سے جلد سر

حسرت ہے یہ کہ تیغوں سے تن پاش پاش ہو
جب ذبح ہوں تو پہلوئے اکبر میں لاش ہو (جب نوجواں پسر...)

فاقے میں دیر تک جو لڑے شاہِ تشنہ کام ‎ ‎ غرقِ عرق تھے کانپ رہا تھا بدن تمام
ہاتھوں سے چھوڑ دی تھی جو رہوار کی لگام ‎ ‎ آنکھیں تھیں بند ہانپتا تھا اسپ تیز گام

غش میں سوارِ دوشِ نبیؐ کا یہ حال تھا
بے تھامے خود فرس سے اُترنا محال تھا (جب خاتمہ بخیر ہوا.....)

داغِ جگر سوا کوئی دلسوز تھا نہ آہ ‎ ‎ جُز بیکسی جلو میں نہ تھا کوئی خیر خواہ
چترِ زری لگائے تھا واں شمرِ روسیاہ ‎ ‎ یاں دھوپ میں کھڑا ہوا تھا فاطمہ کا ماہ

قطرے عرق کے گرتے تھے رُخِ جناب سے
شبنم ٹپک رہی تھی گُلِ آفتاب سے

وہ لُو وہ گرد اور وہ صحرائے لق و دق ‎ ‎ تھے دوپہر کی دھوپ سے مولا عرق عرق
تیغِ غمِ پسر سے جگر ہو گیا تھا شق ‎ ‎ دل کو جوانیٔ علی اکبر کا تھا قلق

اطفال شور کرتے تھے جس وقت پیاس سے
گھبرا کے تکنے لگتے تھے خیمہ کو پاس سے (آیا زوال رن میں...)

شہادتِ علی اصغرؑ

راوی نے یہ لکھا ہے کہ اُس دم بحالِ زار — لائے حسینؑ ہاتھوں پہ اک طفلِ شیر خوار
دن کو ہوا قرانِ مہ و مہر آشکار — مرجھا گیا تھا پیاس سے لیکن وہ گلعذار
تھا فرطِ غش سے ننھا سا منکا ڈھلا ہوا
باندھے ہوئے تھا مٹھیاں منہ تھا کھلا ہوا

پھیلا ہوا وہ آنکھوں میں کاجل اِدھر اُدھر — خشکیدہ ہونٹ موئے مژہ آنسوؤں سے تر
باچھوں سے تھا نمود جیسے دودھ کا اثر — ہاتھوں میں نیلے ڈورے تھے ہیکل تھی سینے پر
ننھے سے دل کو ماں سے بچھڑنے کا درد تھا
رن کی ہوائے گرم سے جسم اُس کا سرد تھا

مہکی ہوئی تھی دشت میں گل سے بدن کی بُو — اُن گورے گورے گالوں میں تھی یاسمن کی بو
شہ سونگھتے تھے دودھ بھرے اُس دہن کی بُو — گویا لبوں سے آتی تھی نہرِ لبن کی بُو
آثارِ مرگ پھول سے رُخ پہ نمود تھے
ہچکی لگی ہوئی تھی مسوڑے کبود تھے

صدمے سے پیاس کے رُخِ معصوم تھا جو زرد — حضرت فلک کو دیکھتے تھے بھر کے آہِ سرد
ہچکی جب اُس کو آتی تھی اُٹھتا تھا دل میں درد — آنسو رواں تھے آنکھوں سے رُخ پر جمی تھی گرد
پانی کی جستجو تھی شہِ خوش صفات کو
تکتے تھے چشمِ یاس سے نہرِ فرات کو

جاری یہ لب پہ تھا کہ نہ آیا تجھے حجاب	اے نہر مر گئے مرے بچے بغیر آب
دو دن سے خشک ہے چمنستانِ بوتراب	محشر میں دے گی ساقیٔ کوثر کو کیا جواب

سیراب سب چرند و پرند اور پیاسے ہم
شکوہ ترا کریں گے رسولِ خدا سے ہم

یہ کہہ کے شامیوں کو صدا دی بچشمِ تر	کہنا ہے کچھ مجھے عمرِ سعد ہے کدھر
نکلا یہ سن کے فوج سے ظالم بکرّ و فر	پہنے لباسِ فاخرہ باندھے ہوئے کمر

خادم بھی ساتھ ہاتھ میں عصے لئے ہوئے
اور ایک شخص چتر کا سایہ کئے ہوئے

بولے دکھا کے بچے کو شاہِ فلک سریر	مرتا ہے پیاس سے یہ مرا کودکِ صغیر
پانی ملا ہے کل سے نہ ممکن ہوا ہے شیر	للہ اس غریب پہ کر رحم اے امیر

مہماں ہے کوئی آن کا ہونٹوں پہ جان ہے
اس کا قصور کیا ہے کہ یہ بے زبان ہے

برپا ہے اہلبیتِ محمدؐ میں شور و شین	در پہ پھوپھی بلکتی ہے ماں کر رہی ہے بین
آنکھیں پھرائے دیتا ہے اب تو یہ نورِ عین	لایا ہے اس عطش میں ترے پاس اِن کو حسینؑ

تجھ کو قسم ہے روحِ رسالت مآبؐ کی	[لہ اب]
ٹپکا دے اس کے حلق میں اک بوند آب کی

یہ کہہ کے چپ ہوئے جو شہنشاہِ بحر و بر	دل دشمنوں کے ہل گئے تھرا گئے جگر
رویا جھکا کے سر پسرِ سعدِ خیرہ سر	فولاد موم ہو گیا اللہ رے اثر

مضطر تمام فوج کے پیر و جواں ہوئے
آنکھوں سے مرکبوں کی بھی آنسو رواں ہوئے

بولے یہ ابنِ سعد سے سردارِ فوجِ شام　　واللہ اے امیر یہ ہے رحم کا مقام
دیتے ہیں اُس کو آب جو کافر ہو تشنہ کام　　یہ بیکس و غریب تو سیّد ہے اور امام
کچھ شرم بھی ہے شرط مسلماں کے واسطے
دے حکم آب اصغرِ ناداں کے واسطے

تب ابن سعد شمر سے کرنے لگا کلام　　اصغر کو خود پلا دے تو پانی کا ایک جام
کہنے لگا بگڑ کے یہ وہ ... ...　　ہم کو نہیں ہے تابِ عتابِ امیرِ شام
پیاسا کریں گے ذبح ہم اس نونہال کو
پانی نہ دیں گے بانوئے بیکس کے لال کو

یہ کہہ کے ابن سعد کے کچھ کان میں کہا　　حضرت کے سامنے سے ہٹا تب وہ بے حیا
آنسو بہا کے کہنے لگے شاہِ کربلا　　سمجھا میں تیرے مکر کو اے بانیٔ جفا
خیر اب کچھ آرزو نہیں اس آبِ زشت کی
لہرا رہی ہیں سامنے نہریں بہشت کی

فرما کے یہ حسین چلے سوئے خیمہ گاہ　　گھوڑے بڑھا بڑھا کے ہوئی فوج سدِّ راہ
تنہا کماں کشوں میں گھرا فاطمہؑ کا ماہ　　جھپٹے اِدھر اُدھر یہ نہ پائی کہیں پناہ
چھایا ستم کا ابر شہِ نامدار پہ
تیروں کا مینہ برسنے لگا شیر خوار پہ

آئے جو ہر طرف سے شہِ بے جدو بہ پہ تیر　　تلوار سے قلم کئے رو کے سپر پہ تیر
غل تھا چلیں حسینؑ کے لختِ جگر پہ تیر　　آنے دیا نہ شاہ نے لیکن پسر پہ تیر
آنسو رواں تھے آنکھوں سے بچے کے حال پر
مثلِ کماں جھکے ہوئے تھے اپنے لال پر

پیہم پکارتے تھے شہِ آسماں جناب   یہ کیا خطا ہے روحِ نبیؐ سے کرو حجاب
منہ پھیرتے تھے سب کوئی دیتا نہ تھا جواب   نکلا پرے سے حرملۂ خانماں خراب
جلدی کماں میں جوڑ کے سرکش نے تیر کو
تاکا نگاہِ قہر سے حلقِ صغیر کو

کتنا بچایا شہ نے اجل سے نہ بس چلا   کڑکی اُدھر کمان اِدھر چھد گیا گلا
آنسو بھر آئے آنکھوں میں منکا جو ہیں ڈھلا   آنکھوں سے شہ نے آنکھیں ملیں منہ سے منہ ملا
جو حسرتیں تھیں دل میں قضا نے نکال دیں
ننھی سی باہیں باپ کی گردن میں ڈال دیں

اک آہ کر کے غش ہوئے سلطانِ بحر و بر   سینے میں فرطِ غم سے لہو ہو گیا جگر
رونے لگے صغیر کی صورت کو دیکھ کر   منہ رکھ دیا گلے جو ہوئے منہ پہ چشمِ تر
چوما گلا چھدا ہوا اُس نونہال کا
ملنے لگے جبیں پہ لہو اپنے لال کا

غصے سے حرملہ سے کہا یوں پکار کر   نازاں ہے تیر حلق پہ بچے کے مار کر
مجھ سے نکل کے جنگ اب اے نابکار کر   آتا ہوں ننھی لاش لحد میں اُتار کر
سینے پہ میرے تیر لگاتا تو غم نہ تھا
بچہ مرا یہ ناقۂ صالح سے کم نہ تھا

یہ کہہ کے ذوالفقار سے کھودی جو زمیں   ہاتھوں سے کی سپردِ لحد لاشِ نازنیں
تربت پہ منہ کو رکھ کے پکارے یہ شاہِ دیں   اب سوؤ خوب چین سے اے میرے مہ جبیں
تم یہ نہ جانیو کہ ہمیں چھوڑے جاتے ہیں
ہم بھی تمہارے پاس کوئی دم میں آتے ہیں

امام حسینؑ کا اعادۂ جنگ

یہ کہہ کے اُٹھے واں سے بحسرت امامِ پاک	رُخسار پر لگی تھی مزارِ پسر کی خاک
بازو سے خوں رواں تھا گریباں تھا چاک چاک	اعدا پہ کی نظر صفتِ شیرِ خشمناک
دل دشمنوں کے خنجرِ ابرو سے کٹ گئے
اُلٹی جو آستیں تو پرے سب اُلٹ گئے

نعرہ کیا تو رعد نے گردوں پہ کی فغاں	کھینچی جو تیغ برق پکاری کہ الاماں
اُٹھا جو ہاتھ کانپ گیا شیرِ آسماں	گردش جو دی تو سب تہ و بالا ہوا جہاں
طبقے زمیں کے روحِ امینؑ کے پروں پہ تھے
یاں سر پڑے تھے خاک پہ اور تن سروں پہ تھے (رطے کر چکے حسین جو.....)

قلب و جناح و میمنہ و میسرہ تباہ	گردن کشانِ اُمتِ خیر الوریٰ تباہ
جنباں زمیں صفیں تہ و بالا پرا تباہ	بے جان جسم روح مسافر سرا تباہ
بازار بند ہو گئے جھنڈے اُکھڑ گئے
فوجیں ہوئیں تباہ محلّے اُجڑ گئے

دشمن جو گھاٹ پر تھے وہ دھوتے تھے جاں سے ہاتھ	گردن سے سر الگ تھا جدا تھے نشاں سے ہاتھ
توڑا کبھی جگر کبھی چھیدا سناں سے ہاتھ	جب کٹ کے گر پڑیں تو پھر آئیں کہاں سے ہاتھ
اب ہاتھ دستیاب نہیں مُنہ چھپانے کو
ہاں پاؤں رہ گئے ہیں فقط بھاگ جانے کو

اللہ رے خوف تیغِ شہِ کائنات کا	زہرہ تھا آب خوف کے مارے فرات کا
دریا پہ حال یہ تھا ہر اک بد صفات کا	چارہ فرار کا تھا نہ یارا ثبات کا

غل تھا کہ برق گرتی ہے ہر درع پوش پر
تھا گو خدا کے قہر کا دریا ہے جوش پر (حبیب قطع کی مسافت…)

لرزہ تھا تحت و فوق و جنوب و شمال میں — سکانِ غرب و شرق تھے بیم و زوال میں
مضطر تھے شش جہت کے مکیں ایک حال میں — غل تھا کہ گھر گئے غضبِ ذوالجلال میں
شہ کا غضب نمونۂ قہرِ الٰہ تھا
تلوار کیا علم تھی کہ عالم تباہ تھا

راحت میں جن و انس و ملک کی خلل پڑے — قلزم میں ڈر کے مردمِ آبی اچھل پڑے
کھا کھا کے جوش خاک سے چشمے ابل پڑے — بیر العلم سے غول جنوں کے نکل پڑے
الٹی زمیں سبھوں کے دلوں پہ یہ ٹھن گئی
پریوں کے ہوش اڑ گئے جانوں پہ بن گئی

اٹھا جو الحفیظ کا روحانیوں میں شور — مردے دہل کے چونک پڑے سب میانِ گور
چلائے گرگ و شیر و غزالان و مار و مور — ہے بازوئے حسینؑ میں دستِ خدا کا زور
الٹے ہیں مثلِ شیرِ خدا آستین کو
اے کردگارِ عرش بچالے زمین کو

جنگل میں تھی علم جو وہ تیغِ شرر فشاں — تھرا کے آسمان میں چھپتا تھا آسماں
غار اژدروں سے چھٹ گئے شیروں سے نیستاں — برپا تھا بر و بحر میں اک شورِ الاماں
مانندِ موج مچھلیوں کو اضطراب تھا
زہرہ ہر ایک سنگ کا پانی میں آب تھا

گھڑیال زیرِ آب تھے مضطر ادھر ادھر — جاگہ پناہ کی کہیں ملتی نہ تھی مگر
تھی مچھلیوں کے چہروں پہ گرداب کی سپر — بری میانِ بحر تھے بحری میانِ بر

گھر چھٹ گئے تھے جانوروں کے یہ رنگ تھے
خشکی میں تھے نہنگ تری میں پلنگ تھے (نکلی جو رن میں تیغ...)

پس پس کے کشمکش میں کمان دار مر گئے
چلّے تو سب چڑھے رہے بازو اُتر گئے
گوشے کٹے کمانوں کے تیروں کے پَر گئے
مقتل میں ہو سکا نہ گذارا گذر گئے
دہشت سے ہوش اُڑتے ہوئے تھے مرغِ وہم کے
سوفار کھول دیتے تھے منہ سہم سہم کے

تیر افگنی کا جن کی ہر اک شہر میں تھا شور
گوشہ کہیں نہ ملتا تھا اُن کو سوائے گور
تاریک شب میں جن کا نشانہ تھی چشمِ مور
لشکر میں خوفِ جاں نے انھیں کر دیا تھا کور
ہوش اُڑ گئے تھے فوجِ ضلالت نشان کے
پیکاں میں زہ کو رکھتے تھے سوفار جان کے

صف پر صفیں پروں پہ پرے پیش و پس گرے
اسوار پر سوار فرس پر فرس گرے
اُٹھ کر زمیں سے پانچ جو بھاگے تو دس گرے
مُخبر پہ پیک پیک پہ مرکز عسس گرے
ٹوٹے پرے شکستِ بنائے ستم ہوئی
دنیا میں اس طرح کی بھی اُفتاد کم ہوئی

غصّے تھا شیرِ شرزہٗ صحرائے کربلا
چھوڑے تھے گرگ منزل و ماوائے کربلا
تیغِ علیؑ تھی معرکہ آرائے کربلا
خالی نہ تھی سروں سے کہیں جائے کربلا
بستی بسی تھی مردوں کی قریے اُجاڑ تھے
لاشوں کی تھی زمین سروں کے پہاڑ تھے

غازی نے رکھ لیا تھا جو شمشیر کے تلے
تھی طرفہ کشمکش فلکِ پیر کے تلے
چلّے سمٹ کے جاتے تھے زہ گیر کے تلے
چھپتی تھی سر جھکا کے کماں تیر کے تلے

اس تیغِ بیدریغ کا جلوہ کہاں نہ تھا
سمجھے تھے سب یہ گوشۂ امن و اماں نہ تھا

چاروں طرف کمانِ کیانی کی وہ ترنگ
رہ رہ کے ابرِ شام سے وہ بارشِ خدنگ
وہ شورِ صیحۂ فرسِ ابلق و شرنگ
وہ لوں وہ آفتاب کی تابندگی وہ جنگ
پھنکتا تھا دشتِ کیں کوئی دل تھا نہ چین سے
اُس دن کی تاب و تب کوئی پوچھے حسینؑ سے

آبِ رواں سے مُنہ نہ اُٹھاتے تھے جانور
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر
خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر چشم سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

شیر اُٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے
آہو نہ مُنہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے
گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھُن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گماں
انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
مُنہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں
تہ پر تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب و تب کی تاب
چھپنے کو برق چاہتی تھی دامنِ سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب
کافورِ صبح ڈھونڈھتا پھرتا تھا آفتاب

بھڑکی تھی آگ گنبدِ چرخِ اثیر میں
بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر میں

اس دھوپ میں کھڑے تھے اکیلے شہِ زمن   نہ دامنِ رسولؐ تھا نہ سایۂ علم
شعلے جگر سے آہ کے اٹھتے تھے دم بدم   اودے تھے لب زبان میں کانٹے کمر میں خم
بے آب تیسرا تھا جو دن میہمان کو
ہوتی تھی بات بات میں لکنت زبان کو

گرمی میں پیاس تھی کہ پھنکا جاتا تھا جگر   اُف اُف کبھی کہا کبھی چہرے پہ لی سپر
آنکھوں میں ٹیس اٹھی جو پڑی دھوپ پر نظر   جھپٹے کبھی اِدھر کبھی حملہ کیا اُدھر
کثرت عرق کے قطروں کی تھی روئے پاک پر
موتی برستے جاتے تھے مقتل کی خاک پر

سیراب چھپتے پھرتے تھے پیاسے کی جنگ سے   چلتی تھی ایک تیغِ علی لاکھ رنگ سے
چمکی جو فرق پر تو نکل آئی تنگ سے   رکتی نہ تھی سپر سے نہ آہن نہ سنگ سے
خالق نے منہ دیا تھا عجب آب و تاب کا
خود اس کے سامنے تھا پھپھولا حباب کا

سہمے ہوئے تھے یوں کہ کسی کو نہ تھی خبر   پیکاں کدھر ہے تیر کا سوفار ہے کدھر
مردم کی کشمکش سے کمانوں کو تھا یہ ڈر   گوشوں کو ڈھونڈھتی تھیں زمیں پر جھکائے سر
ترکش سے کھینچے تیر کوئی یہ جگر نہ تھا
سپر پہ جس نے ہاتھ رکھا تن پہ سر نہ تھا

گھوڑے کی وہ تڑپ وہ چمک تیغِ تیز کی   تھوتھو صفیں کھل گئیں جب جست و خیز کی
لاکھوں میں تھی نہ ایک کو طاقت ستیز کی   تھی چار سمت دھوم گریزا گریز کی

آری جو ہوگئی تھیں وہ سب ذوالفقار سے
تیغوں نے مُنہ پھرا لئے تھے کارزار سے
گھوڑوں کی جست وخیز سے اُٹھا غبار زرد — گردوں میں مثلِ شیشۂ ساعت بھری تھی گرد
تودا بنا تھا خاک کا مینائے لاجورد — کوسوں سیاہ و تار تھا سب وادیٔ نبرد
پنہاں نظر سے نیّرِ گیتی فروز تھا
ڈھلتی تھی دوپہر یہ نہ شب تھی نہ روز تھا

اللہ ری لڑائی میں شوکت جناب کی — سونلائے رنگ میں تھی ضیا آفتاب کی
سوکھے وہ لب کہ پنکھڑیاں تھیں گلاب کی — تصویرِ ذوالجناح پہ تھی بوتراب کی
ہوتا تھا غل جو کرتے تھے نعرے لڑائی میں
بھاگو کہ شیر گونج رہا ہے ترائی میں

پھر تو یہ غل ہوا کہ دہائی حسینؑ کی — اللہ کا غضب ہے لڑائی حسینؑ کی
دریا حسینؑ کا ہے ترائی حسینؑ کی — دُنیا حسینؑ کی ہے خدائی حسینؑ کی
بیڑا بچایا آپ نے طوفاں سے نوحؑ کا
اب رحم واسطہ علی اکبرؑ کی رُوح کا

اکبرؑ کا نام سُن کے جگر پر لگی سناں — آنسو بھر آئے روک لی رہوار کی عناں
مڑ کر پکارے لاشِ پسر کو شہِ زماں — تم نے نہ دیکھی جنگِ پدر اے پدر کی جاں
قسمیں تمہاری رُوح کی یہ لوگ دیتے ہیں
لو اب تو ذوالفقار کو ہم روک لیتے ہیں

ایک نامی پہلوان کا مقابلۂ امام کے لئے آنا

چلایا ہاتھ مار کے زانو پہ ابنِ سعد — اے وا فضیحتا یہ ہزیمت ظفر کے بعد
زیبا دلاوروں کو نہیں ہے خلافِ وعد — اک پہلواں یہ سنتے ہی گرجا مثالِ رعد
نعرہ کیا کہ کرتا ہوں حملہ امام پہ
اے ابنِ سعد لکھ لے ظفر میرے نام پہ

بالا قد و کلفت و تنومند و خیرہ سر — روئیں تن و سیاہ دروں آہنی کمر
ناوک پیامِ مرگ کے ترکش اجل کا گھر — تیغیں ہزار ٹوٹ گئیں جس پہ وہ سپر
دل میں بدی طبیعتِ بد میں بگاڑ تھا
گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا

ساتھ اُس کے اور اسی قد و قامت کا ایک یل — آنکھیں کبود رنگ سیہ ابرووں پہ بل
بدکار و بدشعار و ستمگار و پُر دغل — جنگ آزما بھگائے ہوئے لشکروں کے دَل
بھالے لئے کسے ہوئے کمریں ستیز پہ
نازاں وہ ضربِ گرز پہ یہ تیغِ تیز پہ

کھنچ جائے شکلِ حرب وہ تدبیر چاہیے — دشمن بھی سب مقر ہوں وہ تقریر چاہیے
تیزی زباں میں صورتِ شمشیر چاہیے — فولاد کا قلم دمِ تحریر چاہیے
نقشہ کھنچے گا صاف صفِ کارزار کا
پانی دوات چاہتی ہے ذوالفقار کا

لشکر میں اضطراب تھا فوجوں میں کھلبلی — ساونت بے حواس ہراساں دھنی بلی
ڈر تھا کہ لو حسینؑ بڑھے تیغ اب چلی — غل تھا ادھر ہیں مرحب و عنتر اُدھر علیؑ

کون آج سربلند ہو اور کون پست ہو
کس کی ظفر ہو دیکھیے کس کی شکست ہو

آواز دی یہ ہاتفِ غیبی نے تب کہ ہاں — بسم اللہ اے امیرِ عرب کے سرورِ جاں
بیٹھے درست ہو کے فرس پر شہِ زماں — اُٹھی علیؑ کی تیغِ دو دم چاٹ کر زباں
واں سے وہ شور بخت بڑھا نعرہ مار کے
پانی بھر آیا منہ میں اِدھر ذوالفقار کے

لشکر کے سب جواں تھے لڑائی میں جی لڑائے — وہ بد نظر تھا آنکھوں میں آنکھیں ادھر گڑائے
ڈھالیں لڑیں سپاہ کی یا ابر گڑگڑائے — غصے میں آ کے گھوڑے نے بھی دانت کڑکڑائے
ماری جو ٹاپ ڈر کے ہٹے ہر لعیں کے پانوں
ماہی پہ ڈگمگا گئے گاوِ زمیں کے پانوں

نیزہ ہلا کے شاہ پہ آیا وہ خود پسند — مشکل کشا کے لال نے کھولے تمام بند
تیر و کماں سے بھی نہ ہوا کچھ وہ بہرہ مند — چلّہ اُدھر کھنچا کہ چلی تیغِ سربلند
وہ تیر کٹ گئے جو در آتے تھے سنگ میں
گوشے نہ تھے کماں میں نہ پیکاں خدنگ میں

ظالم اُٹھا کے گرز کو آیا جناب پر — طاری ہوا غضب خلفِ بوتراب پر
مارا جو ہاتھ پانوں جما کر رکاب پر — بجلی گری شقی کے سرِ پُر عتاب پر
بد ہاتھ میں شکست، ظفر نیک ہاتھ میں
ہاتھ اُڑ کے جا پڑا کئی ہاتھ ایک ہاتھ میں

کچھ دست پاچہ ہو کے چلا تھا وہ نابکار — پہنچے سے پر اجل کے کہاں جا سکے شکار
واں اُس نے بائیں ہاتھ میں لی تیغ آبدار — یاں سر سے آئی پشت کے مہروں پہ ذوالفقار

قربانِ تیغِ تیز شہِ نامدار کے
دو ٹکڑے تھے سوار کے دو راہوار کے

پھر دوسرے پہ گرز اُٹھا کر پکارے شاہ — کیوں ضربِ ذوالفقار پہ تو نے بھی کی نگاہ
سرشار تھا شرابِ تکبّر سے روسیاہ — جاتا کہاں کہ موت تو روکے ہوئے تھی راہ
غل تھا اسے اجل نے بڑھایا جو گھیر کے
لو دوسرا شکار چلا منہ میں شیر کے

آتا تھا وہ کہ اسپِ شہِ دیں پلٹ پڑا — ثابت ہوا کہ شیرِ گرسنہ جھپٹ پڑا
تیغِ شقی نے ڈھال پہ مارا تو پٹ پڑا — ضربت پڑی کہ گنبدِ دوّار پھٹ پڑا
پیوندِ صدرِ زیں جسد و فرق ہو گیا
گھوڑا زمیں میں سینے تلک غرق ہو گیا

پریوں سے قاف چھوٹ گیا اور جنوں سے گھر — شیروں سے دشت گرگ سے بن اژدروں سے در
شاہین و کبک چھپ گئے اک جا ملا کے سر — اُڑ کر گرے جزیروں میں دریا کے جانور
سمٹے پہاڑ منہ کو جو دامن سے ڈھانپ کے
سیمرغ نے گرا دیے پر کانپ کے

آئی ندائے غیب کہ شبیرؑ مرحبا — اس ہاتھ کے لیے تھی یہ شمشیر مرحبا
یہ آبرو یہ جنگ یہ توقیر مرحبا — دکھلا دی ماں کے دودھ کی تاثیر مرحبا
غالب کیا خدا نے تجھے کائنات پر
بس خاتمہ جہاد کا ہے تیری ذات پر

بس اب ذکرِ وغا کی ہوس اے حسینؑ بس — دم لے ہوا میں چند نفس اے حسینؑ بس
گرمی سے ہانپتا ہے فرس اے حسینؑ بس — وقتِ نمازِ عصر ہے بس اے حسینؑ بس

پیاسا لڑا نہیں کوئی یوں اژدحام میں
اب اہتمام چاہیے اُمّت کے کام میں (جب قطع کی مسافت...)

آوازِ غیب سنتے ہی تھرا گئے امام — کی ذوالفقار میاں میں اور روک لی لگام
گردن پھرا کے منہ کو لگا تکنے خوش خرام — فرمایا تجھ سے ہوتا ہے رخصت یہ تشنہ کام
رُک جا کہ خاتمہ ہوا جنگ و جدال کا
اب سر چڑھے گا نیزے پہ زہرا کے لال کا (طے کر چکے حسین ...)

یہ کہتے تھے کہ فوجِ ستمگر پھر آگئی — خیرالنسا کے چاند پہ بدلی سی چھا گئی
بھائی جو گھر گیا تو بہن بلبلا گئی — فریادِ فاطمہ کی فلک تک صدا گئی
یاں گھر نبی کی آل کا بے نور ہو گیا
زخموں سے واں تن شہِ دیں چور ہو گیا (نکلی جو رن میں تیغ ...)

وہ لُو وہ آفتاب کی تابندگی وہ بن — جھیلوں میں شیر ہانپتے تھے دشت میں ہرن
رونے کی چار سو تھی صدا بولتا تھا رن — غل تھا خدا پرستوں کے لاشے ہیں بے کفن
آندھی میں خاک اڑتی تھی گھوڑوں کی گشت سے
آواز ہائے ہائے کی آتی تھی دشت سے

بی بی پکارتی تھی کوئی، ہائے میرے لال — حیدر کا باغ ہوتا ہے جنگل میں پائمال
زہرا کی دونوں بیٹیاں کھولے ہوئے تھیں بال — ڈیوڑھی سے نکلے پڑتے تھے بچوں کا تھا یہ حال
جھکتے تھے زیں سے جب شہِ ذیشان زین پر
غل تھا کہ ہائے گرتا ہے قرآں زمین پر

جس روز تھا یہ حشر یہ ماتم یہ شور و شر — آ پہنچا اک مسافرِ غربت زدہ اُدھر
نکلا تھا گھر سے شوقِ نجف میں وہ خوش سیر — چھوٹے ہوئے وطن سے گذرا تھا سال بھر

بے خانماں کو عشق خدا کے ولی کا تھا
مشتاق وہ زیارتِ قبرِ علی کا تھا
رُخ زرد پاؤں سوجے ہوئے جسم پر غبار — ایمان و اعتقاد قوی پر بدن نزار
طاعت گذار، نیک عقیدت، وفا شعار — نے راحلہ نہ زاد نہ ہمدم نہ غمگسار

یہ آرزو کہ گوہرِ بحرِ شرف ملے
چھانوں جہاں کی خاک پہ دُرِّ نجف ملے
سر کو قدم کیے وہ سعیدِ خجستہ پے — دو دن کی راہ کرتا تھا ایک ایک دن میں طے
پیاری نہ تھی جو قطعِ مسافت سے کوئی شے — آساں تھی اُس کو دوریِ شام و عراق و رے

اُن جنگلوں میں بادیہ پیما تھا دین کا
گز بن گیا تھا راہِ خدا کی زمین کا
دیتی تھی اُس کو طاقتِ رفتار جب جواب — جھک جھک کے دونوں پاؤں سے کرتا تھا یہ خطاب
لازم ہے تم کو سعی کرو یہ ہے رہِ ثواب — احسان میرے سر پہ تمہارا چلو شتاب

کیا کیا شرف تمہاری بدولت ملے نہیں
گنج گہر ہیں زیرِ قدم آبلے نہیں
کرتا تھا ہر قدم پہ دعا وہ بہ اشک و آہ — پہونچا دے مجھ کو منزلِ مقصد پہ یا الٰہ
سمجھاتے تھے اُسے جو مسافر میانِ راہ — اک دن قیام کر کہ ترا حال ہے تباہ

یاری نہ دیں قدم تو ٹھہرنا ضرور ہے
کہتا تھا رو کے وہ کہ نجف کتنی دور ہے
پہونچا جو کربلا میں تو دیکھا یہ اُس نے حال — تنہا کھڑا ہے ایک مسافر لہو میں لال
فوجیں ستم کی گرد ہیں آمادۂ قتال — چلتے ہیں تیر کرتا ہے پانی کا جب سوال

از بسکہ اہلِ درد تھا بیتاب ہو گیا
پانی کے مانگنے پہ جگر آب ہو گیا

تھم کر جو اُس نے غور سے لاشوں پہ کی نظر — دیکھا کوئی ہے شمس کوئی غیرتِ قمر
بچہ پڑا ہے ایک ستارا سا خاک پر — کُرتہ بھی ہنسلیاں بھی شلوکہ بھی خوں میں تر
سُرخی لہو سے حلق کے سیبِ ذقن میں ہے
باچھوں میں سب ہے دودھ انگوٹھا دہن میں ہے

برپا ہے ایک سمت جو خیمہ فلک وقار — آتی ہے پیٹنے کی صدا اُس سے بار بار
چلا رہی ہے ڈیوڑھی پہ یوں کوئی غمگسار — صدقے میں تیرے اے مرے بابا کے یادگار
کانپا کلیجہ تھم کے سُنا جب دہائی کو
سمجھا کہ رو رہی ہے بہن اپنے بھائی کو

بولا وہ مل کے ہاتھ کہ یہ ماجرا ہے کیا — لائے کہاں نصیب مجھے وا مصیبتا
بیکس پہ یہ ستم یہ تعدی ہے یہ جفا — یارب ہوئی ہے اس تہِ بندے سے کیا خطا
نیزوں سے صدر تیغوں سے تن چور چور ہے
آئی ندائے غیب کہ یہ بے قصور ہے

کہنے لگا لرز کے وہ ذیقدر و نیک نام — اللہ کس قدر ہے پُر آشوب یہ مقام
دریا خدا نے خلق کے بہرِ فیضِ عام — مرتا ہے بے اجل یہ ستم کش یہ تشنہ کام
اُن سے بشر ڈرے جنہیں خوفِ خدا نہیں
جلدی نکل چلو یہ ٹھہرنے کی جا نہیں

دو چار گام بڑھ کے یہ سوچا وہ نامور — مظلوم کی دعا میں ہے سب طرح کا اثر
واللہ برگزیدۂ حق ہے یہ خوش سیر — کر لیجیے التماسِ دعا ہاتھ باندھ کر

تیغوں میں اس کے پاس چلو جو خدا کرے
آساں ہوں مشکلیں جو یہ بے کس دعا کرے

باتیں یہ کر کے دل سے بڑھا وہ اسیرِ غم　　لاشوں کو دیکھ دیکھ کے روتا تھا دمبدم
ہاتف نے دی ندا کہ سمجھ کر اُٹھا قدم　　رُتبے میں یہ زمیں بھی نہیں کچھ نجف سے کم
آنکھیں ملک بچھاتے ہیں اس ارضِ پاک پہ
یہ سب ورق ہیں مصحفِ ناطق کے خاک پہ

آیا جو کانپتا ہوا وہ شاہِ دیں کے پاس　　کی عرض السّلام علیک اے فلک اساس
مولا جواب دے کے یہ بولے بہ دردِ یاس　　آنا ہوا کدھر سے ترا اے خدا شناس
عرض اُس نے کی غلامِ شہِ ذوالفقار ہوں
بیکس ہوں بے نوا ہوں غریب الدیار ہوں

طے کی ہے سال بھر میں پہاڑوں کی میں نے راہ　　بچے کہیں تباہ ہیں خادم کہیں تباہ
اب تک ہے دُور مجھ سے درِ ضیغمِ الٰہ　　مال و متاع لے کے چلا تھا یہ پُرگناہ
غارت یہیں ہوئی ہے بضاعت غلام کی
لوٹا ہے راہ میں مجھے فوجوں نے شام کی

میں دو مہینے فوجِ ستم میں رہا اسیر　　مولا علیؑ کے نام کے دشمن ہیں وہ شریر
ہتھیار لے کے آ نہیں سکتا ہے راہ گیر　　تب قید سے چھٹا ہوں کہ جب ہو گیا فقیر
سر پہ یہی کلاہ یہی اک لباس ہے
پر ہوں غنی کہ دولتِ دیں میرے پاس ہے

دو صاحبوں کے شوق میں چھوڑا ہے میں نے گھر　　حسرت یہ ہے نصیب کرے یاوری اگر
پہلے تو ہوں نجف کی زیارت سے بہرہ ور　　منظور پھر وہاں سے مدینے کا ہے سفر

جاؤں گا دولتیں ہیں اگر سرنوشت میں
رستے میں موت آئی تو پہنچا بہشت میں

فرمایا آپ نے کہ مدینے میں کیا ہے کام   عرض اس نے کی وہی تو ہے دنیا میں اک مقام
اُس سرزمیں پہ ہے مرا آقا مرا امام   برسوں سے جس کے عشق میں ہوں تا بصبح و شام
حیدرؑ کے جان و دل ہیں شہِ مشرقین ہیں
صدقے میں اُس جگر کے وہیں تو حسینؑ ہیں

دشمن بہت امام کے ہیں اور دوست کم   اُمت دغا کرے نہ کہیں مجھ کو ہے یہ غم
اب پنجتن میں ہے تو اُنھیں کا ہے ایک دم   عزلت گزیں ہے قبرِ نبیؐ پر وہ ذی حشم
زندہ ہیں گر حسینؑ تو زندہ ہیں چار دم
یارب اُس ایک دم کو عطا کر ہزار دم

اک میرا شاہزادہ ہے ہم شکلِ مصطفیٰؐ   شہرہ ہے جس کی شکل و شمائل کا جا بجا
ماں کا مرادوں والا پسر ہے وہ مہ لقا   سائے میں شہ کے اُس کو سلامت رکھے خدا
اُس رشکِ گل سے دُور خزاں کی بلا رہے
یارب چمن حسینؑ کا پھولا پھلا رہے

یہ سُن کے آپ آئے مسافر کے متصل   پھیلا کے دونوں ہاتھ کہا آ گلے تو مل
ہاں بھائی سچ ہے صدمۂ غربت ہے جاں گسل   اس دم سنبھل گیا ترے آنے سے میرا دل
طاقت کلام کی نہیں پاتا یہ ضعف ہے
چہرہ ترا نظر نہیں آتا یہ ضعف ہے

ہاں مدتوں سے ہے یہی نیرنگِ روزگار   ہر گل پہ ایک دن ہے خزاں ایک دن بہار
ہمدم ہم بھی ہیں ترے اے یارِ غمگسار   تیری طرح لٹے ہیں ہمیں چھوڑ کر دیار

شکرِ خدا مسافرِ راہِ ثواب ہیں
اب دیر کوچ میں نہیں پا در رکاب ہیں

کس سے کہیں کہ ہم پہ جو صدمہ گذر گیا | خالی ہوا عزیزوں سے گھر دشت بھر گیا
دنیا سے دوپہر میں مرا گھر کا گھر گیا | بیٹا جوان قتل ہوا بھائی مر گیا
بنتی نہیں جب آتی ہے قسمت بگاڑ پر
ٹکڑے ہو گر پڑے یہ مصیبت پہاڑ پر

میرا ہے اب یہ حال کہ زخموں سے چور ہوں | جنگل میں موت آئی ہے بستی سے دور ہوں
اک خاکسار بندۂ ربِ غفور ہوں | عالم ہے اُس کی ذات کہ میں بے قصور ہوں
کہنے میں بات آتی ہے یہ کچھ گلا نہیں
دن تیسرا ہے آج کہ پانی ملا نہیں

مولا سے ہاتھ جوڑ کے بولا وہ دل کباب | لے آؤں دوڑ کر مرے شربے میں ہے کچھ آب
کیجے زبانِ خشک کو تر بہرِ بوتراب | بولے ہلا کے سر کو شہِ آسماں جناب
اب انتظار موت کا ہے کیا جیوں گا میں
سب پیاسے مر گئے ہیں نہ پانی پیوں گا میں

درکار جو تجھے ہو وہ لے بہرِ کردگار | پیدل اگر ہے تو تو یہ حاضر ہے راہوار
ناقہ بھی لے، ترا تو ہے آقا وہ نامدار | سائل کو جس نے روٹی کے اونٹوں کی دی قطار
حاضر ہے جان و مال کہ ہے میہمان تو
بھائی ہمارے گھر کو گھر اب اپنا جان تو

اسباب بھی ہے مال بھی ہے سیم و زر بھی ہے | موجود راحلہ بھی ہے زادِ سفر بھی ہے
مغفر بھی ہے زرہ بھی ہے تیغ و سپر بھی ہے | گر تیرے کام آئے تو حاضر یہ سر بھی ہے

بیکس ہوں گو کہ آج یہ عالی مقام ہوں
شرما نہ تو کہ میں بھی علیؑ کا غلام ہوں

دیکھی جو یہ عنایتِ سلطانِ بحر و بر — رونے لگا وہ مردِ مسافر جھکا کے سر
دل سے کہا خدا کا ولی ہے یہ خوش سیر — اس حال میں غریب نوازی ہے اس قدر

دیکھی نہ باپ میں یہ محبت نہ بھائی میں
اب تک ہیں اس طرح کے بھی بندے خدائی میں

عرض اُس نے کی حضور سے بس ہے یہ التجا — کیجیے اُٹھا کے ہاتھ مرے حق میں یہ دعا
پہونچا دے مجھ کو قبرِ علیؑ پر مرا خدا — مولا نے آسماں کی طرف دیکھ کر کہا

جس کو نہیں زوال وہ دولت نصیب ہو
یارب اسے علیؑ کی زیارت نصیب ہو

تسلیم اُس نے کی تو یہ بولے شہِ انام — قبرِ علیؑ پہ جا کے یہ کہنا مرا پیام
آتے ہیں آپ دردِ مصیبت میں سب کے کام — میں بیکس و غریب بھی ہوں آپ کا غلام

تنہا ہوں دشمنوں میں خبر آ کے لیجیے
ہنگامِ ذبح گود میں سر آ کے لیجیے

سُن کر بیانِ شاہ رہی ضبط کی نہ تاب — آنسو بہا کے سر کو جھکایا بصد حجاب
دل سے کہا کہ ہے لبِ بام اب یہ آفتاب — بیکس کے کام آؤ کہ اس میں بھی ہے ثواب

احساں کا یہ عوض ہے کہ احسان کیجیے
اب سر علیؑ کے نام پہ قربان کیجیے

حضرت سے عرض کی کہ نہ جائے گا اب غلام — بس جی چکے بہت یہی مرنے کا ہے مقام
اب دیجیے رضا کہ بڑھوں کھینچ کر حسام — وہ کام چاہیے کہ رہے تا بہ حشر نام

دیندار ہوں نہ ترکِ رفاقت کروں گا میں
اب مر کے شیرِ حق کی زیارت کروں گا میں

زوّار جن کا ہوں ہیں اُنھیں کی مجھے قسم　　سر بھی کٹے گا اب تو نہ چھوڑوں گا یہ قدم
جلوے دکھا رہا ہے مجھے گلشنِ اِرم　　حوریں پکارتی ہیں کہ آ منتظر ہیں ہم
پردے اُٹھے ہوئے ہیں نظر دُور جاتی ہے
گردوں سے مرحبا کی صدا مجھ کو آتی ہے

گھبرا کے بولے شاہ کہ ہاہا قسم نہ کھا　　رستہ ہے یاں سے رات لیے کا نجف کو جا
بچنا مرا محال ہے گر جان دی تو کیا　　اے بھائی تو ہے صاحبِ دُختر نہ لے رضا
دامن کو آنسوؤں سے بھگوتی ہے رات دن
بیٹی تری ترے لئے روتی ہے رات دن

رخصت کے وقت وہ جو بلکتی تھی دمبدم　　وعدہ کیا تھا تو نے کہ آئیں گے جلد ہم
مرتی ہے انتظار میں وہ صاحبِ اَلم　　آلودہ اس اَلم میں ہوں میں بھی اسیرِ غم
ہجراں کشیدہ، رنج و بلا و محن میں ہے
بیمار ایک میری بھی بیٹی وطن میں ہے

بیٹی کا ذکر سُن کے یہ بولا وہ خوش خصال　　فرمائیے جناب سے کس نے کہا یہ حال
آگاہ اس سے کوئی نہیں غیرِ ذوالجلال　　شاید ہے علمِ غیب میں بھی آپ کو کمال
ہر شے کا علم آپ کو اس بیکسی میں ہے
یہ توصفت امام میں ہے یا نبیؐ میں ہے

بتلائیے برائے خدا مجھ کو اپنا نام　　فرمایا بے نوا وطن آوارہ تشنہ کام
بیکس عزیز مُردہ اسیرِ سپاہِ شام　　عاجز بلا رسیدہ ستم دیدہ مستہام

درد و غم و الم مرے حصے میں آئے ہیں
یہ سب خطاب میں نے یہاں آکے پائے ہیں

قدموں پہ لوٹ کر یہ پکارا وہ دردناک — اظہار اسم اقدس و اعلیٰ میں کیا ہے باک
بتلایئے کہ غم سے مرا دل ہے چاک چاک — چپ ہوگئے تڑپنے پہ اُس کے امام پاک

فرمائے نہ یہ کہ شہ مشرقین ہوں
مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسینؑ ہوں

سر اپنا پیٹ کر وہ پکارا بہ شور و شین — ہے ہے یہ کیا زباں سے کہا کون سا حسینؑ
آئی ندا فلک سے کہ زہراؑ کا نورِ عین — بیٹا علیؑ کا سبطِ شہنشاہِ مشرقین

گھر فاطمہؑ کا لٹ گیا سب اِس لڑائی میں
بس اک یہی حسینؑ ہے ساری خدائی میں

کھینچی ہے تو نے جس کے لئے زحمتِ سفر — اے بے خبر یہی ہے وہ سلطانِ بحر و بر
ویراں ہے یثرب و نجف اے مردِ خوش سیر — شب سے یہیں نبیؐ و علیؑ ہیں برہنہ سر

زینب ہے یہ جو ڈیوڑھی پہ جاں اپنی کھوتی ہے
زہراؑ تو ساتویں سے اسی بن میں روتی ہے

اُس بے وطن نے جب کہ مفصل سنا یہ حال — غش کھا کے پائے شہ پہ گرا وہ نکو خصال
اُٹھا تڑپ کے جب تو پکارا بصد ملال — یہ کیا قیامت آگئی اے فاطمہؑ کے لال

کیا تھی خبر کہ آپ اس آفت کے بن میں ہیں
میں تو یہ جانتا تھا کہ حضرت وطن میں ہیں

مدت سے تھی مجھے تو زیارت کی آرزو — خوبی مرے نصیب کی یا شاہِ نیک خو
اب دیکھیے رضا کہ جگر غم سے ہے لہو — مر جاؤں لڑ کے فوج سے حضرت کے روبرو

للہ چشمِ پاک کو پُرنم نہ کیجئے
آپ اُس غلام زادی کا کچھ غم نہ کیجئے

شہزادیاں امام کی ہوتی ہیں بے پدر   کچھ غم نہیں یتیم وہ لونڈی ہوئی اگر
میں کیا مکان کیا مرا یا شاہِ بحر و بر   جب بے سبب جہاں میں لٹے فاطمہؑ کا گھر
گیتی ہو آج درہم و برہم تو خوب ہے
اُلٹے تمام دفترِ عالم تو خوب ہے

رو کا بہت مگر کہیں رُکتا تھا وہ دلیر   تلوار لے کے فوج پہ جھپٹا مثالِ شیر
سیرِ جناں کے شوق میں تھا زندگی سے سیر   ایسا لڑا کہ رن میں ہوئے زخمیوں کے ڈھیر
دم بھر رہا تھا عشق شہِ مشرقین کے
نعرہ تھا دمبدم کہ تصدق حسینؑ کے

لگتا تھا زخم جب تو وہ کہتا تھا یا علیؑ   بدرُ الدجےٰ حسینؑ ہیں شمس الضحےٰ علیؑ
مرشد علیؑ حسینؑ علیؑ رہنما علیؑ   کشتی علیؑ جہاز علیؑ ناخدا علیؑ
عازم ہوں سیرِ گلشنِ دارالسّلام کا
دریائے غم سے پار ہے بیڑا غلام کا

اُس بے وطن پہ ٹوٹ پڑی سب سپاہِ شام   ریتی پہ ٹکڑے ہو کے گرا وہ فلک مقام
زخمی تھے خود پہ اُس کے سرہانے گئے امام   گودی میں لے کے زانو پہ رکھا سرِ غلام
رو کر پکارتے تھے یہ اُس خوش نصیب کو
اے بھائی جان چھوڑ چلے اس غریب کو

اے میری بیکسی کے مددگار الوداع   اے تشنہ لب حسینؑ کے غمخوار الوداع
اے بے وطن کے یار وفادار الوداع   اے شیرِ ذوالجلال کے زوّار الوداع

جو خوش نصیب ہیں یوں ہی جنت میں جاتے ہیں
گھبرائیو نہ ہم بھی ترے بعد آتے ہیں

فرما کے یہ حسینؑ تو روتے تھے زار زار — ہنستا تھا دونوں آنکھوں کو کھولے وہ ذی وقار
پوچھا سبب خوشی کا تو بولا وہ دلفگار — اے نورِ چشمِ احمدِ مرسل ترے نثار
جلوہ خدا کے نور کا ہے میرے سامنے
مشتاق جن کا تھا انھیں دیکھا غلام نے

بالائے سر کھڑے ہیں رسولِ فلک مقام — فرزند کہہ کے لیتے ہیں شفقت سے میرا نام
دستِ علیؑ میں چشمۂ کوثر کے دو ہیں جام — فرماتے ہیں کہ پی اے گھر تو ہے تشنہ کام
ناجی ہے دوستدار مرے نورِ عین کا
حصہ ترا یہ ہے تو یہ حصہ حسینؑ کا

حقا کہ تھا ظفر کا وسیلہ سفر ترا — نام نکو قلم نے لکھا عرش پر ترا
اب جنت النعیم میں ہوگا گذر ترا — ہمسایۂ رسولِ خدا میں ہے گھر ترا
حوریں ہیں باغِ خلد میں خدمت کے واسطے
آیا ہوں خود میں تیری زیارت کے واسطے

سننے لگا یہ شاہ سے کہہ کر وہ تشنہ لب — فرمایا آپ نے کہ یہ رونے کا کیا سبب
کی عرض اس نے اے خلفِ سیدالعرب — تنہائی کا حضور کی صدمہ ہے دل پہ اب
رخصت جو تن سے روح کی ہے بیقرار ہوں
مہلت جو دے اجل تو پھر اٹھ کر نثار ہوں

مجھ کو ہے غم حضور کا حضرت کو غم مرا — اب کوچ جلد ہے سوئے ملکِ عدم مرا
منہ ڈھانپ دیجیے شہ عالی ہمم مرا — پڑھئے کوئی دعا کہ نکلتا ہے دم مرا

کیا وقتِ بیکسی ہے ہمارے حضور پہ
کس سے کہوں کہ لاش کو دارے حضور پہ
یہ کہتے کہتے آہ وہ نزوار مرگیا — بیکس کا بے وطن کا مددگار مرگیا
شیدائے نامِ حیدرِ کرار مرگیا — شبیرؑ روتے رہ گئے غمخوار مرگیا
لاشے سے اُٹھ کے جا نہ سکے خیمہ گاہ میں
پھر گھر گئے حسینؑ عدو کی سپاہ میں (جب نوجواں پسر...)

امامِ حسینؑ کی شہادت

سینے پہ سامنے سے چلے دس ہزار تیر — چھاتی پہ لگ گئے کئی سو ایک بار تیر
پہلو کے پار برچھیاں سینے کے پار تیر — پڑتے تھے دس جو کھینچتے تھے تن سے چار تیر
یوں تھے خدنگ ظلق الٰہی کے جسم پہ
جس طرح خار ہوتے ہیں ساہی کے جسم پہ
چلتے تھے چار سمت سے بھالے حسینؑ پہ — ٹوٹے ہوئے تھے برچھیوں والے حسینؑ پہ
یہ دُکھ نبیؐ کی گود کے پالے حسینؑ پہ — قاتل تھے خنجروں کو نکالے حسینؑ پہ
تیرِ ستم نکالنے والا کوئی نہ تھا
گرتے تھے اور سنبھالنے والا کوئی نہ تھا
لاکھوں میں ایک بیکس و دلگیر ہائے ہائے — فرزندِ فاطمہؑ کی یہ توقیر ہائے ہائے
بھالے وہ اور پہلوئے شبیرؑ ہائے ہائے — وہ زہر میں بجھائے ہوئے تیر ہائے ہائے
غصے میں تھے جو فوج کے سرکش بھرے ہوئے
خالی کئے حسینؑ پہ ترکش بھرے ہوئے

وہ گرد تھے جو بھاگتے پھرتے تھے وقتِ جنگ
اک سنگدل نے پاس سے مارا جبیں پہ سنگ
صدمے سے زرد ہو گیا سبطِ نبیؐ کا رنگ
ماتھے پہ ہاتھ تھا کہ گلے پر لگا خدنگ
تھاما گلا جناب نے ماتھے کو چھوڑ کے
نکلا وہ تیر حلقِ مبارک کو توڑ کے

لکھا ہے تین بھال کا تھا ناوکِ ستم
منہ کھل گیا اُلٹ گئی گردن رکا جو دم
کھینچی سری گلے کی طرف سے بچشمِ نم
بھالیں نکالیں پشت کی جانب سے ہو کے خم
اُبلا جو خوں نکلتا ہوا دم ٹھہر گیا
چلّو رکھا جو زخم کے نیچے تو بھر گیا

دشمن تھا شہ کا اعورِ سلمی عدوئے دیں
سر پہ لگائی تیغ کہ شق ہو گئی جبیں
ماری جگر پہ ابنِ انس نے سنانِ کیں
بھاگا گرا کے کو کھ میں برچھی کو اک لعیں
گھوڑے پہ ڈگمگا کے جو حضرت نے آہ کی
تھرا گئی ضریح رسالت پناہ کی

گرتے ہیں اب حسین فرس پر سے ہے غضب
نکلی رکاب پائے مطہر سے ہے غضب
پہلو شگافتہ ہوا خنجر سے ہے غضب
غش میں جھکے عمامہ گرا سر سے ہے غضب
قرآن رحلِ زیں سے سرِ فرش گر پڑا
دیوارِ کعبہ بیٹھ گئی عرش گر پڑا

گر کر کبھی اُٹھے کبھی رکھا زمیں پہ سر
اُگلا کبھی لہو تو سنبھالا کبھی جگر
حسرت سے کی خیام کی جانب کبھی نظر
کروٹ کبھی تڑپ کے اِدھر لی کبھی اُدھر
اُٹھ بیٹھے جب تو زخموں سے برچھی کے پھل گرے
تیر اور تن میں گڑ گئے جب منہ کے بھل گرے (جب قطع کی مسافت ...)

نیت میں بھی عبادتِ خالق جو مرتے دم — سورے زبانِ خشک سے پڑھ کر بچشمِ نم
گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے ہوئے سوئے قبلہ خم — جھکنا تھا بس کہ سر پہ لگی تیغ ہے ستم
اُٹھا گیا نہ پھر وہیں تیورا کے گر پڑے
سجدے کو ریگِ گرم پہ غش کھا کے گر پڑے (رنجِ محن ثنائے …)

جلتی زمیں پہ گر کے تڑپنے لگے امام — بیکس پہ ظالموں نے کیا اور اژدہام
اُس وقت شمر سے یہ عمر نے کیا کلام — ہاں تن سے جلد کاٹ سرِ سرورِ امام
ڈریو نہ سُن کے فاطمہؑ زہرا کی آہ کو
گُل کردے شمعِ قبرِ رسالت پناہ کو

یہ سُنتے ہی چڑھائی ستمگر نے آستیں — خنجر کمر سے کھینچ کے آگے بڑھا لعیں
تھے قبلہ رُو جھکے ہوئے سجدے میں شاہِ دیں — لب ہلتے دیکھے شاہ کے آیا وہ جب قریں
سمجھا کہ تشنگی سے جو صدمے گزرتے ہیں
اِس وقت بددعا مجھے شبیر کرتے ہیں

جھک کر قریب کان جو لایا تو یہ سُنا — حق میں گناہگاروں کے کرتے ہیں شہ دُعا
جاری زبانِ خشک پہ یہ ہے کہ اے خدا — کر حاجتوں کو میرے محبوں کی تو روا
شیعوں کا حشر روزِ جزا میرے ساتھ ہو
میرا یہ خوں بہا ہے کہ ان کی نجات ہو

یہ سُن کے مستعد ہوا وہ شہ کے قتل پر — زانو رکھا حسینؑ کے سینے پہ بے خطر
گردن پہ پھیرنے لگا خنجر جو بدگہر — آئی صدا علیؑ کی کہ ہے ہے مرے پسر
زہراؑ پکاری کچھ بھی نبیؐ سے حجاب ہے
ظالم یہ بوسہ گاہِ رسالت مآب ہے (دشتِ وغا میں نورِ خدا …)

تھرا کے دیکھنے جو لگا وہ ادھر اُدھر
دیکھا کھڑے ہیں احمدِ مرسلؐ برہنہ سر
حیدرؑ بہت قریب ہیں تھامے ہوئے جگر
زہراؑ کی ہے صدا کہ نہ سیدؑ کو ذبح کر
ڈر قہرِ حق سے دست درازی کو چھوڑ دے
صدقہ نبیؐ کا سیدِ نمازی کو چھوڑ دے

ہٹنے لگا جو ڈر کے وہ مرتد جفا شعار
چلّایا بڑھ کے یوں پسرِ سعدِ نابکار
جلدی پھرا دے شہ کے گلے پر چھری کی دھار
ڈرتا ہے کیوں یہ سحر ہے اے مردِ نامدار
اب حشر ہو گا اس جسدِ پاش پاش پر
سر کھولے زینبؑ آتی ہے بھائی کی لاش پر (رطب اللساں ہوں ج…)

فضہ نے جا کے خیمے میں رانڈوں کو دی خبر
ہے ہے مرے شہزادے کا کٹتا ہے تن سے سر
بستر سے اٹھ کے گر پڑے سب بادِ نوحہ گر
خیمے سے نکلیں بی بیاں بچوں کو چھوڑ کر
گر گر کے دوڑتی تھیں کہ مل لوں حسینؑ سے
ہلتا تھا عرش حضرتِ زینبؑ کے بین سے

مانندِ آفتاب لرزتا تھا جسمِ پاک
جائیں کدھر وہ فوج وہ صحرائے ہولناک
سر پر عصابہ پاؤں میں موزے ردا پہ خاک
لٹکے ہوئے تھے دونوں طرف پیرہن کے چاک
عابد کا نورِ عین بڑا تھامے ساتھ تھا
اک ہاتھ میں یتیم سکینہ کا ہاتھ تھا

چلاتی تھیں ارے مرا بھائی ہے کس طرف
لوٹی ہوئی علیؑ کی کمائی ہے کس طرف
دریا کدھر ہے خوں کا ترائی ہے کس طرف
سونے کی جا حسینؑ نے پائی ہے کس طرف
رستہ دے اے زمیں کہ فلک کی ستائی ہوں
میں اپنے پیارے بھائی سے ملنے کو آئی ہوں

ریتی پہ مصطفیٰ کے جگر کا لہو گرا
اے آسماں زمیں پہ اب تک نہ تو گرا
سید گرا امام گرا نیک خو گرا
وہ کعبۂ زمین و زماں قبلہ رو گرا
تاب اُٹھنے بیٹھنے کی کہاں ہاتھ پاؤں میں
شاید نماز پڑھتے ہیں تیغوں کی چھاؤں میں

میں سیدہ ہوں رحم مری بیکسی پہ کھاؤ
اے اہلِ قریہ بنتِ نبیؐ کی مدد کو آؤ
دنیا میں تم خوشی رہو عقبیٰ میں چین پاؤ
سید کدھر ہے خون میں غلطاں مجھے بتاؤ
یاں لُٹ گئے فلک نے یہ دکھ ہم پہ ڈالے ہیں
اے بھائیو مدینے کے ہم رہنے والے ہیں

آتی تھی جس میں وحی وہ گھر ہے ہمارا گھر
علمِ نبیؐ کے شہر کا در ہے ہمارا گھر
تاروں میں برجِ شمس و قمر ہے ہمارا گھر
تیغِ عذابِ حق کی سپر ہے ہمارا گھر
حاکم ہے برخلاف وطن ہم سے چھٹ گیا
ہے ہے وہی بھرا ہوا گھر آج لُٹ گیا (جب خاتمہ بخیر ہوا...)

اُس وقت پہونچی زینبِ ناشاد و نوحہ گر
جب شمر ہاتھ میں لئے جاتا تھا شہؑ کا سر
بکھری ہوئی تھیں چہرے پہ زلفیں ادھر اُدھر
رخسار دونوں زرد تھے اور ہونٹ خوں سے تر
تھی خاکِ سجدہ گاہ جبینِ حسینؑ کی
آنکھیں کھلی تھیں فاطمہؑ کے نورِ عین کی

قرآن پڑھ رہا تھا سرِ ابنِ بوتراب
اور ریش میں کھلا ہوا تھا جا بجا خضاب
روشن تھا بعدِ قتل بھی رُخ مثلِ آفتاب
ظاہر یہ تھا لبوں سے کہ پایا نہیں ہے آب
آنکھوں سے یہ عیاں تھا کہ دنیا سے جاتے ہیں
ثابت یہ خشک ہونٹوں سے تھا مسکراتے ہیں

چلائی سر کو پیٹ کے زینبؑ جگر فگار — ہے ہے شہید ہو گیا نانا کا یادگار
سیّد تری کھلی ہوئی آنکھوں کے میں نثار — بھیا بہن کے آنے کا تم کو تھا انتظار

شاید ابھی چلی ہے چھری حلق پاک پر
تازہ لہو رگوں سے ٹپکتا ہے خاک پر (رطب اللساں ہوں ...)

بنتِ علیؑ کی آنکھوں میں عالم ہوا سیاہ — ہاتھوں سے دل پکڑ کے کہا وامحمدا
منہ پیٹ کر زمیں پہ گری بھر کے اشکِ آہ — چلائی ہائے خانۂ زہراؑ ہوا تباہ

ہم سب کے جیتے جی اب تو افلاک اٹھ گئے
ہے ہے جہاں سے پنجتنِ پاک اٹھ گئے (ملے کر بچے حسینؑ ...)

بعدِ شہادتِ امام اہلِ بیت کی حالت

جب کربلا میں خاتمہ پنجتن ہوا — صرفِ خزاں رسولِ خدا کا چمن ہوا
سجدے میں حق کے ذبح امامِ زمن ہوا — غل پڑ گیا شہید شہِ بے وطن ہوا

پانی نہ مرتے دم بھی دیا بے گناہ کو
پیاسا ہی مارا یثرب و بطحا کے شاہ کو

ڈوبا ہے بحرِ خوں میں دو عالم کا بادشاہ — خشکی میں اہلبیت کی کشتی ہوئی تباہ
صحرا میں مر گیا پسرِ ضیغمِ الٰہ — شیرِ خدا کا لال ہوا قتل بے گناہ

کیوں خوفِ حشر ہو دے نہ سارے جہان کو
ظلمت نے چھا لیا ہے زمیں آسمان کو

زائل ہوا تھا مہرِ فلک کا تمام نور — کہتا تھا ہر بشر کہ قیامت نہیں ہے دور
اب پھونکتا ہے دم میں سرافیل اپنا صور — نزدیک ہے کہ شیشۂ گردوں ہو چور چور

دریائے قہرِ حق میں نہ کس طرح جوش ہو

جب یوں چراغِ قبرِ محمدؐ خموش ہو (جب کربلا میں خاتمۂ ...)

دنیا ہوئی تباہ غضب آج ہو گیا
بے سر تمام خلق کا سرتاج ہو گیا

گھر فاطمہؑ کا ظلم سے تاراج ہو گیا
کنبہ رسولؐ پاک کا محتاج ہو گیا

کیا کیا گُل ریاضِ محمدؐ خزاں ہوئے

تھی جن سے روشنی وہ ستارے نہاں ہوئے

بے سر جو تھا زمیں پہ یداللہ کا خلف
برپا تھا شور ہائے حسینا کا ہر طرف

تھی کربلا میں خاک بسر قدسیوں کی صف
ہلتا تھا کعبہ کانپتا تھا یثرب و نجف

زہراؑ برہنہ سر تھیں علیؑ اشکبار تھے

خوابیدگانِ کنج لحد بے قرار تھے

اہلِ حرم میں ہائے حسینا کی تھی پکار
مائیں جو پیٹتی تھیں تو بچے تھے بیقرار

چلاتی تھی یہ زینبؑ مغموم بار بار
بھیا تمہارے لاشۂ بے سر کے میں نثار

کیونکر ردا اُڑھاؤں تنِ چاک چاک پر

مسند نبیؐ کی چھوڑ کے سوتے ہو خاک پر

اک دن وہ تھا کہ سینۂ زہراؑ تھا خوابگاہ
اک دن یہ ہے کہ لاش پہ سایہ نہیں ہے آہ

جس لب کے بوسے لیتے تھے پیغمبرِ الٰہ
زخمی وہ ہوئے تیرے بے جرم و بے گناہ

کیونکر بہن کے دل پہ نہ غم کا وفور ہو

جب جسمِ پاک آپ کا تیغوں سے چور ہو

یہ شور تھا کہ آئے ستمگر سوئے خیام
چلایا شمر پھونک دو ہاں خیمۂ امام

فضہؑ نے دی صدا کہ ادب کا ہے یہ مقام
یاں بیٹیاں علیؑ کی ہیں اے ساکنانِ شام

جل جاؤ گے جو اہلِ حرم پہ نگاہ کی
ڈیوڑھی یہ ہے امامِ فلک بارگاہ کی

اے ناریو یہ حیدرِ صفدر کا ہے مکاں — اس کا ادب کرو یہ پیمبرؐ کا ہے مکاں
پیچھے ہٹو نبیؐ کی یہ دختر کا ہے مکاں — حق سے ڈرو یہ شافعِ محشر کا ہے مکاں
یاں اذن جبرئیل کو جب تک ملا نہیں
پاسِ ادب سے وہ کبھی آگے بڑھا نہیں

ظاہر ہے سب پہ حضرتِ خیر النساءؑ کا سال — فاقے پہ فاقے کر کے سدھاریں وہ خوش خصال
ہیں اُن کی بیٹیاں بھی غریب و شکستہ بال — اُس گھر کو لوٹتے ہیں جہاں ہو متاع و مال
سیدانیوں کے فقر سے آگاہ کیا نہیں
ثابت کسی کے سر پہ گزی کی ردا نہیں

غصہ سے تب یہ کہنے لگا شمرِ بے حیا — ہے ہم کو بغض مال اگر کچھ نہ نکلے گا
تو یہ خیام آگ سے دیویں گے ہم جلا — اور سر سے چھین لیں گے ہر اک رانڈ کی ردا
دانستہ اہلِ بیتِ نبیؐ کو ستائیں گے
مسندِ محمدِؐ عربی کی جلائیں گے

اُن کو تو قتل کر چکے تھا جن کا ہم کو ڈر — لوٹیں گے اہلِ بیتِ محمدؐ کا مال و زر
اکبر نہ اب ہیں اور نہ سلطانِ بحر و بر — عباس بھی نہیں جو بچائیں گے آن کر
کانوں سے ننھے بچوں کے گوہر اُتاریں گے
کُرتا جو پہنے ہو گی وہ زیور اُتاریں گے

غصہ سے جب یہ شمرِ لعیں نے کیا کلام — درّانہ آئے فاطمہ کے گھر میں اہلِ شام
جس وقت صحن میں نظر آیا ہجومِ عام — سر پیٹنے لگے حرمِ سیدِ انام

لٹتا تھا گھر جو بادشہِ مشرقین کا
غل تھا نبیؐ کی آل میں ہے ہے حسینؑ کا

مسند لٹی جو شاہِ فلک بارگاہ کی		ہاتھوں سے دل کو تھام کے زینبؑ نے آہ کی
غل تھا کہاں چھپیں نہیں جا گھر پناہ کی		فریاد ہے دہائی ہے اسے شیرِ الٰہ کی
آقا تمہارے اہلِ حرم لوٹے جاتے ہیں
یا شیرِ حق بچاؤ کہ ہم لوٹے جاتے ہیں

شکلیں مہیب دیکھ کے بچے تھے بیقرار		کرتوں سے منہ چھپا تھے روتے تھے زار زار
چلاتی تھی یہ بانوئے معصوم بار بار		اکبر بچاؤ ہوتے ہیں بے پردہ دہ دار
نامحرموں کو قہرِ الٰہی کا ڈر نہیں
ماں بہنیں لوٹی جاتی ہیں تم کو خبر نہیں

کہتی تھی سہم کر یہ سکینہ جگر فگار		مجھ کو کہیں چھپاؤ پھوپھی تم پہ میں نثار
غافل ہیں ہم نے دیکھ لیا بس پھوپی کا پیار		اکبر ہیں یاں نہ حضرتِ عباسِ نامدار
نامحرم آ کے خیمۂ عصمت میں بھر گئے
پوچھو کسی سے تم مرے بابا کدھر گئے

زینبؑ نے اس یتیم سے سر پیٹ کر کہا		کس کو پکارتی ہو سکینہ پھوپھی فدا
ہوتے اگر حسینؑ تو آسکتے اشقیا؟		ہے ہے ہوئے شہید شہنشاہِ کربلا
خالی ہوا زمانہ ترے بابا جان سے
پڑھ کر نمازِ عصر سدھارے جہان سے

زینبؑ ابھی سکینہ سے کرتی تھی یہ کلام		لینے لگے ردائیں سروں پر سے اہلِ شام
دیکھا نہ تھا جو گھر میں کبھی یہ ہجومِ عام		حق کی دہائی دینے لگیں بیبیاں تمام

منت سُنی کسی کی نہ خوفِ خدا کیا
زہراؐ کی بہوؤں بیٹیوں کو بے ردا کیا

پھر وہ جفا شعار صغیروں کے پاس آئے   سہمے ہوئے وہ روتے تھے کُرتوں سے منہ چھپائے
کانوں سے بُندے کھینچ لئے اُن کے ہائے ہائے   روئے جو وہ یتیم تو نیزے انہیں دکھائے
فریاد کی صغیروں نے منہ ڈھانپ ڈھانپ کے
گر گر پڑے زمین پہ سب کانپ کانپ کے

آیا قریں سکینہ کے پھر شمرِ خیرہ سر   اور بد گہر نے کھینچ لیا کان سے گہر
کُرتا بدن کا ہو گیا سارا لہو میں تر   تڑپی وہ مثلِ ماہیِ بے آب خاک پر
چلائی وہ یتیم کہ راحت کے دن گئے
فریاد ہے حسینؑ گہر میرے چھن گئے

اتنے میں ناریوں نے دیا اور تازہ غم   حضرت کے گھر میں آگ لگا دی بصد ستم
جلنے لگا جو خیمۂ شاہنشہِ اُمم   بچوں کو لے کے گود میں رونے لگے حرم
استادہ صحن میں ہوئے خیمے سے بھاگ کے
رخسارے تمتما گئے شعلوں سے آگ کے

جب جل چکے خیامِ شہِ آسماں وقار   اونٹوں پہ اہلِ بیتِ نبیؐ کو کیا سوار
عابد کے دستِ پاک میں اونٹوں کی دی مہار   گرتے پڑتے ہر قدم پہ یہ تھا بیڑیوں کا بار
گورا گلا وہ حلقۂ طوق و رسن میں تھا
مہتابِ آسمانِ شرافت گہن میں تھا

لکھتا ہے اس طرح سے ابو مخنفِ سعید   جس وقت لٹ چکے حرمِ سرورِ شہید
وہ دن تھا ابنِ سعد کے نزدیک روزِ عید   سب کے سروں کو سامنے منگوا کے وہ پلید

بولا سبھوں کو فتح دکھانا ضرور ہے
نیزوں پہ ان سروں کو چڑھانا ضرور ہے

بیٹھا منگا کے کرسیٔ زر تیں وہ بدگہر — لشکر کے سرکشوں کو لگا بانٹنے وہ سر
قاسمؑ کا سر کسی کو دیا اس نے خوں میں تر — بخشا کسی کو پھر سر عباسؑ نامور
اک بدنہاد کو علی اکبر کا سر دیا
اور اک لعیں کے ہاتھ میں اصغر کا سر دیا

جب دشمنوں نے نیزوں کی نوکوں پہ سر چڑھائے — تھا شور اہلِ بیتِ نبیؐ میں کہ ہائے ہائے
بانو پکارتی تھی کہ ماں تیرے صدقے جائے — اصغر نہ دو برس بھی مرا دودھ پینے پائے
اماں کا گھر بھرا ہوا ویران کر گئے
واری ہماری گود کو سنسان کر گئے (جب غرق بحر خوں ہوئی...)

رانڈوں کو ساتھ لے کے چلے جب وہ اہلِ شر — زینبؑ پکاری اونٹ سے سر اپنا پیٹ کر
لے چل خدا کے واسطے مقتل میں اے عمر — تا دیکھ لیں عزیزوں کے لاشوں کو اک نظر
پائیں گے پھر نہ لاشِ شہِ مشرقین کو
سب مل کے ہم وداع تو کرلیں حسینؑ کو

سنتے تھے کب اسیروں کی زاری وہ بدشعار — دم بھر ٹھہرنے پائی نہ اونٹوں کی واں قطار
پھر پھر کے دیکھتے گئے لاشوں کو سوگوار — زینبؑ پکارتی تھی کہ بھیا ترے نثار
کیونکر بلائیں لاشے کی لوں دسترس نہیں
بس میں ستمگروں کے ہوں کچھ میرا بس نہیں

لٹے ہوئے قافلہ کی دربار کو روانگی

وہ قافلہ دمشق کی جانب ہوا رواں — نیزوں پہ تھے شہیدوں کے سرہائے خونچکاں
رسّی لئے تھے اونٹوں کی سجادِ ناتواں — ہے ہے حسینؑ کہتی تھیں سر کھولے بی بیاں
بچے بھی ماں کی گودیوں میں بیقرار تھے
عابد پیادہ پا تھے ستمگر سوار تھے

منزل پہ کس تعب سے پہنچتے تھے تا بہ شام — تھا ایک کوس ضعف کی شدت سے ایک گام
کہتی تھی ناتوانی کرو اب یہیں مقام — گرتے تھے جب تو اٹھتے تھے لے کر علیؑ کا نام
دم رُک گیا جو طوق سے گھبرا کے گر پڑے
کانٹا چبھا تو خاک پہ تھرا کے گر پڑے

منزل پہ جا کے سوتے تھے راحت سے بدصفات — غم میں پدر کے روتے تھے عابد تمام رات
جز حمدِ حق زباں پہ نہ آتی تھی کوئی بات — ہر دم تھا شکرِ نعمتِ معبودِ پاک ذات
کٹتی تھی راہ بندگیٔ بے نیاز میں
شب کو جب اٹھ کے دیکھا تو پایا نماز میں

رانڈوں کو اک گھڑی کسی منزل پہ تھا نہ چین — رہتا تھا تا بہ صبح بپا شورِ وا حسینؑ
اصغر کے غم میں پچھلے کو کرتی تھی ماں یہ بین — جنگل میں کس طرح سے رہا میرا نورِ عین
کس کو سلاؤں سینے پہ اے ماہ تم نہیں
اُترا ہے دودھ چھاتی میں پر آہ تم نہیں (جب تیغ کربلا میں حسینؑ کی ...)

ایک روایت

کرتا ہے ایک راوئی شیریں سخن بیاں — پہونچا قریب قلعۂ شیریں وہ کارواں
فوجِ امیرِ شام فرد کش ہوئی وہاں — تھک کر زمیں پہ گر پڑے سجادِ ناتواں

اُس دشت میں اُتر کے حرم نوحہ گر ہوئے
نیزوں پہ پھر نصب وہ شہیدوں کے سر ہوئے

شیریں کو تھا جو آٹھ پہر شاہ کا خیال   اس طرح خواب میں نظر آیا اُسے جمال
زخمی ہے سر سے تا بہ قدم شاہِ خوش خصال   اصغر کی لاش گود میں کپڑے لہو سے لال
زخمی گلا ہے تیغ سے پیشانی تیر سے
بوندیں لہو کی گرتی ہیں حلقِ صغیر سے

شیریں نے شاہِ دیں کو نہ پہچانا مطلقا   حیرت سے شہ کو دیکھتی تھی سر سے تا بہ پا
کہنے لگے تب اُس سے یہ مظلومِ کربلا   افراطِ زخم سے مرا نقشہ بدل گیا
صدمے جو ہم پہ گزرے اُسے جانتی نہیں
میں ہوں حسینؑ تو مجھے پہچانتی نہیں

شیریں قدم پہ گر کے پکاری کہ میں نثار   یہ حال کیا ہے آپ کا یا شاہِ با وقار
فرمایا تب حسینؑ نے با چشمِ اشکبار   شیریں مرے گلے پہ چلی تیغِ آبدار
کس سے کہیں جو پیاس کے صدمے اٹھائے ہیں
وعدہ کیا تھا تجھ سے سو ہم مر کے آئے ہیں

دشتِ بلا میں لٹ گیا سارا ہمارا گھر   یاں تک کہ قتل ہو گیا ننھا سا یہ پسر
بانو اسیر ہے تجھے اس کی نہیں خبر   بی بی ہے تیری فوجِ ستمگر میں ننگے سر
جس نے غنی کیا تھا تجھے وہ فقیر ہے
آزاد کرنے والی تری خود اسیر ہے

شیریں اُٹھی جو دیکھ کے یہ خواب ہولناک   چھاتی پہ ہاتھ مار کے تڑپی بروئے خاک
شوہر پکارا آپ کو کرتی ہے کیوں ہلاک   کیا سانحہ ہوا جو گریباں کیا ہے چاک

چلائی وہ کہ تختِ امامت اُلٹ گیا
ہے ہے مرے امام کا سر تن سے کٹ گیا

اُس نے کہا کہ منہ سے نہ یہ فالِ بد نکال — دیکھا ہے خواب کچھ تو ہے اس کا عبث خیال
آتی ہے یاں صدا خبرِ شاہِ خوش خصال — حج کو گیا ہے کعبے میں خیر النساء کا لال
اُمت ستائے گی ؟ شہِ ذوالاحترام کو
کعبے میں کون قتل کرے گا امام کو

مشکل کشائے خلق، دو عالم کا پیشوا — محبوبِ کبریا کی زباں حجتِ خدا
ایسے بزرگ پر کوئی کرتا نہیں جفا — فرزندِ فاطمہؑ نے کسی کا ہے کیا کیا
سیّد کے سر کو تیغ سے ناحق اُتاریں گے
کس جرم پر نبیؐ کے نواسے کو ماریں گے

شیریں نے تب کہا کہ قلق ہے مجھے شدید — سنتی ہوں میں بنی مرے آقا سے ہے یزید
ہے ذبحِ ابنِ فاطمہؑ کی اس شقی کو عید — ڈر ہے کیا نہ ہو شہِ ذی جاہ کو شہید
کوئی نہ پنجتن میں رہے یہ مراد ہے
دشمن سوا یزید سے ابنِ زیاد ہے

فوجیں اُدھر ہیں یاں نہیں سامانِ کارزار — کچھ ہیں عزیز ساتھ تو کچھ ہیں رفیق و یار
دنیا نہ ہاتھ میں نہ ریاست نہ اقتدار — حاصل فدک کا بھی نہیں دیتے ستم شعار
اُن کو نظر ہے کچھ نہ ریاست نہ جاہ پر
تکیہ کیا ہے قبرِ رسالت پناہ پر

یہ بین کرکے روتی تھی وہ غم کی مبتلا — اتنے میں آن کر کسی عورت نے یہ کہا
شیریں خبر نہیں ہے تجھے اس خوشی کی کیا — ہے شورِ آمد آمدِ فرزندِ مصطفےٰ

اب داخلہ ہے فاطمہ کے نورِ عین کا
یاں سے قریب اُترا ہے لشکر حسینؑ کا

دیکھ آئے لوگ خیمۂ زنگاریِ امام
اُس رکنِ دیں نے آج کیا ہے یہیں مقام
کہتے ہیں ساتھ آئے ہیں اہلِ حرم تمام
ہے زیرِ قلعہ فوجِ حسینی کی دھوم دھام
بستی کے لوگ شہ کی زیارت کو جاتے ہیں
یاں صبح سے ہے شور کہ شبیرؑ آتے ہیں

شیریں پکاری اُٹھ کے ترے منہ کے میں نثار
سچ ہے قریب آئے شہنشاہِ نامدار؟
اُس نے کہا غلط نہ کہوں گی میں زینہار
مژدہ یہ سُن کے شاد ہوئی وہ نکو شعار
آنکھوں سے سیلِ اشک جو جاری تھی رُک گئی
مارے خوشی کے خاک پہ سجدے کو جھک گئی

سجدے سے اُٹھتے ہی کہے شوہر سے یہ کلام
آیا مدینے سے مرا آقا مرا امام
دعوت کا میں کروں گی تکلف سے اہتمام
بہتر ہے جتنی جلد ہو تیاریِ طعام
کیونکر خوشی نہ ہوں کہ یہ روزِ سعید ہے
آئے حسینؑ آج مرے گھر میں عید ہے

فرزندِ فاطمہ کی عنایت کے میں فدا
منظور تھا کنیز کا اعلیٰ ہو مرتبا
یہ گھر کہاں، کہاں قدمِ ابنِ مرتضیٰ
آنکھوں کو آج فرش کروں گر تو ہے بجا
بالوں سے اپنے گھر کی زمیں کو بُہاروں گی
شہزادیوں پہ آپ کو صدقے اُتاروں گی

یہ کہہ کے اُس نے فرش کیا گھر میں سر بسر
مومن کے دل کی طرح مصفا ہوا وہ گھر
مسند بچھائی بہرِ شہنشاہِ بحر و بر
تکیوں کو صاف کر کے لگایا اِدھر اُدھر

کہتی تھی میرے گھر میں ابھی سے جو نور ہے
یہ آمدِ امامِ زمن کا ظہور ہے

دالان ہے یہ شاہ کی خواہر کے واسطے — یہ نرم فرش ہے علی اکبر کے واسطے
جھولے کی جا یہ ہے علی اصغر کے واسطے — یہ گھر ہے شاہِ دیں کے برادر کے واسطے
راحت سے شہ نشیں پہ امامِ زمن رہیں
حجلہ یہ اس لئے ہے کہ دولہا دلھن رہیں

کُرسی کو لا کے جلد کسی جا بچھاتی تھی — تختوں کو کشتیوں میں کبھی وہ لگاتی تھی
سجدے میں بہرِ شکر کبھی سر جھکاتی تھی — گھبرا کے صحن سے کبھی ڈیوڑھی پہ آتی تھی
چہرے پہ اک خوشی تھی پہ دل بے قرار تھا
فرزندِ فاطمہؑ کا اُسے انتظار تھا

جا کر کبھی خواصوں سے کرتی تھی یہ کلام — کھانے پکاؤ جلد کہ اب آتے ہیں امام
بھر بھر کے آبِ سرد کے رکھ دو ہوا میں جام — لبریز آبِ گرم کے کر دو سبو تمام
پردیسیوں کو خیر سے جب گھر میں لاؤں گی
ہاتھوں سے اپنے پاؤں سبھوں کے دھلاؤں گی

ہمسائیوں سے کہتی تھی ہنس ہنس کے بار بار — اب کیجیو زیارتِ سُلطانِ نامدار
ہے باغِ فاطمہؑ پہ عجب حُسن کی بہار — رشکِ ریاضِ خلد ہے ایک ایک گلعذار
سب نونہالِ گلشنِ دیں لاجواب ہیں
قد سرو باغِ حُسن ہیں رُخ آفتاب ہیں

شمشادِ بوستانِ پیمبر کو دیکھیو — سروِ ریاضِ حضرتِ شبّرؑ کو دیکھیو
کیا نوجواں ہے شہ کے برادر کو دیکھیو — سب ایک سمت تم علی اکبر کو دیکھیو

ہو گا کبھی یہ حُسن ملک کا نہ حُور کا
جلوہ ہے اُس جری میں محمدؐ کے نور کا

خالق رکھے اُسے صد و سی سال برقرار
نام خدا ہے شادی کے قابل وہ گلعذار
بہنیں فدا ہیں، باپ تصدق ہے، ماں نثار
سر پر پھوپی نے پیار سے گیسو رکھے ہیں چار
چہرے کے آگے نیرِ تاباں بھی ماند ہے
عالم کی روشنی ہے اندھیرے کا چاند ہے

اب خیریت سے گذرے گا اٹھارواں جو سال
شادی کریں گی بیٹے کی بانوئے خوش خصال
زینبؑ کو اُس کے بیاہ کا ارمان ہے کمال
ہر دم یہی دعا ہے کہ دولھا بنے یہ لال
آتی ہیں نسبتیں حلب و شام و روم سے
شادی خدا جو چاہے تو ہووے گی دھوم سے

جب ڈھل گئی اُسے انھیں باتوں میں دوپہر
شوہر سے پھر یہ کہنے لگی وہ نکو سیر
اب تک نہ آئے گھر میں شہنشاہِ بحر و بر
اُترے کہاں کسی سے مفصل سنی خبر!
بستی سے ساتھ لے کے ہر اک اپنے بھائی کو
جا پیشوائے خلق کی تو پیشوائی کو

کہیو مری طرف سے یہ تو چوم کر قدم
لونڈی کو سرفراز کرو یا شہِ اُمم
کرتے ہیں اغنیاء غربا پر سوا کرم
اب بے حضور چین نہیں مجھ کو ایک دم
کچھ آج ہے تپش سی دلِ بے قرار میں
آنکھیں سپید ہو گئی ہیں انتظار میں

قربان ہو گئی مرا گھر کچھ نہیں ہے دور
خاصہ تناول آن کے اس جا کریں حضور
ہم لوگ مشتِ خاک ہیں حضرت خدا کے نور
ہو گا یہ کوہ آپ کے آنے سے رشکِ طور

شوہر کو روتے دیکھ کے دل کو نکل پڑی
ڈیوڑھی سے بیٹھتی ہوئی باہر نکل پڑی
چلّا کے دی صدا کہ ارے کیا غضب ہوا — اُس نے کہا کہ سانحہ بی بی عجب ہوا
برباد خاندانِ امیرِ عرب ہوا — خنجر سے ذبح سبطِ نبی تشنہ لب ہوا
زینبؑ ہوئی اسیر حسینؑ اُس سے چھُٹ گئے
یثرب سے آکے راہ میں سجاد لُٹ گئے
میں تجھ سے کیا کہوں کہ جگر کو نہیں ہے تاب — جو تو بیان کرتی تھی وہ سچ تھا ترا خواب
بی بی حسینؑ کو نہ ملا تین روز آب — لے خاک اُڑا کہ ذبح ہوا ابنِ بوتراب
اُترا ہے یاں جو آکے وہ لشکر ہے شام کا
لائے ہیں سر حسینؑ علیہ السّلام کا
عابد بچا ہے اک سو وہ بے پر اسیر ہے — کُبرا اسیر بانوئے مضطر اسیر ہے
عاشق تھے جس کے شاہ وہ دختر اسیر ہے — سب اک طرف ہیں شاہ کی خواہر اسیر ہے
نامحرموں میں پردۂ آلِ عبا نہیں
زہرا کی بیٹیوں کے سروں پر ردا نہیں
شیریں پکاری ٹوٹ گئی ہائے میری آس — یہ کس کا ذکر کرتا ہے مجھ میں نہیں حواس
کس نے قلم کیا سرِ شبیرِ حق شناس — ہے ہے ردا نہیں مری شہزادیوں کے پاس
لے چل مجھے کہ روؤں گی اور خاک اُڑاؤں گی
رانڈوں میں میں حسینؑ کے پُرسے کو جاؤں گی
روتی چلی اسیروں کی جانب وہ نوحہ گر — زیور جو پہنے تھی اُسے پٹکا زمین پر
پہنچی قریب رانڈوں کے جس وقت ننگے سر — سر پیٹنے لگے حرمِ شاہِ بحر و بر

طاقت نہیں جو دھوپ سے آ بیٹھے چھاؤں میں
گردن میں بھاری طوق ہے زنجیر پاؤں میں

یہ دیکھ کر عزیز کے آنسو ہوئے رواں — کی عرض اپنا حال تو کچھ کیجئے بیاں
چہرے پہ تو امیروں کی سب ہے شکوہ وشاں — گردن جھکا کے بولے یہ سجادِ ناتواں
ہوں گے کبھی امیر پہ اب تو فقیر ہیں
بےکس ہیں بے وطن ہیں یتیم و اسیر ہیں

اُس نے کہا بتایئے خادم کو اپنا نام — فرمایا رو کے بیکس و مظلوم و تشنہ کام
مضطر، عزیز مردہ، اسیرِ سپاہِ شام — کنبہ شہید ہو گیا اک دشت میں تمام
قیدی ستم کی فوج میں بچوں سمیت ہوں
میں ساربانِ قافلۂ اہلِ بیت ہوں

بولا وہ تب کہ خیمۂ شبیر ہے کدھر — شیریں کو انتظار میں گزری ہے دوپہر
کہنے لگے یہ عابدِ بےکس بچشمِ تر — جا دیکھ لے حسینؑ کا نیزے پہ ہے وہ سر
خنجر گلوئے سبطِ پیمبر پہ چل گیا
رہتے تھے جس میں شاہ وہ خیمہ بھی جل گیا

دشتِ بلا میں لٹ گیا زہراؑ کا سب چمن — جیتا بچا ہوں ایک میں بیمار خستہ تن
ہے جن کے بازوؤں میں بندھی ظلم کی رسن — بیٹھی ہے ان میں کوئی، کوئی شاہ کی بہن
مظلوم ہوں، یتیم شہِ مشرقین ہوں
عابد ہے میرا نام میں ابنِ حسینؑ ہوں

جس دم سنی عزیز نے ماتم کی یہ خبر — سر پیٹتا ہوا وہ چلا واں سے اپنے گھر
شیریں کھڑی تھی آس لگائے قریبِ در — دھیان اُس کو تھا کہ آتے ہیں سلطانِ بحر و بر

شوہر کو روتے دیکھ کے دل کو نکل پڑی
ڈیوڑھی سے پیٹتی ہوئی باہر نکل پڑی
چلّا کے دی صدا کہ ارے کیا غضب ہوا
اُس نے کہا کہ سانحہ بی بی عجب ہوا
برباد خاندانِ امیرِ عرب ہوا
خنجر سے ذبح سبطِ نبیؐ تشنہ لب ہوا
زینبؑ ہوئی اسیر حسینؑ اُس سے چھٹ گئے
یثرب سے آکے راہ میں سجادؑ لٹ گئے

میں تجھ سے کیا کہوں کہ جگر کو نہیں ہے تاب
جو تو بیان کرتی تھی وہ سچ تھا ترا خواب
بی بی حسینؑ کو نہ ملا تین روز آب
لے خاک اُڑا کہ ذبح ہوا ابنِ بو تراب
اُترا ہے یاں جو آکے وہ لشکر ہے شام کا
لائے ہیں سر حسین علیہ السّلام کا

عابد بچا ہے اک سو وہ بے پر اسیر ہے
کبرا اسیر بانوئے مضطر اسیر ہے
عاشق تھے جس کے شاہ وہ دختر اسیر ہے
سب اک طرف ہیں شاہ کی خواہر اسیر ہے
نامحرموں میں پردۂ آلِ عبا نہیں
زہرا کی بیٹیوں کے سروں پر ردا نہیں

شیریں پکاری ٹوٹ گئی ہائے میری آس
یہ کس کا ذکر کرتا ہے مجھ میں نہیں حواس
کس نے قلم کیا سرِ شبیرِ حق شناس
ہے ہے ردا نہیں مری شہزادیوں کے پاس
لے چل مجھے کہ روؤں گی اور خاک اُڑاؤں گی
رانڈوں میں میں حسینؑ کے پرسے کو جاؤں گی

روتی چلی اسیروں کی جانب وہ نوحہ گر
زیور جو پہنے تھی اُسے پٹکا زمین پر
پہونچی قریب رانڈوں کے جس وقت ننگے سر
سر پیٹنے لگے حرم شاہِ بحر و بر

ماتم کا اہلِ بیتِ محمدؐ میں جوش تھا
شیریں کو تھا نہ ہوش نہ بانو کو ہوش تھا

شیریں یہ رو کے کہتی تھی بانو سے بار بار
بتلاؤ تم کدھر مری بی بی ہیں میں نثار
شیریں سے رو کے بولیں یہ کبرا جگر فگار
کیا کہتی ہے یہی تو ہیں بانوئے نامدار
قیدی ہیں کوکھ اجڑ گئی اور مانگ جل گئی
وارث شہید ہو گیا صورت بدل گئی

قدموں پہ گر کے تب وہ پکاری بدرد و غم
یہ حال ہو گیا مری بی بی کا ہے ستم
پہچانوں کیا کہ بال ہیں بکھرے کمر ہے خم
ماتھے سے خون بہتا ہے آنکھوں پہ ہے ورم
چھاپے ہیں خاک کے رُخِ نیکو پہ ہے غضب
نیلے نشاں ہیں چاند سے بازو پہ ہے غضب

بانو پکاری کیا کہوں شیریں میں اپنا حال
زہراؑ کا باغ ہو گیا مقتل میں پائمال
اکبر جوان تھے علی اصغر تھے خورد سال
بے جرم قتل ہو گئے سب میرے نونہال
دونوں کے سر قریں سرِ شاہِ زمن کے ہیں
برچھی کے پھل پہ پھول ہمارے چمن کے ہیں

بولی یہ رو کے زینبِ ناشاد و نامراد
شیریں یزید کو شہِ بیکس سے تھا عناد
مشہور تو ہے اہلِ وفا اور خوش اعتقاد
بھولی کبھی نہیں مرے بھائی کو تیری یاد
ہم سب کو ساتھ لے کے جو تشریف لائے ہیں
مر کر حسینؑ وعدہ وفائی کو آئے ہیں

یہ سن کے دوڑی جانبِ نیزہ وہ ننگے سر
نیزے پہ آفتاب سا آیا اسے نظر
تب دونوں ہاتھ اٹھا کے پکاری وہ نوحہ گر
لونڈی نثار آپ کے یا شاہِ بحر و بر

ندّی لہو کی چاند سی گردن سے بہہ گئی
لونڈی کو میہمانی کی حسرت ہی رہ گئی

اس خوں بھرے چھُٹے رُخِ انور کے میں نثار — نیلے ہیں اب تلک لبِ اطہر کے میں نثار
آنکھوں کے صدقے زُلفِ معنبر کے میں نثار — اے مصطفےٰ کے لال ترے سر کے میں نثار
کیا بن گئی، حضور کہاں، کربلا کہاں
نیزے کی نوک ہائے کہاں، یہ گلا کہاں

مجھ سے تو عورتوں نے کہا تھا یہ آن کر — آتے ہیں آج گھر میں ترے شاہِ بحر و بر
آراستہ کیا تھا خوشی سے تمام گھر — یوں آپ آئیں گے مجھے اس کی نہ تھی خبر
یاں سے جو خاک اُڑاتی ہوئی گھر میں جاؤں گی
اب فرش اُٹھا کے میں صفِ ماتم بچھاؤں گی

اعجاز سے یہ دی سرِ شبیر نے صدا — شیریں نہ رو کہ تھا یہی منظورِ کبریا
وعدہ جو تجھ سے تھا اُسے ہم نے ادا کیا — لازم تجھے یہ ہے کہ غریبوں کے پاس جا
پرُسا ہمارا زینبِ عالی ہمم کو دے
دعوت ہے بس یہی کہ ردائیں حرم کو دے

پایا نہیں کفن تو کچھ اس کا نہیں الم — زینب ہے بے ردا ہمیں اس کا بہت ہے غم
شیریں کسی بشر پہ یہ ہوتا نہیں ستم — مقتل میں تین روز کے پیاسے موئے ہیں ہم
ماتم میں میرے نالہ و فریاد کیجیو
جب پانی پیجیو تو مری یاد کیجیو [1]

---

[1] جب تیغ کیں حسین کی گردن پہ چل گئی

قیدخانے کے واقعات

زنداں میں جبکہ آلِ پیمبر ہوئے اسیر   کونین کے امیر کھلے سر ہوئے اسیر
سب رشتہ دارِ حیدرِ صفدر ہوئے اسیر   وحشت سرا میں عرش کے اختر ہوئے اسیر
وہ بیبیاں اسیر تھیں اُس قصرِ زشت میں
ہیں جن کی لونڈیوں کے لئے گھر بہشت میں

جب قیدیوں کو خانۂ زنداں میں شب ہوئی   بچوں کی مارے خوف کے حالت عجب ہوئی
گھٹ گھٹ کے دخترِ شہِ دیں جاں بلب ہوئی   مضطر کمال بنتِ امیرِ عرب ہوئی
آفت کا سامنا تھا نئی واردات تھی
زہرا کی بیٹیوں پہ قیامت کی رات تھی

پہلے پہل کی قید وہ اور وارثوں کے داغ   یہ رنگ تھا کہ ہوئے خزاں دیدہ جیسے باغ
رونے سے اہلِ بیت کو اک دم نہ تھا فراغ   نے چاندنی نہ شمع نہ مشعل نہ واں چراغ
غل تھا کہ ایسے گھر بھی الٰہی جہاں میں ہیں
ثابت نہیں کہ قبر میں ہیں یا مکاں میں ہیں

کیجے شکستگی و خرابی کا کیا بیاں   ثابت نہ جس میں سقف نہ در اور نہ سائباں
وحشت کا گھر ہراس کی جا خوف کا مکاں   وہ شب کہ الحذر وہ اندھیرا کہ الاماں
ظلمت سرائے گور تھی زنداں کا گھر نہ تھا
حجرے یہ تنگ تھے کہ ہوا کا گذر نہ تھا

مثلِ دلِ یزید تھا وہ سب مکاں سیاہ   تاروں کی روشنی کو بھی ملتی تھی واں نہ راہ
چھایا تھا دل جلی ہوئی رانڈوں کا دودِ آہ   حجرے سے چشمِ تر کے نکلتی نہ تھی نگاہ

دیکھے کسی کی شکل کوئی یہ محال تھا
روزن بھی تھا کوئی تو وہ چشمِ غزال تھا
شب کا تو ذکر کیا ہے کہ لگتا تھا دن کو ڈر — ظاہر تھے جا بجا حشراتِ زمیں کے گھر
تھے وقفِ آشیانِ ابابیل سقف و در — نکلا وہ مر کے قید ہوا اس میں جو بشر
گھر تھا اجل کا خانۂ رنج و بلا نہ تھا
برسوں سے واں چراغ کسی شب جلا نہ تھا

وہ تیرگی کہ ہو شبِ ظلمات اُس سے دنگ — ہر در بسانِ حجرۂ چشمِ بخیل تنگ
تھی واں کی صبح و شام سوادِ دیارِ زنگ — دیوار و سقف و بام و زمیں سب سیاہ رنگ
قید اُس میں تھے حرم فلکِ گردوں مقام کے
کیا صبح مل گئی تھی خرابے کو شام کے

گرمی کی فصل اور ہوا کا وہ احتباس — وہ ضیق اُس مکان کی اور قید کا ہراس
اندوہ کا وفور دلوں پر ہجومِ یاس — مائیں جو تھلکے ہیں تو بچے تھے بے حواس
دیواریں بھی شکستہ تھیں در بھی جھکے ہوئے
جانیں بھی غم سے تنگ تھیں دل بھی رکے ہوئے

ہر دم زمیں سے واں کی نکلتا تھا یوں بخار — جیسے دھواں تنور سے اُٹھتا ہے بار بار
گرمی سے یوں زمیں پہ تڑپتے تھے سوگوار — جس طرح سے سپند ہو آتش پہ بیقرار
جھک جھک کے آسمان کو حسرت سے تکتے تھے
کیسے ہوائے سرد کو بچے بلکتے تھے

جھڑتی تھی واں کی سقف سے ہر دم سروں پہ خاک — تھے گرد سے بھرے ہوئے رانڈوں کے جسمِ پاک
بھاگی تھی روشنی بھی یہ حجرے تھے ہولناک — کہتے تھے اب مکاں یہ گرا اب ہوئے ہلاک

قسمت میں ہے کہ قبر اسی جا نصیب ہو
اچھا تو ہے کہ خاک کا پردا نصیب ہو

ایک ایک سے یہ کہتی تھی زینبؑ جگر فگار — لائق نہ اس مکان کے تھے ہم گنہگار
مجبور جو غریب ہوں کیا اُن کا اختیار — سایہ تو ہے سروں پہ کرو شکرِ کردگار
بجا ہے گریہ حالِ شہِ مشرقین پر
کیا گذری ہوگی دھوپ میں لاشِ حسینؑ پر

غارت گروں نے لوٹ لیا کہنہ پیرہن — وہ ریگ گرم اور وہ عریانیِ بدن
ہے ہے وہ شب سیاہ سی اور کربلا کا بن — کس طرح جائے بھائی تلک کیا کرے بہن
پیاسا گلا کٹا کے سوئے جس کی راہ میں
سونپی ہے میں نے لاش اسی کی پناہ میں

یہ ذکر تھا ابھی کہ ہوا بند قفلِ در — زنداں میں اور ہو گئی ظلمت زیادہ تر
گھبرا کے دیکھنے لگیں رانڈیں اِدھر اُدھر — جز تیرگی کسی کو نہ آتا تھا کچھ نظر
تڑپے یہ دل کہ سینوں میں سانسیں اکھڑ گئیں
ماؤں سے بچے بچوں سے مائیں بچھڑ گئیں

نظروں سے صورتیں جو ہوئیں یک بیک نہاں — ہاتھوں سے ڈھونڈنے لگیں بچوں کو بیبیاں
چلائی بے حواسی میں بانوئے خستہ جاں — دیکھو تو بی بیو کہ ہے اصغر مرا کہاں
دل پر سکینہ جان کے صدمے گزر جائیں
بچے مرے دہل کے اندھیرے میں ڈر جائیں

بانو کے اس بیاں پہ بلکنے لگے سب حرم — باقر پکارتے تھے کہ کیونکر جئیں گے ہم
چلاتی تھی سکینہ کہ گھٹتا ہے میرا دم — زنداں کا در بھی ہو گیا معمور ہے ستم

کھولے گا قفل کون جو عباس آئیں گے
لو اب پدر کدھر سے مرے پاس آئیں گے

ہوا کے سر اندھیرے میں چلائیں گے اسیر — اب روشنی کہاں سے بھلا لائیں گے اسیر
گرمی کے مارے اور بھی گھبرائیں گے اسیر — ہے ہے یہ کیا غضب ہوا مر جائیں گے اسیر

دربانوں کو پکارو پیمبرؐ کے واسطے
کھلوا دو قفل فاتح خیبر کے واسطے

زنداں کا در کدھر ہے مجھے لے چلو شتاب — دربانوں سے کہوں گی میں با دیدۂ پُر آب
دادا مرا ہے شہرِ علوم نبیؐ کا باب — مجھ پر کرو گے رحم تو ہوگا تمہیں ثواب

پھر کل سے بیکسوں کو نظر بند کیجیو
آلیویں بابا جان تو در بند کیجیو

بولا نہ جب کوئی تو ہوا غم زیادہ تر — دیوار پکڑے پکڑے گئی وہ قریب در
پٹ کو ہلا ہلا کے پکاری وہ نوحہ گر — دربانو جاگتے ہو کہ سوتے ہو بے خبر

بیکس ہوں تشنہ لب ہوں فلک کی ستائی ہوں
کچھ تم سے اپنا حال میں کہنے کو آئی ہوں

بولا کوئی کہ کون ہے تو اے نحیف و زار — دل ہو گیا ہے تیری صدا سُن کے بیقرار
اک آہ سرد بھر کے یہ بولی وہ دل فگار — آفت زدہ اسیر و پریشان و سوگوار

چھوٹے سے سن میں قیدیٔ زندانِ شام ہوں
میں دخترِ حسین علیہ السلام ہوں

پوتی ہوں اُس کی جو کہ ہے کونین کا امیر — شیرِ الٰہ بادشہ آسمان سریر
ایسا کریم تھا وہ دو عالم کا دستگیر — جس نے ہزاروں قید سے چھڑوا دیے اسیر

شہرت جہاں میں ہمتِ مشکل کشا کی ہے
ہم آج ہیں اسیر یہ قدرت خدا کی ہے
کہتی نہیں میں یہ کہ کرو قید سے رہا　　چھُٹ جائیں گے کبھی جو اسیروں کا ہے خدا
کھانے کی کچھ طلب ہے نہ پانی کی التجا　　ہاں قفل کھول دو گے تو دوں گی تمہیں دُعا
جائیں گے ہم کہاں کہ تمہارے حوالے ہیں
بابا حسینؑ آج کی شب آنے والے ہیں
اصغر ہے اُن کے ساتھ یقیں ہے کہ جلد آئیں　　ایسے نہیں ہیں وہ کہ مجھے رات بھر رُلائیں
چوکی کے لوگ سو رہیں در پر مجھے بٹھائیں　　دھڑکا مجھے یہ ہے کہ کہیں آ کے پھر جائیں
نیند آئے گی نہ مجھ کو بہت بے قرار ہوں
بھاگے کوئی اسیر تو میں ذمہ دار ہوں
منظور ابھی نہ ہو تمہیں در کھولنا اگر　　آ کر پکاریں شاہ تو تم کھول دیجو در
دے جاتی ہوں پتا تمہیں ان کا میں نوحہ گر　　معلوم ہو گا صاف کہ طالع ہوا قمر
بو زُلفِ مشک فام کی مہکے گی دُور سے
چھٹکے گی چاندنی رُخِ روشن کے نور سے
باندھے ہے مصطفیٰ کا عمامہ وہ تاجدار　　اور ہے نشانِ سجدہ ستارا سا آشکار
ہالہ سا گرد ماہ کے ہے خطِ مشکبار　　زیبِ کمر ہے شیرِ الٰہی کی ذوالفقار
گہ ذکرِ حق ہے گاہ زباں پر درود ہے
سوکھے لبوں پہ پیاس کی شدت نمود ہے
ساتھ اُن کے ہوئے گا علی اکبر سا گلعذار　　گیسو لٹکتے ہیں رُخِ روشن پہ اُس کے چار
تصویر ہے نبیؐ کی سراپا وہ ذی وقار　　یوسف ہیں مصرِ حسن کے بھائی کے میں نثار

نجمِ فلک پسینے کے قطروں سے ماند ہیں
دنیا کی روشنی ہیں اندھیرے کے چاند ہیں

بولے نگاہباں کہ ترا دھیان ہے کدھر   جا ماں کے پاس بیٹھ کہاں تو کہاں پدر
بے صبح کے ہوئے نہیں کھلنے کا قفلِ در   کیا شمر کے طمانچوں کا تجھ کو نہیں ہے ڈر
دن کو بھی روتی رہتی ہے شب کو بھی روتی ہے
نہ ہم کو سونے دیتی ہے نہ آپ سوتی ہے

ناحق ابھی سے کاہے کو کرتی ہے شور و شین   جا قفل کھول دیں گے بھلا آئیں تو حسینؑ
رونے سے تیرے شب کو بھی ملتا نہیں ہے چین   ہر وقت کے سُنے نہیں جاتے ہیں تیرے بین
بلوائیں شمر کو تری تعزیر کے لئے
رونا نہ کم کرے گی تو شبیرؑ کے لئے

ماں بہنیں قید ہو گئیں آتش سے گھر جلا   آیا بچانے کوئی بُرے وقت میں بھلا
کھائے طمانچے جب تو ترا زور کب چلا   کس دیوے آکے شمر نہ رسّی سے پھر گلا
اِن سے چھٹے تو اور بھی صدمہ دوچند ہو
ایسا نہ ہو جدا کسی حجرے میں بند ہو

یہ بات سُن کے سہم گئی وہ جگر فگار   دروازے سے سرک کے لگی رونے زار زار
دالان سے پکاری یہ بانوئے نامدار   بی بی کدھر گئیں ادھر آؤ یہ ماں نثار
کھولے گا کون در کسے چلّاتی پھرتی ہو
واری کہاں اندھیرے میں ٹکراتی پھرتی ہو

زنجیرِ در نہ رات کو کھولیں گے یہ لعیں   ماں صدقے جائے گھرکیاں کھانے کو کیوں گئیں
پست و بلند خانۂ زنداں کی ہے زمیں   گھبرا کے گر پڑو نہ اندھیرے میں تم کہیں

دشمن ہر اک ہے لشکرِ اہلِ عناد میں
سونا بھی آج بھول گئیں شہ کی یاد میں

روتی ہوئی یہ کہہ کے اُٹھی بانوئے حزیں
بیٹی کو ڈھونڈنے لگی دروازے کے قریں
روتی تھی منہ کو کُرتے سے ڈھانپے وہ مہ جبیں
پاس آ کے ماں نے سر سے قدم تک بلائیں لیں
سر کو جھکا کے پہلے تو وہ پیچھے ہٹ گئی
پھر ننھے ہاتھ اُٹھا کے گلے سے لپٹ گئی

لے آئی ماں گلے سے لگا کر بچشمِ تر
چپ ہو کے لیٹی گود میں ماں کی وہ نوحہ گر
بیٹھیں اسیر بیبیاں سب گرد آن کر
ہاتھوں سے کوئی پاؤں دباتی تھی کوئی سر
ماں لیتی تھی بلائیں پھوپھی صدقے جاتی تھی
بابا بغیر نیند اُسے لیکن نہ آتی تھی

ماں کہتی تھی تھپک کے مری جان سو رہو
زخمی ہیں پھر نہ دُکھنے لگیں کان سو رہو
فرماتی تھیں پھوپھی کہ میں قربان سو رہو
کبرا یہ کہتی تھیں بہن اک آن سو رہو
جی چاہتا ہے چین ملے کوئی دم تمہیں
بابا جب آئیں گے تو جگا دیں گے ہم تمہیں

اک آہِ سرد بھر کے یہ بولی وہ نوحہ گر
اماں میں چپ رہوں گی بھلا آئیں تو پدر
رونے لگیں گے ڈھونڈھ کے جب وہ اِدھر اُدھر
اُس وقت گر پڑوں گی میں قدموں پہ دوڑ کر
اتنا تو کہہ دو مجھ سے اگر مر نہ جاؤں گی
صدقے تمہارے منہ کے میں بابا کو پاؤں گی؟

میرے طمانچے کھانے کا اُن سے نہ کہیو حال
اماں بہت کڑھیں گے شہنشاہِ خوش خصال
ہوئے گا غیظ سے علی اکبر کا رنگ لال
عباسِ نامدار کو آ جائے گا جلال

منظور ہے کہ قیدِ ستم سے رہائی ہو
ایسا نہ ہو کہ پھر کہیں ان سے لڑائی ہو
کیوں اماں جان قبلۂ عالم ابھی جو آئیں — رو کر کس اشتیاق سے مجھ کو گلے لگائیں
جیتا خدا کرے علی اصغر کو ساتھ لائیں — صدمے جو گذرے ہیں ابھی سب مجھ کو بھول جائیں
تنو جاں سے میں نثار شہِ خوش خصال کے
کیا سوؤں ہاتھ چاند سی گردن میں ڈال کے
لے کر بلائیں بانوئے بیکس نے یہ کہا — اے عاشقِ پدر تری باتوں کے میں فدا
سمجھو ہیں تم اب انھیں عرصہ نہیں ذرا — آئے کوئی گھڑی میں شہنشاہِ کربلا
بابا سے ہم بغل تمھیں ہونا نصیب ہو
چھاتی پہ اُن کی رات کو سونا نصیب ہو
صدقے گئی جب آئیں شہنشاہِ انس و جاں — میرا گلہ نہ کیجو تم ان سے سکینہ جاں
تقصیر جو ہوئی وہ تمھیں بخشو واری ماں — آزردہ مجھ سے ہوں گے بہت سرورِ زماں
لشکر یزید کا دمِ غارت نہ ٹل سکا
سیلی لگائی جب تو مرا بس نہ چل سکا
بیٹی سے ماں نے کیں جو یہ باتیں بچشمِ تر — جاگی بہت تھی سو رہی وہ عاشقِ پدر
سب ہو گئے خموش اسیرانِ نوحہ گر — بدلی لگا ہما نوں نے چوکی بجا پہر
فاقوں میں قیدیوں نے اِدھر شکرِ رب کیا
اور اُس طرف یزید نے خاصہ طلب کیا
جلدی محل سرا میں روانہ ہوا طعام — خاصہ چُنا خواصوں نے بازینت تمام
ہاں ہند کو بلاؤ یہ بولا امیرِ شام — تب اک کنیزِ خاص نے اُس سے کیا کلام

خاصہ نہ دن کو نوش کیا ہے نہ سوئی ہیں
بی بی سحر سے آج کئی بار روئی ہیں

لیٹی رہی ہیں منہ کو لپیٹے بصد ملال   چہرہ ہے زرد رونے سے آنکھیں ہیں دونوں لال
کنگھی نہ سر میں کی ہے نہ سرمے کا ہے خیال   کیوں دل گرفتہ ہیں نہیں کھلتا کسی پہ حال
حمام نے کیا ہے نہ کپڑے بدلتی ہیں
مہندی کے بدلے وہ کفِ افسوس ملتی ہیں

گہنا اُتار ڈالا ہے یوں جی میں آئی ہے   بے وجہ سوگواروں کی صورت بنائی ہے
تکیہ ہے تر یہ اشکوں کی ندی بہائی ہے   مسند پہ بیٹھنے کی قسم کل سے کھائی ہے
یہ شکل رنج و غم میں ہے اُس باتمیز کی
جیسے سُنائی آئے کسی کے عزیز کی

بولا خبر یہ سُنتے ہی وہ بانیٔ ستم   جا کر کہو کہ دیر سے یاں منتظر ہیں ہم
دوڑیں یہ حکم سُن کے خواصیں کئی بہم   ناچار ہند آن کے بیٹھی بچشمِ نم
ہرگز یزید کی تو نہ جانب نگاہ کی
دیکھا طعامِ گرم تو اک سرد آہ کی

پوچھا یزید نے کہ ہے کچھ بد مزہ مزاج   بولی یہ ہند ہوتا ہے ہاں درد دل میں آج
ہے ظلم اور ستم کا ترے عہد میں رواج   اپنے جگر کے زخم کا میں کیا کروں علاج
تجھ کو تو عید ہے مجھے صدمے گزرتے ہیں
یہ کون ہیں جو راتوں کو فریاد کرتے ہیں

بتلا یہ سب اسیر مسلماں ہیں یا نہیں   قوم ان کی کیا ہے صاحبِ ایماں ہیں یا نہیں
محبوبِ کبریا کے ثنا خواں ہیں یا نہیں   آیا یہ لوگ قائلِ قرآں ہیں یا نہیں

شقی ہوں، بیکس ان سے نہ ہوں گے زمانے میں
یہ کس خطا پہ قید ہوئے قید خانے میں

ہیں کیا یہ لوگ منکرِ پیغمبرِ الٰہ — شاید نہیں علیؑ کے گھرانے سے ان کو راہ
کیوں ہاتھ سب کے باندھے ہیں کھلتا نہیں یہ آہ — کاٹا ہے کس کا سر کسے لوٹا ہے بے گناہ
کافر ہے وہ عناد جسے پنجتن سے ہے
کیا دشمنی کچھ ان کو حسینؑ و حسنؑ سے ہے

کوئی اگر کہے بھی تو میں مانتی ہوں کب — ابرار و حق پرست ہیں قیدی یہ سب کے سب
میں سن چکی ہوں آپ صدائے نمازِ شب — فاقوں میں بھی وہ کرتے ہیں تا صبح شکرِ رب
گرمی سے گو کہ سینوں میں دم ان کے رکتے ہیں
ماؤں کے ساتھ سجدے میں بچے بھی جھکتے ہیں

قیدی ہیں پر قضا کبھی ہوتی نہیں نماز — رکھتے ہیں پانچ وقت زمیں پر سرِ نیاز
آواز میں سنا نہیں یہ سوز یہ گداز — سجدے میں حق سے کہتے ہیں کچھ اپنے دل کا راز
چھوٹے بڑوں کو عادتِ طاعت گزاری ہے
آٹھوں پہر درود زبانوں پہ جاری ہے

قیدی ہے ظاہرا کوئی بیمار و ناتواں — معلوم کچھ نہیں کہ وہ لڑکا ہے یا جواں
آواز اک ضعیف سی آتی ہے ہر زماں — کیسا کراہتا ہے سحر تک وہ نیم جاں
یہ درد ہے صدا میں کہ دل ٹکڑے ہوتے ہیں
رونے پہ اس کے لوگ محلّے کے روتے ہیں

کرتا ہے جب تلاوتِ قرآں وہ حق کا نور — ہوتا ہے لحن حضرتِ داؤد کا ظہور
رشتہ کچھ اس کو مصحفِ ناطق سے ہے ضرور — قرآں کے حرف حرف کے معنی پہ ہے عبور

تقریر کیا فصیح ہے کیا خوش بیان ہے
گویا زبان اُس کی خدا کی زبان ہے

دن بھر تو اُس کو رہتا ہے غش اور دو پہر کرتا ہے نصف شب سے مناجات تا سحر
واللہ کیا دعاؤں کے فقروں میں ہے اثر بہہ جائے آب ہو کے جو پتھر کا ہو جگر
شاید کوئی عزیز شہِ مشرقین ہے
صوتِ حَسَن میں حُسنِ صدائے حسینؑ ہے

کہتے ہیں صبر و شکر اسے اللہ رے حوصلہ شکوہ نہ طوق کا ہے نہ زنجیر کا گلہ
جاری ہے صبح و شام عبادت کا سلسلہ ہر دم رواں ہے چشم سے اشکوں کا قافلہ
گردن جھکی ہوئی ہے خدا پر نگاہ ہے
لب پر کبھی تو آہ کبھی لاالہٰ ہے

سُنتی ہوں ننھے بچے بھی دو چار ہیں اسیر لڑکی بھی کوئی قید ہے رشکِ مہِ منیر
رونے سے اُس کے لگتے ہیں میرے جگر پہ تیر کیا قہر ہے یہ ظلم غریبوں پہ اے امیر
دکھ دے کسی کو یہ نہیں عادت کریم کی
قرآں میں حق نے کی ہے سفارش یتیم کی

کرتے ہیں لطف و رحم فقیروں پہ اغنیا عقبےٰ میں کام آتا ہے یاں کا دیا لیا
خالق نے اپنے ملک کا حاکم تجھے کیا جُز نامِ نیک کون جہاں میں سدا جیا
زنداں میں قیدیوں کا بہت حال غیر ہے
کچھ خیر کر کہ خیر سے عقبیٰ بخیر ہے

قاروں کا گنج اور ستم ایجاد کیا ہوا نمرود کس طرف گیا شدّاد کیا ہوا
تھا پہلے وہ جو بانیٔ بیداد کیا ہوا فرعونِ بدنہاد سا جلّاد کیا ہوا

وہ قبر میں ہیں آج جو کل تھے رواق میں
ڈھونڈو تو خاک بھی نہیں کسریٰ کے طاق میں

کھانے کو میں نہ ہاتھ لگاؤں گی کیسی بھوک　　اٹھتی ہے بار بار کلیجے میں میرے ہوک
ان کے بغیر مجھ کو یہ کھانا ہے مثلِ خوک　　یہ بیکسوں پہ ظلم غریبوں سے یہ سلوک
خوش ہوگا حق دلوں کو یتیموں کے شاد کر
کیا رحم تھا کرم کو محمدؐ کے یاد کر

یکساں تھا خلق آپ کا شاہ و فقیر سے　　بہلاتے تھے فقیر کو بڑھ کر امیر سے
باتیں تھیں پرورش کی یتیم و اسیر سے　　کرتے تھے سیر انھیں رطب شہد و شیر سے
ہر شب کو قیدیوں کی خبر لینے جاتے تھے
دو دن کے بعد نانِ جویں آپ کھاتے تھے

ہے آج تک جہاں میں علیؑ کے کرم کا شور　　ہر ایک کی زباں پہ ہے نقلِ فقیرِ کور
تھا بازوئے رسولؐ میں دستِ خدا کا زور　　پر واہ رے کرم نہ گوارا تھا رنجِ مور
کی اُس نے کچھ زباں سے شکایت تو ڈر گئے
کاندھے پہ رکھ کے مشک ضعیفہ کے گھر گئے

رانڈوں کے وارث اور یتیموں کے تھے پدر　　قاتل پہ مرتے مرتے رکھی رحم کی نظر
ہردم حسینؑ پہ یہ تقید تھی اے پسر　　قیدی کے بھی طعام کی رکھیو ذرا خبر
راضی نہ اُس کے قتل پہ مشکلکشا ہوئے
مُشکیں جو باندھ دیں تو حسنؑ سے خفا ہوئے

خلقِ خدا ہے معترفِ خُلقِ مجتبیٰؑ　　دریائے فیض، ابرِ کرم، منبعِ سخا
یادش بخیر ذکر کروں کیا حسینؑ کا　　آقا کو دیر گاہ سلامت رکھے خدا

دونوں جہاں میں کیا برکت ایک دم سے ہے
قائم جو ہے زمیں تو انھیں کے قدم سے ہے

دنیا ہو اور حسینؑ میں اس نام کے نثار — فیضِ نبیؐ تو عصمتِ خاتونِ روزگار
ہے بات بات میں کرمِ شاہِ ذوالفقار — اور خلق میں نظیرِ حسنؑ ہے وہ ذی وقار
فخر ہے ہمیروں کی سشرِ مشرقین میں
ہیں جمع کس قدر حسنات ایک حسینؑ میں

تھی میں بھی فیضِ صحبتِ مولا سے بہرہ ور — پیدا کیا ہے حق نے عجب طرح کا بشر
نیلے نشاں ہیں چاند سے کاندھوں پہ جلوہ گر — لے کر اناج جاتے ہیں خود بیکسوں کے گھر
اس پر بھی ہر گھڑی یہ دعا ہے الٰہ سے
یا رب بچائیو مجھے بارِ گناہ سے

اس سالکِ طریقِ ہدایت کے میں فدا — یثرب سے حج کو آتے ہیں اکثر پیادہ پا
ناقے تو پیچھے ہوتے ہیں آگے وہ مقتدا — خالق نے ان پہ ختم کیا زہد واتقا
اس سال بھی سُنا ہے کہ تشریف لائے ہیں
کعبے میں اہلِ بیت بھی ہمراہ آئے ہیں

کیا جانے حج کے بعد سدھارے ہیں وہ کدھر — لونڈی نے پھر سُنی نہیں آقا کی کچھ خبر
رہتی ہوں اس خیال میں پہروں میں نوحہ گر — کعبے میں گھر گئے ہوں نہ سلطانِ بحر و بر
ہے دھوم کچھ دنوں سے جدال و قتال کی
یا رب تو خیر کیجیو زہراؑ کے لال کی

اس خانداں میں کون رہا ہے سوائے شاہ — قائم رکھے جہان میں شہ کو مرا اِلٰہ
آگاہ ہوں کہ شاہ سے کینہ تجھے تھا آہ — ہے ہے کیا نہ ہو کہیں زہرا کا گھر تباہ

بیتاب ہوں خیال شہ نیک نام میں
شہزادیاں اسیر ہوں فوق شام میں

وسواس کا مقام تعجب کی ہے یہ جا — روتے ہیں نام لے کے یہ قیدی حسین کا
پھر تھا نہ شک مجھے کوئی ہوتا جو دوسرا — گر ہے تو اک حسین ہے زہرا کا دلربا
اس نام پاک سے برکت ہے جہان میں
عقدے وہ کھول دیتے سب ایک آن میں

کہیں ہند نے یہ درد کی باتیں جو ایک بار — ہر قلب پر ستم کی چلی تیغ آبدار
واں شدت جوش ماتم سلطان نامدار — رویا جھکا کے سر کو یزید زبوں شعار
خنجر غم حسین کا دشمن پہ چل گیا
کیا نام میں اثر ہے کہ پتھر پگھل گیا

رو کر پھر اس سے کہنے لگی ہند خوش سیر — ہوں بے قرار صورت بسمل میں نوحہ گر
گر کہہ تو دیکھ آؤں انہیں جا کے اک نظر — شاید انہیں سے شہ کی مفصل سنوں خبر
ہیں غیر یا عزیز شناسا وجاں کے ہیں
دریافت تو کروں کہ یہ قیدی کہاں کے ہیں

ناچار ہو کے ہند سے ظالم نے یہ کہا — جا دیکھ آ انہیں مرا نقصان ہے اس میں کیا
واں جا کے اور ہوئے گا تجھ کو قلق سوا — سنتے ہی یہ کلام اٹھی ہند باوفا
پہلو میں مضطرب تھا دل اس حق پرست کا
اٹھتے ہی جلد حکم دیا بندوبست کا

سب عورتوں کو لے کے چلی جب وہ حق شناس — کہنے لگیں یہ تب جو کنیزیں تھیں آس پاس
کپڑے یہ میلے ہیں بدل ڈالیے لباس — اس نے کہا کہ ہے مرے دل پر ہجوم یاس

اک دم میں سوگواروں کو میں دیکھ آتی ہوں
کیسا لباس کیا کسی شادی میں جاتی ہوں

میلے ہی کپڑے چاہئیں جب دل پہ ہو ملال — کچھ سوچ ہے مجھے نہیں کچھ اور بے خیال
کنگھی وہ کیا کرے کہ پریشاں ہو جس کا حال — ہے سر کا گوندھنا بھی مجھے اس گھڑی وبال
جی چاہتا ہے یہ کہ گریبان چاک ہو
کپڑے تو سب سیاہ ہوں اور سر پہ خاک ہو

لازم ہے بزمِ غم میں عزادار بن کے جائے — خود روئے پیٹے بین کرے اور انھیں رلائے
واں وارثوں کا سوگ ہے کپڑے کسی دکھائے — روتا ہے دل مقام ہے عبرت کا ہائے ہائے
کپڑے بدل کے رانڈوں میں جانا روا نہیں
ان میں چلی ہوں جن کے سروں پر ردا نہیں

نکلی محل سرا سے یہ کہہ کر وہ خوش سیر — تھیں ساتھ ساتھ چند خواصیں بھی نوحہ گر
پہنچی جنابِ حضرتِ زینبؑ کو یہ خبر — رنگ اڑ گیا یہ کہنے لگیں سر کو پیٹ کر
اپنا نہیں خیال بزرگوں کا پاس ہے
ہے ہے کہاں چھپوں وہ مری روشناس ہے

ہے شرم کی جگہ کہ میں ہوں خواہرِ امام — غمگین و سوگوار و پریشان و تشنہ کام
ہم ہیں فقیر ہم میں امیروں کا کیا ہے کام — لوگو بتا نہ دیجو کہیں اس کو میرا نام
پوچھے جو وہ کسی سے کہ زینبؑ کدھر گئی
کہہ دیجیو کہ بھائی کے ہمراہ مر گئی

رو کر ہر اک سے بانوئے ناشاد نے کہا — کیا حاصل اضطراب سے قسمت کا جو لکھا
لوگو خدا کے واسطے چپکے رہو ذرا — رو رو کے سو گئی ہے ابھی میری دلربا

پھر حشر قید خانے میں ہوگا جو روئے گی
چونکی اگر تو صبح تلک پھر نہ سوئے گی

چپ ہو گئے یہ سن کے اسیرانِ نوحہ گر — جا بیٹھی ایک گوشے میں زینب جھکا کے سر
آئی سواریِ زنِ حاکم قریبِ در — درباں بھی دور ہٹ گئے دروازہ کھول کر
وحشت یہ قید خانے کی جس دم نگاہ کی
ہاتھوں پہ ہاتھ رکھ کے خواصوں نے آہ کی

دل ہند کا تو رُندھ گیا تھرا گیا جگر — بولی عمر کے ڈیوڑھی پہ یہ قبر ہے کہ گھر
دیکھا نہیں مکاں کوئی تاریک اس قدر — پوچھو کوئی کسی سے کہ ہیں بی بیاں کدھر
ایسا بھی ظلم کرتا ہے کوئی جہان میں
بندے خدا کے بند ہیں ایسے مکان میں

بڑھ کر کسی کنیز نے تب یہ کیا بیاں — بی بی کوئی اسیروں میں زندہ نہیں ہے یاں
چلیئے محل ہیں آپ بھلا جائیں گی کہاں — قابل نہیں حضور کے جانے کے یہ مکاں
گر غش ہوئے تو آپ میں آیا نہ جائے گا
ہم سے تو اس خرابے میں جایا نہ جائے گا

آزردہ ہو کے کہنے لگی ہندِ نوحہ گر — عبرت کا یہ مقام ہے لونڈی خدا سے ڈر
آخر جو اس میں قید ہیں وہ بھی تو ہیں بشر — تاراج یوں جہاں میں نہ ہوئے کسی کا گھر
جانے وہی کلیجے پہ جس کے چھری لگے
ایسی نہ بات کہہ کہ خدا کو بری لگے

یہ بات کہہ کے آگے بڑھی وہ بصد الم — اک آفتابِ دیں نظر آیا اسیرِ غم
حلقہ گلے میں طوق کا زنجیر میں قدم — بولی عمر کے وہ کہ زہے شوکت و حشم

انساں ہے یہ اندھیرے میں یا شمعِ طور ہے
آئی ندائے غیب کہ خالق کا نور ہے
پڑھتی ہوئی درود گئی جب قریب تر　　اللہ رے حسن کرنے لگی خیرگی نظر
غلّ عورتوں میں تھا یہ فرشتہ ہے یا بشر　　اترا ہے آسماں سے خرابے میں یا قمر
رتبے میں ہے بزرگ نسب میں جلیل ہے
ثابت ہے ضعف سے کہ نہایت علیل ہے
بولی کوئی کہ عابد و زاہد ہے یہ جواں　　گھٹّا جبیں پہ کثرتِ طاعت کا ہے نشاں
ایماں کا نور چہرۂ انور سے ہے عیاں　　دیکھا نہیں حیا سے کہ ہیں کون بیبیاں
برحق شریف قوم یہ گردوں اساس ہے
اشراف کو ہر ایک کی حرمت کا پاس ہے
جو غیر کی طرف نہ حیا سے کرے نظر　　ماں بہنیں ایسے شخص کی ہوویں ننگے سر
یہ خیر ہووے جس کی طبیعت میں اس سے شر　　ٹوٹے غضب خدا کا لعینوں کی جان پر
تقویٰ پہ اس کے عفت و عصمت گواہ ہے
قرآں ہم اٹھالیں کہ یہ بے گناہ ہے
افسوس ایسے بندۂ صالح پہ یہ تعب　　زنداں میں کاٹتا ہے تڑپ کر تمام شب
بستر زمیں کا اور یہ تنِ زار ہے غضب　　آنکھیں جو بند ہیں یہ نقاہت کا ہے سبب
ہے خامشی دلیل عبادت کے شوق کی
گردن جھکی ہوئی ہے گرانی سے طوق کی
باتیں یہ کرکے عورتیں روتی تھیں زار زار　　سینے میں تھا مگر نہ دلِ ہند کو قرار
کہتی تھی دیکھ کر رخِ اقدس کو بار بار　　کس ملک کا رئیس ہے یارب یہ ذی وقار

آنکھوں میں صاف پھرتی ہے صورت امام کی
تصویر ہے حسین علیہ السلام کی

آخر دبا کے پاؤں یہ بولی وہ نیک نام — اُٹھیے کہ دیر سے میں کھڑی ہوں پے سلام
بولے یہ آنکھیں کھول کے مولائے خاص و عام — اس بیکس و یتیم و بلاکش سے کیا ہے کام
ہجرِ پدر میں تلخ ہے لذت حیات کی
طاقت نہ آنکھیں کھولنے کی ہے نہ بات کی

بولی یہ ہند کب سے علالت ہے میں نثار — فرمایا ساتویں سے محرم کی ہے بخار
اُس نے کہا طبیب کو دکھلاؤ حالِ زار — فرمایا خیر شافیِ مطلق ہے کردگار
راضی ہیں اس پہ ہم جو رضائے حبیب ہے
دی ہے یہ تپ اُسی نے جو سب کا طبیب ہے

ایذا کو چین رنج کو راحت سمجھتے ہیں — شیریں کو تلخ، شور کو لذت سمجھتے ہیں
صابر ہیں نانِ جو کو بھی نعمت سمجھتے ہیں — مرنے کو راہِ حق میں سعادت سمجھتے ہیں
عسرت ہو دکھ ہو قید ہو فاقہ کشی رہے
دولت یہی بڑی ہے کہ خالق خوشی رہے

یہ ذکر سن کے رونے لگی ہندِ باوفا — کی عرض کیا ہے اسمِ مبارک حضور کا
گردن جھکا کے قبلۂ چارم نے یہ کہا — بے کس، عزیز مردہ، گرفتار و بے نوا
کیا پوچھتی ہو نام و نشاں خاکسار کا
اک بندۂ حقیر ہوں پروردگار کا

زیبا ہے نام پاک پئے خالقِ ودود — روزی رسانِ عالمیاں واجب الوجود
جو معرضِ فنا میں ہیں کیا اُن کی ہست و بود — قطروں کی کیا بساط حبابوں کی کیا نمود

درپیش منزلِ لحدِ خوفناک ہے
آغاز اپنا خاک ہے انجام خاک ہے

اُس نے کہا بتایئے والد کا اپنے نام　　فرمایا فاقہ کش وطن آوارہ، تشنہ کام
مقتولِ نیزہ و تبر و خنجر و حسام　　جس کو ملا نہ پیاس میں پانی کا ایک جام
بے گور و بے کفن جسد پاش پاش ہے
سنیاں ہے کربلائے معلیٰ میں لاش ہے

پوچھا وطن کو اُس نے تو بولے شہِ زمن　　دارِ فنا، مقامِ فنا، منزلِ محن
بیٹھے فقیر تھک کے جہاں ہے وہی وطن　　بے خانماں اسیر و پریشان و خستہ تن
پردیس میں تباہ ہوئے شہر چھٹ گیا
جنگل میں ہم بھی لُٹ گئے اور گھر بھی لٹ گیا

وہ بولی اور بھائی بھی کیا تھے مہرِ منیر　　فرمایا ہاں جوان تھا اک اور اک صغیر
جرأت میں بے عدیل تھے صورت میں بے نظیر　　دونوں کو تین روز نہ پانی ملا نہ شیر
اعدا کو دشمنی تھی صغیر و کبیر سے
برچھی سے ایک قتل ہوا ایک تیر سے

غش ہو گئے یہ کہہ کے امامِ فلک اساس　　تھرا کے واں سے آگے بڑھی ہند بے حواس
پہونچی شتر شتر کے جو سیدانیوں کے پاس　　رانڈوں کی شان دیکھ کے بولی وہ حق شناس
چہرے سبھوں کے غیرتِ خورشید و ماہ ہیں
گویا کہ اہلِ بیتِ رسالت پناہ ہیں

مٹی میں گو بھرے ہوئے ہیں ان کے روئے پاک　　چھپتا ہے کوئی چاند پہ ڈالے ہزار خاک
ہر چند ہیں صعوبتِ زنداں سے سب ہلاک　　روشن ہے قید خانہ تارک و ہولناک

میں کس طرح کہوں کہ یہ آلِ عبا نہیں
ہاں فرق اتنا ہے کہ سروں پر ردا نہیں

چہروں کی آب و تاب پہ لوگو کرو تو غور
دیکھا ہے قیدیوں کا کسی نے کبھی یہ طور
بازو ہیں ایک رسّی میں ہے ہے یہ ظلم و جور
بچے بھی ہیں بندھے ہوئے دیکھو ستم یہ اور

مٹی میں مل گیا یہ چمن وا مصیبتا
ان گوری گردنوں میں رسن وا مصیبتا

آ کر قریب کہنے لگی ہندِ خوش خصال
اے بی بیو بتا دو ذرا رُخ سے اپنے بال
مجھ سے تو کچھ بیان کرو اپنے دل کا حال
کھیتی تمہاری ہو گئی کس بن میں پائمال

کیوں لے گئے عدو تمہیں بلوائے عام میں
کس جرم پر اسیر ہوئے ملکِ شام میں

سُنتی ہوں میں مدینے میں ہے آپ کا وطن
للہ کچھ کہو خبرِ سرورِ زمن
ہیں خیریت سے حضرتِ شبیر کی بہن
زندہ رکھے جہاں میں اُنھیں ربِ ذوالمنن

وہ بی بی روحِ بنتِ رسالت پناہ ہے
عصمت پہ جس کی خالقِ اکبر گواہ ہے

کیوں بی بیو بتاؤ خدا کے لئے ذرا
ہے خیر سے مدینے میں فرزندِ مرتضیٰ
سُنتی ہوں اب جوان ہیں ہم شکلِ مصطفیٰ
سر سبز رکھے باغِ جہاں میں اُنھیں خدا

شہرت ہے ابنِ فاطمہ زہرا کے ماہ کی
حسرت تو شہ کو ہوئے گی اکبر کے بیاہ کی

دل سے یہی ہے شام و سحر اب مری دُعا
آقا مرے جہاں میں سلامت رہیں سدا
اکبر کا سہرا بانو کو دکھلائے اب خدا
گھر میں بہو کو لائے جگر بندِ مصطفیٰ

ارمان نکلے بادشہ مشرقین کا
آباد گھر ہو فاطمہ کے نورِ عین کا

جب ہند ختم کر چکی رو رو کے یہ کلام　　بانو کے پاس آکے یہ بولی وہ نیک نام
صدقے گئی بتائیے کیا آپ کا ہے نام　　بشد کچھ کہو میں ہوئی جاتی ہوں تمام
زنداں میں سب اسیروں کی سردار آپ ہیں
ان قیدیوں کی قافلہ سالار آپ ہیں

بانو نے اس سے پھر یہ کہا تھام کر جگر　　ہم قیدیوں کے نام ہیں مظلوم و نوحہ گر
زینب کو پھر بتا کے یہ بولی بچشم تر　　یہ بی بی جو کہ روتی ہیں نہوڑائے اپنا سر
تو دل میں جانتی ہے کہ ان کی عزیز ہوں
مختار یہ مری ہیں میں ان کی کنیز ہوں

وہ بولی کہ ہیں آپ کے فرزند خوش سیر　　فرمایا رو کے لٹ گیا بی بی ہمارا گھر
تیر و سناں سے قتل ہوئے رن میں دو پسر　　زنداں میں اک اسیر ہے مظلوم و نوحہ گر
ٹکڑے جگر کے صدمۂ فرقت سے ہوتے ہیں
جو گود میں پلے تھے وہ جنگل میں سوتے ہیں

یہ سُن کے ہند رونے لگی تب بہ اشک و آہ　　پھر مڑ کے رُوئے حضرت زینب یہ کی نگاہ
رُخ سے ہٹائے بال تو حالت ہوئی تباہ　　بے ساختہ کہا کہ زہے قدرتِ الٰہ
ہرگز غلط نہیں جو مجھے اشتباہ ہے
زینبؑ تمہیں ہو خالقِ اکبر خدا گواہ

کہنے لگی یہ ہند سے زینب جگر فگار　　کیوں فالِ بد نکالتی ہے منہ سے بار بار
اے ہند اُن کا نام نہ لے بھول کر دگار　　نسبت نہ اُن سے دے کہ وہ ہیں فاطمہ وقار

اعدا تو مجھ کو لے گئے بلوائے عام میں
دشمن نہ اُن کے قید ہوں زندانِ شام میں

وہ شادکام اور میں بکیس جگر فگار — آباد وہ ہیں اور میں زنداں میں سوگوار
بلوے میں لے گئے مجھے اعدا بحالِ زار — باہر کنیز اُن کی نہیں نکلی زینہار
وہ بی بی پردہ دار ہے اور خوش خصال ہے
زینبؑ میں ہی ہوں یہ ترا بےجا خیال ہے

یہ سُن کے بے قرار ہوئی ہندِ خوش خصال — دیکھا بغور رُخ تو یہ بولی بصد ملال
اے میری شاہزادی چھپاؤ نہ مجھ سے حال — زینبؑ تمہیں ہو خواہرِ شبیرِ باکمال
تم کو قسم ہے فرقِ سرِ مشرقین کی
جلدی کہو خبر مرے آقا حسینؑ کی

یہ کہہ کے پیٹنے جو لگی ہندِ ذی وقار — فرطِ قلق سے دل ہوا زینبؑ کا بے قرار
چلائیں سر کو پیٹ کے باچشمِ اشکبار — اے ہند کٹ گیا سرِ شبیرِ نامدار
پانی دیا نہ سبطِ رسالت پناہ کو
حاکم نے بے گناہ کیا قتل شاہ کو

اے ہند کیا کہوں خبرِ شاہِ تشنہ لب — ہنگامِ عصر لٹ گیا زہرا کا باغ سب
مطلق ڈرا نہ خالقِ اکبر سے بے ادب — چوبِ یزید اور لبِ شبیرؑ ہے غضب
رونے نہ پائے ماتمِ شاہِ شہید میں
سرننگے لے گئے ہمیں بزمِ یزید میں

کیا پوچھتی ہے تو خبرِ شاہِ بحر و بر — فرقِ حسینؑ تھا کبھی نیزے پہ جلوہ گر
باندھا درخت میں کبھی خولی نے بے خطر — لٹکا دیا یزید پہ سبطِ نبیؐ کا سر

یاں تک تھی دشمنی سپہ بدخصال کو
پتھر لگائے راہ میں زہرا کے لال کو

اے ہند رَن میں شاہ کے یاور ہوئے شہید عباسؑ قتل ہو گئے اصغر ہوئے شہید
بن بیاہے دشت میں علی اکبر ہوئے شہید شبّر کا لال اور مرے دلبر ہوئے شہید

مرجھا کے فاطمہؑ کی نہ کھیتی ہری ہوئی
بچوں سے گود ہو گئی خالی بھری ہوئی

میداں میں بے کفن ہے ابھی لاشِ شاہِ پاک ہے ہے وہ دھوپ اور وہ میدانِ ہولناک
واحسرتا وہ گرم ہوا اور وہ فرشِ خاک کس طرح دل نہ ہو مرا سینے میں چاک چاک

چہلم تلک ہوا نہ سفر مشرقین کا
اب تک پڑا ہے دھوپ میں لاشہ حسینؑ کا (جب قیدیوں کو خانۂ زنداں ...)

اب روک لے کمیتِ قلم کی عناں انیسؔ بزمِ عزا میں سب ہیں ترے قدرداں انیسؔ
پیری ہے یہ سفر کا ہے دھیان ہاں انیسؔ کیا جانئے روانہ ہو کب کارواں انیسؔ

خیمے مسافرانِ عدم نے نکالے ہیں
جس قافلہ میں تم ہو وہ سب چلنے والے ہیں (جب لشکرِ خدا کا علم ...)

اُردُو ادب کی چند اہم کتابیں

عرفانِ جمیل

جنابِ جمیلؔ مظہری کے مراثی اور قصائد کا مجموعہ

قیمت چھ روپے

آئینِ وفا

مرثیہ در بیانِ سیرت و حیاتِ حضرتِ ابُوالفضل العباسؑ

تصنیف ڈاکٹر سید صفدر حسین

(طبع ثانی)

قیمت پانچ روپے

جلوۂ تہذیب

مرثیہ در بیانِ سیرت و احوالِ حضرتِ علی اکبرؑ

تصنیف ڈاکٹر سید صفدر حسین

قیمت پانچ روپے

چراغِ مصطفویؐ

مرثیہ در بیانِ سیرت و حالاتِ حضرتِ امام حسین علیہ السلام

تصنیف ڈاکٹر سید صفدر حسین

قیمت پانچ روپے

اُردو مرثیہ کا ماضی وحال

تصنیف ——— ڈاکٹر سیّد صفدر حسین

عنوانات

اُردو مرثیہ کا فروغ

ایک اور میر انیس

مرثیہ بعدِ انیس

جدید مرثیہ

مَن آنم کہ مَن دانم

نسیم امروہوی

آلِ رضا

جمیل مظہری

جوش ملیح آبادی

بارگاہِ ادب

۴۵۔ حیدر روڈ۔ اسلام پورہ۔ لاہور